

تذکرہ معاصرین

۳

مالک رام

مکتبہ جامعہ مدینہ
انجمن دہلی

تذکرہ مُعاصرین

تذکرہ مُعاصرین

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں وفات پانے والے
ادب کار کے حالات اور کلام

۳

مالک رام

مکتبہ حائى دہلی
مکتبہ جامعہ ملیہ

© مالک رام ۱۹۷۸ء

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامونگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

قیمت ۲۲/-

جون ۱۹۷۸ء

پہلی بار

(جمال پرنٹنگ پریس دہلی)

ڈاکٹر سید عابد حسین
کی نذر

نشانِ سجدہ من نیز ہم بر آستانِ بینی

تعارف

تذکرہ معاصرین کی اس جلد میں ان ۵۶ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کے حالات شائع کیے جا رہے ہیں، جو ۱۹۷۴ اور ۱۹۷۵ء کے دو برسوں میں ہم سے جدا ہوئے۔ وہ اس جگہ گئے، جہاں ہم میں سے ہر ایک آگے پیچھے پہنچنے والا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار میں کیا کیا اہمیت نے انھیں جو صلاحیتیں و عزتیں عطا کی تھیں، کیا انھوں نے ان کا اپنی بساطِ سحرِ شہیک استعمال کیا! کیا انھوں نے اپنے دلِ دماغ کی خداداد قوتوں کو اپنے سموطنوں اور سنی نوعِ انسان کی بھلائی اور بہتری کی راہ میں صرف کیا! کسی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا یہی معیار رہا ہے، اور یہی آئندہ بھی رہیگا۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے، تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے امانت میں خیانت نہیں کی، اور کم و بیش کامیاب زندگی گزاری۔

ان میں سے بعض اصحاب اس پالیے کے تھے کہ کوئی پورخِ ادبِ اردو انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایسے امیتا آٹا چھوٹے ہیں اور اپنے بعد کے آنے والوں کی راہ اس حد تک سمواد کر دی ہے کہ اردو کا ہر ایک طالب علم ان کا ممنون رہیگا۔

حالات کی فرہمی میں طریقہ کار وہی رہا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ جن اصحاب سے میرے طویل زمانے تک ذاتی تعلقات رہے، یا جن کے لواحقین اور متعلقین نے معلومات تمہیا کرنے میں مستعدی دکھائی، ان کے حالات بھی مفصل اور بڑی حد تک مکمل ہیں؛ دوسروں کے نسبتاً تشنہ ہیں، اگرچہ یہاں بھی بنیادی اور اہم کوائف بہر حال محفوظ ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان سے زیادہ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔

یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہیں ہوگا:

بعض اذقات ایک صاحب کے ترجمے میں کسی دوسرے شخص کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کسی کے نزدیک یہ غیر ضروری ہو۔ یہ بات اہم خیال کرتا ہوں کہ حتی الامکان

ہر ایک ادیب یا شاعر کے خاندان کا حال معلوم ہونا چاہیے، تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس کا پس منظر کیا تھا، وہ کس ماحول میں پیدا ہوا، بڑا ہوا۔ پھر اس کا اشنا دکن تھا، جس سے ہم اس کی تعلیم و تربیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس سے ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائیگا کہ اس کی کونسی صلاحیت موردِ توجہ تھی اور کونسی اس کے اپنے زورِ بازو کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ان تفصیلات میں جاننے کا باعث ہوتی ہے۔

اسی جستجو اور پوچھ گچھ کے دوران میں میرے سامنے کئی ایسی باتیں آ جاتی ہیں جن سے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ چونکہ حسن اتفاق سے یہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ بعد کو کوئی اتنا بتانے والا بھی نہیں ہوگا اور وہ کاملاً مردہ خفا میں چلی جائیگی، میرے خیال میں یہ علم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہو، کہ کل کسی کو ان کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔

جب بھی ان اموات کی فہرست اور ان کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو وہ دم کے ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ سفینے بھر رہے ہیں اور سینے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز بیشمار نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن علم کم ہو رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانا، قوانینِ ظہرت کی صداقت سے انکار کا مرادف ہوگا، لیکن اتنا تو ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو بزرگوں کی جلائی ہوئی شمعِ علم و معرفت روشن رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑے گی۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے حالات کی فراہمی میں مدد کی، کلام کے مجموعے تیار کیے، یاد دسری مطبوعات مستعار دیں۔ میں ان سب کا شکریہ فرداً فرداً پہلے بھی ادا کر چکا ہوں، اب پھر مجموعی طور پر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

فجزاہم اللہ احسن الجزاء

نئی دہلی

مالک رام

۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء

فہرست

بہ ترتیب حروف تہجی

- ۱۔ اثر حیدر آبادی، صدیق احمد : ۹۴
- ۲۔ اظہر سیالکوٹی، احمد الدین (بے، ڈی) : ۵۳
- ۳۔ اعجاز حسین، سید (پروفیسر) : ۲۱۸
- ۴۔ انسر میرٹھی، حامد اللہ : ۸۴
- ۵۔ اکل جالندھری، رام پرتاپ : ۲۰
- ۶۔ الہد نجی، محمد امجد : ۳۰
- ۷۔ انور، ڈاکٹر منوہر سہاے : ۴۵
- ۸۔ انور کاسٹوی، یار محمد انصاری : ۱۶۲

-
- ۹۔ بسمل الہ آبادی، سکھ دیو پرشاد : ۳۰۹
 - ۱۰۔ بھرا دکھنوی، سردار احمد خان : ۱۴۴
 - ۱۱۔ تاج ڈٹکی، محمد اسماعیل علی خان بہادر : ۱۵۱
 - ۱۲۔ تمکین مرست، محمد قادر الدین، سید : ۳۳۷
 - ۱۳۔ ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ : ۱۴۱
 - ۱۴۔ شائق عظیم آبادی، سید حسن رضا : ۱۵
 - ۱۵۔ ثمر چھپروی، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸
 - ۱۶۔ جمالی، طفیل احمد : ۱۳۶
 - ۱۷۔ جوان سندیلوی، مٹی لال : ۲۴
 - ۱۸۔ حامد الہ آبادی، حامد حسین : ۲۶۹

۱۹. حمید احمد خان ۷۶ :
۲۰. حیرت بدایونی، سید حسن ۲۰۷ :
۲۱. خضر میمنی، مولا بخش ۹۹ :
۲۲. دیوان شگھ مفتون ۱۸۷ :
۲۳. ذوالفقار علی بخاری ۲۲۸ :
۲۴. ن - م، راشد ۲۷۵ :
۲۵. ریاض الفزاری، ریاض الدین، قاضی ۱۱۷ :
۲۶. ساغر صدیقی، محمد اختر ۱۲۸ :
۲۷. ساگر نکودہی، بلونت کمار ۶۰ :
۲۸. سید مسعود حسن رضوی ادیب ۳۲۴ :
۲۹. شاہ معین الدین احمد ندوی ۱۶۶ :
۳۰. شفقت کاظمی، سید فضل الحسن ۲۲۵ :
۳۱. شمس منیری، شمس الدین احمد ۲۱۳ :
۳۲. شمیم کرہانی، شمس الدین حیدر ۲۲۳ :
۳۳. شورش کاشمیری، عبدالکریم، آغا ۲۸۷ :
۳۴. شیر محمد اختر گجراتی ۱۷۲ :
۳۵. طالب دہلوی، شیش چندر سکینہ ۲۹۷ :
۳۶. طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری ۲۵۵ :
۳۷. عبدالرحمن چغتائی ۱۷۶ :
۳۸. عزیز جہالاداری، محمد عزیز الرحمن قریشی ۳۷ :
۳۹. قاصر، یرہم ناگھدوت ۳۱۲ :
۴۰. قیس کوٹوی، نور محمد ۲۷ :
۴۱. مانی ناگپوری، بشیر خان ۲۴۰ :

۴۲. مجید امجد، عبدالمجید : ۱۱۰
 ۴۳. محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی : ۱۴۸
 ۴۴. محمد حسین حستان : ۱۲۳
 ۴۵. محمود احمد عباسی اروموی : ۶۳
 ۴۶. محوی صدیقی لکهنوی، محمد حسین : ۳۰۳
 ۴۷. سیح الزمان، سید : ۲۰۴
 ۴۸. مضطر حیدری، دلاور حسین : ۲۲۳
 ۴۹. منظر لکهنوی، سید منظر حسن : ۲۶۵
 ۵۰. هند رناتخه : ۷۱
 ۵۱. بهبود شمسی، سید عبدالقیوم : ۴۱
 ۵۲. میرزا محمود بیگ : ۳۲۴
 ۵۳. نثار اطاوی، نثار حسین : ۱۰۴
 ۵۴. نجم آفندی، میرزا تاجل حسین : ۳۴۹
 ۵۵. نشتر جالندری، محمد عبدالملکیم خان : ۲۶۱
 ۵۶. هزار لکهنوی، سید حسن : ۲۹۴

فہرست

بترتیب تاریخ وفات

نمبر	نام / تخلص	مقام وفات	تاریخ وفات	صف
۱۔	شائق عظیم آبادی، سید حسن ضا	پٹنہ	۱۹ جنوری ۱۹۷۴ء	۱۵
۲۔	اکمل جالندھری، ارام پرتاپ	دلی	۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۰
۳۔	جوان ندیلوی، متی لال	لکھنؤ	۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۴
۴۔	قیس کوٹوی، نور محمد	سکیت	۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۷
۵۔	امجد بخشی، محمد امجد	کنگ	یکم فروری ۱۹۷۴ء	۳۰
۶۔	عزیز جھالاداری، محمد عزیز الرحمن قریشی، جھالادار	۶ فروری ۱۹۷۴ء	۳۷	
۷۔	ہجو شمش، سید عبدالقیوم	پٹنہ	۸ فروری ۱۹۷۴ء	۴۱
۸۔	انور، ڈاکٹر منو ہر سہاے	نئی دلی	۱۷ فروری ۱۹۷۴ء	۴۵
۹۔	افہر سیالکوٹی، احمد الدین (اے، ڈی) کراچی	۲۴ فروری ۱۹۷۴ء	۵۳	
۱۰۔	ساگر نگور، بلونت کمار	ننگور	۲۵ فروری ۱۹۷۴ء	۶۰
۱۱۔	محمد احمد عباسی اروڑوی	کراچی	۲۷ مارچ ۱۹۷۴ء	۶۴
۱۲۔	ہند ناتھ	بہی	۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء	۷۱
۱۳۔	حمید احمد خان	لاہور	۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء	۷۶
۱۴۔	امیر میرٹھی، حارث اللہ	لکھنؤ	۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء	۸۴
۱۵۔	اثر حیدر آبادی، صدیق احمد	حیدر آباد	۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء	۹۴
۱۶۔	خضر نسیمی، مولابخش	لاہور	۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء	۹۹
۱۷۔	نثار انادی، نثار حسین	اٹاوا	۴ مئی ۱۹۷۴ء	۱۰۴
۱۸۔	مجید امجد، عبدالحمید	ساہیوال	۱۷ مئی ۱۹۷۴ء	۱۱۰

- ۱۹۔ ریاض انصاری، ریاض الدین، قاضی ... گوالیار۔۔۔۔۔ ۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۱۷
- ۲۰۔ محمد حسین حسان ... نئی دہلی۔۔۔۔۔ ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۳
- ۲۱۔ ساغر صدیقی، محمد اختر۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۱۸/۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۸
- ۲۲۔ جمالی، طفیل احمد۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء ۱۳۶
- ۲۳۔ شہاکر پوٹھی، جاگن ناتھ۔۔۔۔۔ ممبئی۔۔۔۔۔ ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء ۱۴۱
- ۲۴۔ بہزاد کھٹوی، سردار احمد خان۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۱۴۴
- ۲۵۔ محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ یکم نومبر ۱۹۷۴ء ۱۴۸
- ۲۶۔ تاج ٹونکی، ذاب محمد اسماعیل علی شاہ پادرا، ٹونک۔۔۔۔۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۱
- ۲۷۔ نثر چھپری، عبدالحفیظ صدیقی۔۔۔۔۔ بھیلواری شریف۔۔۔۔۔ ۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۸
- ۲۸۔ انور کاسوی، حافظ یادمحمد انصاری۔۔۔۔۔ کامی۔۔۔۔۔ ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۶۲
- ۲۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔۔۔۔۔ اعظم گڑھ۔۔۔۔۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۶۶
- ۳۰۔ شیر محمد اختر گجراتی۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۷۲
- ۳۱۔ عبدالرحمن چغتائی۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۷۶
- ۳۲۔ دیوان سنگھ مفتون۔۔۔۔۔ نئی دہلی۔۔۔۔۔ ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۸۷
- ۳۳۔ مسیح الزمان، سید (پروفیسر)۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۴
- ۳۴۔ حیرت بدایونی، سید حسن۔۔۔۔۔ حیدر آباد۔۔۔۔۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۷
- ۳۵۔ شمس الدین احمد منیری۔۔۔۔۔ پٹنہ۔۔۔۔۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء ۲۱۳
- ۳۶۔ اعجاز حسین، سید (پروفیسر)۔۔۔۔۔ مظفر پور۔۔۔۔۔ ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء ۲۱۸
- ۳۷۔ شفقت کاظمی، سید فضل الحسن۔۔۔۔۔ ڈیرہ غازی خان۔۔۔۔۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۲۵
- ۳۸۔ شمیم کربانی، شمس الدین حیدر۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۳۳
- ۳۹۔ انی ناگپوری، بشیر خان۔۔۔۔۔ ناگپور۔۔۔۔۔ ۲ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۰
- ۴۰۔ مسطر حیدری، دلاور حسین۔۔۔۔۔ کلکتہ۔۔۔۔۔ ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۳
- ۴۱۔ ذوالفقار علی بخاری، سید۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۴۸

- ۴۲ - نشر جالندھری، محمد عبدالجکیم خان لاہور ۲۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۱
- ۴۳ - منظر لکھنوی، سید منظر حسن لکھنؤ ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۵
- ۴۴ - حامد الا آبادی، حامد حسین الہ آباد ۱۰ ستمبر ۱۹۷۵ء ۲۶۶
- ۴۵ - ن، م، راشد (نذر محمد) لندن ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۷۵
- ۴۶ - شورش کاشمیری، عبدالکریم (آغا) لاہور ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۸۷
- ۴۷ - ہزار لکھنوی، سید حسن کانپور ۳ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۴
- ۴۸ - طالب دلاوی، شیش خیر سکینہ دہلی ۱۶ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۷
- ۴۹ - محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین بھوپال ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۳
- ۵۰ - بسمل الہ آبادی، سکھ دیو پرشاد الہ آباد ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۹
- ۵۱ - قاصر، برہم ناتھ دت کوردیشتر ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۱۲
- ۵۲ - سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۲۲
- ۵۳ - تکیں مرست، سید محمد قادر الدین - حیدر آباد ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۳۷
- ۵۴ - میرزا محمود بیگ دہلی ۱۴/۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۴
- ۵۵ - نجم آفندی، میرزا تجمل حسین کراچی ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۹
- ۵۶ - طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن .. حیدر آباد ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۵۵

شائق عظیم آبادی، سید حسن رضا

پٹنہ کے علمی دادی حلقے کی معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد نشتی سید علی حسن عظیم آبادی وہاں کے شہر اور باہر خوشنویس تھے اور شہر میں بڑے نشتی صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ وہ اس فن میں باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

شائق کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم نجی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اس کے بعد شہر کے مسلمہ تاجر عالم مولانا لاڈلے صاحب سے منطق، فلسفہ، طب، فقہ، حدیث وغیرہ حاصل کیے۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے "عالم" کی سند لی اور ۱۹۴۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کی۔ پھر ۱۹۳۰ء میں انگریزی کے دسویں درجہ کا امتحان بھی پاس کر لیا، حال آنکہ وہ خود اس زمانے میں سرکاری اسکول پٹنہ میں عربی اور فارسی کے معلم رہتے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پٹنہ پر سبکدوش ہوئے۔

اس صدی کے اوائل میں پٹنہ سٹی، جہاں ان کی سکونت تھی، علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی (ف: جنوری ۱۹۲۴ء) عبد الحمید پریشان (ف: دگت ۱۹۰۵ء) تمنا عماد (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی نواح کے رہنے والے تھے۔ غرض پوری فضا شعر و نغمہ سے جمور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شائق بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ آغاز میں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی اور ان کے شاگرد رشید وحید الدین وحید الہ آبادی سے مشورہ کیا۔ فن خطاطی اور خوشنویسی میں بھی میر باقر ہی کے شاگرد تھے ان دونوں سے اپنے استفادے کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں:

یہی ہے راہنمائی سخن کی، اے شائق! جو کھینچا ہو، تو نقش وحید باقر کھینچ

ایک اور قطع ہے :

ہے فیض حضرت باقر سے اتباع وحید
کہ جن کے رنگ کا، شاقب جو اب ہو نہ سکا

افسوس کہ ان کا شعری مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید سعید رضا گہر عظیم آبادی نے "سرمایہ نشاط" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا (پیشہ : ۱۹۷۷ء) (دندھری کتابیں "عظیم آبادی کی گزشتہ ادبی محفلیں" در "یادگارِ عشق" (سوانحی شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی) ان کی حیات میں چھپ گئی تھیں۔ پہلی کتاب پر بہارِ ایجوکیشن بورڈ نے ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

ان کے گیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بدقسمتی سے نوے کے ان کی زندگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان پے درپے حادثات نے ان کا دماغی توازن مختل کر دیا۔ بہت دن کے علاج معالجے کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے چل چلاؤ کا زمانہ آگیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۷ء کو دن کے دس بجے پٹنے میں رحلت کی۔ اٹالند و اٹالیہ راجہوں، محلہ شاہ کی ٹلی میں مغل مسجد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت قتیل دانا پوری نے تمارتخِ وفات کہی :

ایں غلط ثابت آمدہ صد حیف
بہر تمارتخِ اد ، ندا آمد
قطبِ جہندہ اے قتیل اذ جاے
"کہ شاقب، صد آمد، حسرت ہاے"

(۱۳۹۳)

سید محمد یوسف کے طویل قطعہ تمارتخ کا آخری شعر ہے :

رحلت کا سن ہے بے سراہ
"شاقب سوے جنت روانہ"

(۱۳۹۳-۱-۱۳۹۳)

ان کا کلام نچتہ اور بے غیب ہے۔ مضمون آفرینی کی کوشش نمایاں ہے۔ غزل کے

علاوہ نظم بھی کہتے تھے۔ چنانچہ مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ نمونہ کے طور پر
چند شعر ملاحظہ ہوں:

کل کہتے ہیں وہ ہر دن کل آج نہیں ہوتا

ہے وعدہ فردا بھی فرداے قیامت کا
یہ رات مصیبت کی ٹالے بھی نہیں ملتے

کٹ جاتا ہے باتوں میں دن عیش و مسرت کا

نہ دیکھا مجھے آنکھ اٹھا کر، تو کیا غم شرف تو ملا بزم کی حاضری کا
ٹھہری جو دیر دکیہ میں تھی پستی نگاہ منزل نہیں تھی وہ، جسے منزل بنا دیا
گرتے ہیں زرد پتے کہ شاخیں ہوں سبز پھر

پیغام دے رہا ہے خزاں بھی بہار کا

ایسا بھی آشیانہ کبھی شاخ گل پر تھا میں نے بھی لطف اٹھایا ہے فصل بہار کا
مرے گناہ ہیں پھر بھی شمار کے اندر ترے کرم کا تو کوئی حاب ہو نہ سکا
وقت یہ کیسا آگیا، نام خلوص مٹ گیا

غیر تو غیر ہی ہوں، دیتے ہیں آشنا فریب

ہیں مسجور کیوں اپنے جلوں سے خود چلے کیا ہیں اکینہ خانے سے آب
کہتے ہو، کیوں نظر آتا ہوں پریشان بہت

جان کر تم تو بنا کرتے ہو انجان بہت

فریب دینے لگی انتظار کی آہٹ سمجھ رہا ہوں جسے پائے یاد کی آہٹ
ہے کاروانِ حبس سبھی کیا سکے قمار کہ پیدلوں سے لگی ہے سوار کی آہٹ
چلی ہی آتی ہے پری جواب دے پاؤں ہے بے بیوں کو یہ روز شمار کی آہٹ
ساقی! ترے کرم کی جلالت بھی ہے عجیب

کل جو شراب تلخ تھی، وہ انگلیں ہے آج

تقدیر بگڑتی ہے تو ساحل پہ ہے طوفان اللہ نگاہاں ہے، تو طوفان بھی ہے ساحل

عرش بریں سے روز پلشتی ہے نامراد
 بے شکوہ سنج ہم سے فغاں اور فغاں سے ہم
 زندگی ہو گئی کس طرح سر، یاد نہیں
 روز و شب یاد نہیں، شام و سحر یاد نہیں
 لٹ گیا کیسے محبت میں یہ گھر یاد نہیں
 کیسے برباد ہوئے قلب و جگر یاد نہیں
 جب چاک گریاں ہو کلی آتی ہے خوشبو
 تخریب کے پردے میں ہے تعمیر کا پہلو

زمین و آسمان کا فرق ان دونوں میں ہے پھر بھی
 غم جاناں سے ہوتا ہے، غم دوراں کا اندازہ
 کسی کا ایک دروازہ خدا جب بند کرتا ہے
 اسی کے فضل سے کھلتا ہے کوئی اور دروازہ
 دنیا کے مال و زر کی حقیقت ہی کیا ہے
 رشتہ جو استوار ہو شاقب! خدا کے راقم
 خدا کا شکر ہے وحشت رکھ لی اگر دل کمی

دگر نہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
 فرمائیے کس کس سے کوئی دل کو بچائے
 انداز سے، شوخی سے، تبسم سے، حیا سے
 جب کچھ نہ رہا جامہ دری کو، تو یہ سو جھی
 دو چال اگرہ کم کردوں زراہد کی عباسی
 سچ ہے کہ بڑے کام کا انجام برا ہے
 بندہ وہی اچھا ہے، جو راضی بہ افسا ہے
 جس حال میں وہ رکھے، اسی حال میں خوش ہو
 داغ عاشقی، چشم تنہا، قلب و ارقہ
 انھیں لفظوں سے ہم شرح کتاب زندگی سمجھے
 بار گلشن ہستی خزاں کے ساتھ بنے ثابت
 جو دیکھے گریہ شبنم، وہ پھولوں کی متسی ہے
 دے پانچ نسیم آکے کہ جاتی ہے کچھ سب سے

چمن کی جو کلی ہے، راز داں معلوم ہوتی ہے
 چھتا تلورے میں کاشا، اور خلش دل میں سوئی پیدا
 کہاں تکلیف پہنچی ہے، کہاں معلوم ہوتی ہے

دیکھے اور کوئی ذکر، باتیں سہوں تو ان کی سہوں

یہی اک داتان سینے، یہی اک داتاں کہیے
 رسوا ہوئے تھے کل تو بہت اے خواب دل! پھر اس گلی میں جانے کو تیار کیوں ہوئے؟
 دیکھتے ہیں جو تمھارے گیسو درخ کی بہار صبح ان کی صبح ہے اور شام ان کی شام ہے
 کیا بتاؤں آپ کو تاریکی روزِ فراق صبح سے معلوم ہوتا تھا کہ وقتِ شام ہے
 ماتھے کا بل سمجھتے ہیں جس پہچِ دُنا ب کو زینت ہے گیسوؤں کی اسی پہچِ دُنا ب سے

اکمل جالندھری، رام پرتاب

اگرچہ ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کا رہنے والا تھا، مگر چونکہ ان کے والدینڈت کھگت رام (ت: اگست ۱۹۲۹ء) لکشمی جگدھن فیکری، کھنہ (ضلع کرناٹ) میں ملازم تھے، اور اسی سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ اس لیے رام پرتاب کی ولادت یہیں کھنہ میں ۲ فروری ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے، دی کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا، لیکن انٹر کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شعر گوئی کے شوق کو فروغ ہوا، جس کی طرف رحمان طالب علمی کے زمانے ہی سے نمایاں تھا۔ ان کے ابتدائی اسکول میں پندرہت یوگ راج نظر سوامی بھی مدرس تھے۔ نظر اچھے شاعر تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی مضامین لکھتے تھے؛ ان کا گیتا کا منظوم ترجمہ چھپ چکا ہے۔ اسی باعث شہر سیاسی لیڈرینڈت مدن موہن مالویہ ان کے بڑے مداح تھے۔ نظر نے نوجوان رام پرتاب کا میلان طبع دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی؛ اکمل تخلص بھی انھیں کا عطیہ تھا۔

ملازمت کے بعد باقاعدہ شہر کہنے کا موقع ملا، تو انھوں نے رضا علی خان رضا ناوی سے اصلاح لینا شروع کی جو انھیں کی طرح ریلوے ہی میں ملازم تھے۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں ریلوے کے اس دفتر میں کئی شاعروں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ مثلاً عبدالغنی، نہال سیوہاروی، کھی ہیں تھے اور اکمل سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ نہال بہت اچھا کہتے تھے؛ اور ان کا سائل ملوی کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے تھے اور وہیں کراچی میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ منور کھنوی بھی اس زمانے میں یہیں تھے۔

پوری عمر پلوے کی ملازمت میں گزری۔ یہیں سے ۴ فروری ۱۹۶۷ء کو سکدوش ہوئے۔ اس کے بعد بسا اوقات کے لیے دلی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔

اتوار ۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوا اور ۲۱ جنوری کو جسدِ خاکی نذر آتش کر دیا گیا۔ اولاد میں صرف ایک بیٹا رگھو بینندن چھوڑا۔ یہ سیندری فیکٹری میں ملازم ہیں۔

انتخابِ کلام: "لوے گل" ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا (دلی ۱۹۷۶ء) وہ غالب کے شعر کا تلازمہ لورا کرنے کو دو اور مجموعے "نالہ دل" اور "دودِ چراغ" بھی شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، حال آں کہ دونوں مرتب ہو چکے تھے۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ اور صحتِ زبان کے ساتھ جدید رجحانات کا پتا بھی جلتا ہے۔ وہ فطری شاعر تھے اور اگر زمانہ سازگار ہوتا، تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کرتے جو انھیں نصیب ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

جب آشاں ہی اپنا چمن زار میں نہیں کیا شاخ سے غرض ہمیں مطلبِ ثمر سے کیا
میں ناشائسِ عظمتِ دیر و حرم نہیں نسبت انھیں مگر ہے تم کے رنگِ رے سے کیا

ہمیں کیا، مگر خزاں کا دور ہو یا موسمِ گل ہو

خزاں کا غم تو ان کو ہو جو کھیلے مونِ سہاؤں سے

اب اس پہ بھی کوئی کھٹکے، تو کچھ علانِ نہیں چراغِ راہِ تری رگِ زرد ہوئی تو ہے

کرم نہیں، نہ سہی، میں کرم سے درگزر ا یہ کیا ہستم یہ بھی مائلِ شتم شعراءِ نہیں

طریقِ عشق میں جب سرِ فردوسی شرطِ اول ہے

تو پھر عشاق کا منزل بمنزلِ امتحانِ کیوں ہوا

یہ مانا نغمہ زنِ موتم، مرے سازِ تصور میں

مگر سازِ تصور کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہوا

ہزارِ داغ ہیں ادران میں دل ہے یوں جیسے

کئی جازوں میں اک سوگوار کا عالم

گزر جاتا ہے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے
زبان و دل میں یہ کیا تفرقہ ڈالا محبت سے
مے دم سے جہانِ زندگی میں زندگی سی ہے
کہ دل کچھ اور کہتا ہے، زبان کچھ اور کہتی ہے
نہانہ پھر گیا، کیا پھیر لی تم نے نظر مجھ سے
خدا شاہد کہ ہے یہ رونیِ شام و سحر مجھ سے
کچھ تم یہ نہیں موقوف کوئی دنیا میں ہمارا ہونہ سکا
تم ہم سے کنارہ کر بیٹھے، ہم سے تو کنارہ ہونہ سکا

جہاں انگڑیاں لینے لگا ہے ہمارا دل ہمارا اور کت تک!
بجز اس کے کیا ہیں یہ اشک اور آہیں وہ آنکھوں کا قصہ، یہ غم کی کہانی
دوش پر بکھری ہوئی زلف پریشاں دیکھیے پھر ہوئے میری پریشانی کے سامان دیکھیے

سنت

بیس کروٹیں وہ اشہب لیل دنہار نے
اٹا نقاب رخ سے عروس بہار نے
فطرت چلی ہے رنگ جہاں کو نکھانے
جلوہ دکھا دیا کسی رنگیں عذار نے
ہر شاخ، ہر شجر کی ادائیں بدل گئیں
پلٹا وہ رخِ فضا نے، سو این بدل گئیں
ہر پھول، ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے
صحنِ چین میں بادِ صبا میفروش ہے
ہر سمت فیضِ ساقی محبوبِ عام ہے
ہر چشمِ مست بادہ گلگوں کا جام ہے
صہبائے تگ و تاب ہیں بے دوا و اجہاں
یسی ہمارے خلد میں رنگینیاں کہان
موجِ سواہیں کیفِ بے تاب کے رواں
جو گلستانِ سند کے پھولوں میں ہیں نہاں
ہر ذرہ آفتاب کے اس سرزمین کا
کیا حسنِ لا جواب ہے اس نازنین کا
دنیا نہیں یہ گلشنِ جنت ہے ہو بہو
ہر سمت ہے تلاطمِ امواجِ رنگ و بو

ہر لب پستیوں کے ترانے ہیں چار سو گانے لگے بسنت جو انانِ خوش گُل
 بزمِ جہاں میں عیش و طرب کا ہجوم ہے
 دیکھو جدھر بسنت کے آنے کی دھوم ہے
 یہ دور ہے عجیب، سماں لا جواب ہے احباب میگسار میں شغلِ شراب ہے
 ہر جام میں تجلی صہاے ناب ہے ہر دل بقدرِ ذوقِ طلبِ فیضیاب ہے
 اتنی ملی ہے مے، جسے جتنی انگ ہے
 اس حسنِ امتیاز پر ہر شخصِ نگ ہے
 ہے دیدنی جو رخ پہ چینوں کے نور ہے جس مہوش کو دیکھے، وہ رشکِ تڑپ ہے
 مستانہ آنکھریوں میں وہ کیف و سرور ہے گویا تشے میں حسن کے، خود حسنِ چور ہے
 ہر ایک ناز نہیں ہے بسنتی لباس میں
 مے جیسے زعفران کی بھری ہو گلاں ہیں

جوان سندیلوی، مٹی لال

۱۸۸۹ء میں سندیلہ (ضلع ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب رام شاہ تجارت پیشہ تھے مٹی لال نے بمشکل آٹھویں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے شیرہ کے کاروبار میں ہاتھ مٹانے لگے۔ جب والد نے نقل مکان کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ ہمارت پیدا کر لی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں شعر کہنا شروع کیا شروع میں میر نصیب علی سندیلوی سے مشورہ کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد انور حسین آرزو لکھنؤی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق محض حسن اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ سندیلہ میں منشی فضل رسول واسطی سندیلوی کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اس کے ساتھ ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوتی، جس میں شرکت کے لیے دور دور سے شعرا حضرات بلائے جاتے۔ ایک مشاعرے میں سید انور حسین آرزو بھی آئے۔ مشاعرے کے اختتام پر سید التفات رسول ہاشمی تعلقہ دار نے ان کا تلمذ اختیار کیا اور انھیں اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد آرزو متواتر گیارہ برس تک ہاشمی صاحب کے دامن سے وابستہ رہے۔ سندیلہ میں ان کے قیام کے زمانے میں یہاں کے بہت اصحاب نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں سید التفات رسول ہاشمی کے انتقال کے بعد آرزو سندیلہ سے نکلے اور بعض فلسافوں کی دعوت پر مستقلاً کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔ اس پر جوان نے بھی وہیں کی سکونت اختیار کر لی،

تاکہ استاد سے پورے طور پر استفادہ کر سکیں۔ کلکتے میں بھی انھوں نے تجارت ہی کو اپنی بسر اوقات کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۶۱ء میں کلکتے سے لکھنؤ واپس آئے۔
 آرزو کی زبان و بیان اور عروض سے ماہرانہ واقفیت زبان زد خاص و عام ہے ان علوم میں بھی جوان اپنے استاد کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں نے ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔
 بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن گنج، لکھنؤ میں انتقال کیا۔

جوان کی شادی شاہجہانپور میں شریعتی برنج رانی سے ہوئی تھی جن کا ۱۳ اپریل ۱۹۷۰ء کو بعارضہ فاجح لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ان کے پانچ اولادیں ہوئیں لیکن چار بچے ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بیٹا شری آشد بہاری لال گیتا اپنی جسمانی یادگار چھوڑا ہے؛ یہ یوپی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازم ہیں۔
 کلام کے نئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ کلیاتِ جوان حصہ اول عرف حسین چراغاں (۱۹۶۳ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ دوم عرف شوخ غنچہ (۱۹۶۴ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ سوم عرف چراغ قاف (۱۹۶۶ء)؛ سوز دل (دس نظمیں)؛ رباعیاتِ جوان؛ خوش رنگ پھول (غالب اور آرزو کے اشعار کی تفسیریں)؛ فریاد و جواب فریاد (بطور شکوہ و جواب شکوہ اذ اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس وغیرہ۔
 انھوں نے پارہ مرثیے بھی کہے تھے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام؛ دردِ رحِ حضرت عون و محمد؛ دردِ رحِ حضرت عباس علمدار؛ دردِ رحِ حضرت علی اصغر۔ یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیلِ زعافات اور آئینہ بحورِ دلکشتہ (۱۹۵۸ء) اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں لکھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر چیز "حضرت آرزو کی اصلاحیں" (شاگردوں کے کلام پر) ہے۔ بعض چیزیں بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی گئیں۔ آخری عمر میں مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی، تو حکومتِ یوپی نے ان کا ۶۰ روپے ماہانہ

ادبی وظیفہ مقرر کر دیا تھا، جو موت تک ملتا رہا۔

کلامِ نختہ اور بے عیب ہے پند شعر درجِ ذیل ہیں۔ ان کی ذفات سے ایک خوش خلق، منکسر مزاج اور وضع دار شخص اٹھ گیا۔

پروانہ بن کے کام کسی کے نہ آ سکا۔ ماندر شمع رونق محفل نہیں ہوں میں
 کلیم و طور کا افسانہ سن کر بھی وہی دُھن ہے

جو ان! ہشیاد ہونے پر بھی نادانی نہیں جاتی

ابھی تو، موسیٰ! غشی کا شکوہ، پلک جھپکنے ہی کا کلمہ ہے

جواب کی پردہ کسی نے اُٹا، تو یہ سمجھ لو کہ فیصلہ ہے

جنونِ عشق کی کار فرمائی نہاں ہے خندہ گُل میں

گریباں سے عیاں ہوتے گریباں ہم نے دیکھا ہے

دیوانہ الفت کی، جواں! شان یہی ہے ہاتھوں میں ہے پتھر، تو ابو ہتہا ہے سر سے

ادھر یہ فکر کہ محو جہاں ہو کوئی ادھر یہ فکر، نکا ہوں کا اعتبار رہے

ہم بھی کسی کے ساتھ بدلتے رہے مزاج چلتا پڑا زمانے کی رفتار دیکھ کر

بازو میں جب سے زور رہائی کا آگیا آتی ہے شرم خود کو گرفتار دیکھ کر

منا قبول، بات سے پھرنا نہیں قبول آگے بڑھیں گے ہم رسن دار دیکھ کر

گرجا اپنی حد سے اس طرح، اے جذبہ الفت

بنائے جو ہمیں مجبور، خود مجبور ہو جائے

اس طرح جنوں کی جانچ کرے، نہ بیا یہ نہیں خزانے کو

سوچو تو ہسی، کیا کرتے ہو، دیتے ہو چھری دیوانے کو

گھٹا ہے چین ہے، بہا رہی ہیں، پھر بھی جو ہم چلتے ہیں، وہ ساماں نہیں ہے

محبت کر کے انجامِ محبت پر نظر کیسی! یہ اب کیوں پوچھتا ہے، اے دلِ ناکام! کیا ہوگا؟

نقطہ دنیا میں کی تھی، روزِ محشر تذکرہ کیوں ہے؟

کہاں کی بات پڑھی جا رہی ہے اب کہاں مجھ سے

قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ دراجستھان کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر کے حالات بہت نامتلی بخش تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ذرائع بسر اوقات کی بہتری کا امکان نہیں، تو ہجرت کر کے موضع "لوڑ ادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۳۴ میل دور نسبتاً خوشحال جگہ ہے۔ بیوی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوٹہ ہی میں مقیم رہیں لیکن بد قسمتی گھات میں تھی۔ کوٹہ میں بیفہ دہائی صورت میں پھوٹ پڑا۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی رحلت کر گئے۔ اس وقت قیس، شکل دس برس کے ہو گئے۔

اس حادثہ کی خبر لوڑ ادیت پہنچی، تو ان کے والد کوٹہ آئے اور بقیہ السیف خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری ہندی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ شہد حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوپے، چوپائیاں وغیرہ لکھنے لگے۔ اس زمانے میں وہ نور خالص کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی۔

وہ ۳۰ برس کے تھے کہ لوڑ ادیت سے اپنے مسقط الرأس کوٹہ واپس چلے آئے۔ لیکن اصلی مسئلہ روزگار کا تھا، یہ نہ لوڑ ادیت میں ملا، نہ کوٹہ میں۔

۱۹۳۲ء میں فضل حسین ثابت لکھنوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ثابت اہل زبان اور صاحب فن استاد تھے۔ ان کا تخلص نور بدل کر قیس کر دیا۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ ان کی تعلیم ناقص تھی، اور شاعری علم و فن

کے بغیر ناممکن ہے ثابت نے قیس کی یہ کمی پوری کرنے میں جو محنت کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہو گیا، تو ۱۹۴۲ء میں قیس نے سیاب اکبر آبادی کا دامن تھاما اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی۔ ۲۸-۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی اربابِ اردو نے کوٹہ میں شاندار پیمانے پر جشنِ قیس منایا، اردو کے مشہور و معروف شاعرینِ بزرگ آنحضرتؐ نے اس تقریب کی صدارت کی۔ اس موقع پر گیارہ سو روپے کی کھیلی بھی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

میرزا گاری بدستور قائم رہی۔ اس پر راجستھان۔ اسیٹیہ اکادمی نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دس برس ملا۔

آخری ایام میں کوٹہ سے ۲۰-۲۵ میل دور ایک مقام سیکت میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں بروزِ ہفتہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء (یکم محرم ۱۳۹۲ھ) کو پیامِ مرگ آپہنچا۔ ان کے اساتذہ بھائی مفتون کوٹوی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا:

موا ہے دل کو بہت ہجرِ قیس کا صدہ
شہیدِ عشقِ خدا "محرزنِ تواضع" بھی
مجھے جو یہ خبر مرگ پر ملا ملی
صفاتِ قیس سے تاریخِ انتقال ملی
(۱۳۹۲ھ) (۱۹۷۲ء)

خالگی زندگی بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھی؛ بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے اسے "نہایت تلخ" کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، نسیم احمد، فیاض احمد) فیاض احمد (یا ضحیٰ) اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

قیس خالصاً غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیفیت نہیں جو ان کی غزل کا حصہ ہے۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ بعض رسائل میں جو کچھ ملا اس کا انتخاب پیش کر رہا ہوں:

قیس! میری زندگی و موت بھی، ہے اک سراب
جیتے جیتے، مرتے مرتے، ہی پریشاں ہو گیا

سجود و شوق میں دیر و حرم کے ہیں فانی و

زہے قسمت کہ میرا ایک سر ہے، آستانہ دو

فانی ختم ہوگا وعدہ فردا پہ کل ایسا

نیشن میں کیا تھا کہ برقی محبتی گری، اور پھر آسمان تک نہ پہنچی

ختم ہے قیس! جنوں، وحشت و سودا چھوڑ کون پوچھکا مرے بعد بیاباؤں کو

دیکھنا، قیس بھی مجنوں نہ کہیں موجاں اس کے کوچے میں پھرا کرتے ہیں دوانے سے

جدھر جاتے ہو تم اے قیس بسب مجنوں سمجھتے ہیں

زرا اہل نظر کی قدر دانی دیکھتے جاؤ

سوز غم حیات سے اپنا ستا ملا دل کیا ملا کہ محرم را ز بقا ملا

آغاز عشق بھی یہی، انجام عشق بھی یہی پہلے بھی انتظار تھا، اب بھی ہوں انتظار میں

آہیں سکتی بھی پھر اس گلستاں میں بہار جو خزاں آنے سے پہلے ہی بیا باں ہو گیا

شمس دقیریں ہو، تو کمرے سجده کاٹنا خشدگی جو ذرہ خاک بشر میں ہے

یہ بھی اظہار محبت کا ہے انداز عجیب میں ادھر خاموش ہوں اور وہ ادھر خاموش

نقش قدم، نہ نقش جبین کا ہے امتیاز اب کیا بتاؤں، کون تری رگدڑ میں ہے

طور کے انوار اب بھی ہیں نگاہ حسن میں جس طرف دیکھا نظر بھر کر، چراغاں ہو گیا

نہ جانے کیا تھا مرے سجده جبین میں نہاں

ہنوز دیکھ رہے ہیں وہ آستانے کو

لحد تک بعد مرنے کے پہنچا اپنے قدموں سے یہاں بھی کاش میرے ساتھ محبت نارسا ہو

کھرے جاتے ہیں جب آئینہ تصویر کے ٹکڑے تو چن لیتا ہے گردوں، حُسن کی تصویر کے ٹکڑے

میں حیراں ہوں کہ کیجا کس طرح کروں سیرِ مہفل

ادھر ہیں دل کے ٹکڑے، اور ادھر شمشیر کے ٹکڑے

یہ جن سے گردش ایام نبتی ہے، بگڑتی ہے درخشاں ہیں فلک پر وہ مری تقدیر کے ٹکڑے

انجمنی، محمد امجد، شیخ

کنک کے ایک آسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد محمد یوسف صاحب کا اپنے زمانے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ پہلے وہ یکے بعد دیگرے اڑیسہ کی تین ریاستوں نیلگری، ڈھنکا نال، تالچر میں نائب دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ تالچر کے بعد ریاست پال کھر میں مقرر ہوئے تھے کہ ڈیڑھ ایک سال بعد فوج کا حملہ ہوا جس سے جسم کا بایاں حصہ بیکار ہو گیا، اور وہ کام کاج سے محروم ہو گئے۔ بارہ برس بستری علالت پر رہنے کے بعد ان کا ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا۔

محمد یوسف صاحب اڑیا کے علاوہ اردو فارسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور یوسف تخلص کرتے تھے۔ وہ داغ و راس کے طرز کلام کے عاشق تھے۔ مثنویوں ان کا کلام دامن کاچیس "اور پیام یار" میں چھپتا رہا۔ مجموعہ بھی "نکبت یوسف" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ لیکن آخری آیام کی طویل علالت اور ہجرت کے دوران میں یہ اضافہ ہو گیا۔

انجمنی انھیں محمد یوسف کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد احمد تھا۔ انجمنی ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو کنک میں اپنے آبائی مکان (محلہ بخشی بازار) میں پیدا ہوئے جو بعد کو ان کے والد کی علالت کے زمانے میں خالص لگ گیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو حسب معمول بڑے لاڈ چاؤ سے بسم اللہ ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی مدرسہ کیتھولک مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔

دسویں کے امتحان کے لیے پیاری موہن اکیڈمی کنک میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں

طبیعت شرگوئی کی طرف مائل ہوئی اور لا زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی اور اس میں اپنے محلے کی پلٹن مسجد کے پیش امام محمد حبیب اللہ تسنیم چیلوری سے مشورہ کرنے لگے شروع میں تخلص امجد تھا، اب تسنیم کے کہنے پر اسے ترک کر کے انجمن رکھ لیا۔ کوئی سال بھر بعد تسنیم نے پیش امامت چھوڑ دی اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اسی سلسلے میں رنگون چلے گئے۔ انجمن کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نذر علیہ خط و کتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول مال دیا اور لکھا کہ سب بہتر استاد اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے، آپ بھی یہی کریں۔ اب انجمن نے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی رحمت علی و محنت (والد کرامت علی کرامت، ف: ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کہنے کا شوق ہوا، تو اس میں حافظ شمس الدین احمد منیری شمس (ف: ۱۹۷۵ء) سے مشورہ رہا، جو اس زمانے میں راوشا کا بچہ، کٹک میں قانون کے مدرس تھے۔

ان کی تعلیم متوزر کمال نہیں ہوئی تھی کہ ترک ہوالیات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بھی اسی ریلے میں بہ گئے اور جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی نظمیں سناتے لگے۔ بکرے کی ماں کت تک خیر مناتی، آخر گرفتار ہوئے اور جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ جب رہا ہوئے، تو ان کے والد نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد محمود شریف کے پاس رانچی بھیج دیا، جو وہاں کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس کے علاوہ ان کی پیشہ روی کی دکان بھی تھی۔

۱۹۲۲ء میں رانچی سے واپس آئے، تو انھیں سنگ میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انھوں نے "نرم ادب" کی تشکیل کی اور اس کے اہتمام میں مشاعرے کرتے رہے۔ پھر لو کو موٹو دفتر، خروہ روڈ، جہنمی تبادلہ ہو گیا، یہاں "بنگ مسلم کلب" قائم کی، اور ڈرامے پیش کرنے کی طرح ڈالی۔ اس زمانے میں آغا حشر کاکڑ طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ پہلے انھوں نے حشر کے متعدد ڈرامے سلج کیے، ان میں اداکاری بھی کرتے اور کھیل میں

ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیتے۔ پھر خود ڈرامے لکھنے لگے۔ انھوں نے چار ڈرامے لکھے، اور انھیں ایچ بی کیاتھا: "بد نصیب بادشاہ"، "کامیاب تلوار"، "کشور کانتا"، "انصاف کا کوڑا"۔ یہ سب سنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام ۱۹۲۲ء میں گوجیٹا میں بھی رہا (اسے آج کل گوردی چھاٹیا کہتے ہیں) اور ۱۹۲۶ء میں راج آٹھ گرٹھ میں ۱۹۳۸ء میں ان کا دفتر (لوکو موٹو) آندھرا نقل ہو گیا، اور یوں وہ والیسٹر پہنچ گئے۔ یہاں بھی انھوں نے بعض احباب کے تعاون سے "نرم ادب" قائم کی، جس کا نام بعد کو بدل کر "اردو مجلس" ہو گیا (یہ آج تک قائم ہے) وہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۴ء تک اس کے صدر رہے۔ اس مجلس کے زیر اہتمام باقاعدہ مشاعرے ہوا کیے، بلکہ انھوں نے کل شہزادہ دوکانفرنس بھی کی والیسٹر کے قیام کے دوران ہی میں انھیں فاری میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا افسانے بھی لکھے اور نثری مضمون بھی۔ ان کا والیسٹر کے قیام کا زمانہ ان کی ادبی تربیت اور کیفیتِ دلکیت، غرض ہر پہلو سے بہت اہم ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے نیشنل پرسکڈش ہوئے، نیشنل قلیل تھی، اس لیے حکومت اڑیسہ نے انھیں ۵۰ روپے ماہانہ کا ادبی وظیفہ عطا کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ٹائپ اور اسٹینو گرافی سکھانے کا ایک اسکول جاری کیا، جس کا نام سٹی کمرشیل کالج رکھا تھا۔ اس سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ تینگی نرشی سے گزربھر ہوتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عزیز سے مدد لینا گوارا نہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے محنت اور مطالعے سے اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی بعض بزرگوں کی صحبت سے بھی مدد ملی۔ مشتق دمرادلت سے انھوں نے اتنی ترقی کر لی کہ بالآخر ان کا اردو کے قادر الکلام شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور میں اڑیسہ کے مسلم البشوت استاد تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، "طلوعِ سحر" (کتاب ۱۹۶۱ء) جو بے کہکشاں، "دکتاب" (۱۹۶۹ء) نظم و نثر کا بہت سراہا غیر مطبوعہ رہ گیا۔ وہ دونوں کتاب کے دو ہی شاعر

کے مدیر بھی رہے جسے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جاری کیا تھا۔

انھیں ۱۹۷۱ء سے ضیق النفس کی شکایت تھی؛ یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس سے بہت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کی شب میں ایک مشاعرے سے واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زمانہ، دمہ کے مریض اور اس پرانے لوہے اور دردِ دسر۔ اسی میں بروز جمعہ کلمہ فردری ۱۹۷۴ء دن کے ٹھیک ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جمعہ کی نماز شروع ہونے سے پہلے خطیبِ حاضرین سے ان کی صحت کے لیے درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان کی مغفرت کی دعا کے لیے کہا گیا۔ ا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ جمعہ کی فضیلت سے فیضیاب ہونے کے لیے فوری تجیز و تکفین کا انتظام کیا گیا، ان کے سب احباب کو اطلاع بھی نہیں دی جاسکی۔ اس کے باوجود جنازے کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا قدم رسول (درگاہ بازار) کنگ میں قبلِ مغرب دفن ہوئے۔

ان کے کئی احباب نے تمارتخ و فوات بھی۔ انیس ام کے قطعے کا آخری شعر ہے۔

نہیں کیا کہوں تمارتخ پر دہ داری دوست
”بڑا ستم ہے حجابِ دل و نظیر ہونا“
(۱۹۷۴)

فیاض گوالیادی کہتے ہیں:

ہے دعاے مغفرت فیاض! تمارتخ و فوات
”مجرب بھی ہو جزہ و شاخارِ خلد کہ“

علامہ جمیل منٹھری کا قطعہ ہے:

نچی صنوفِ شاں! اخترِ مطلع کساک

جس سے افق تھا تاناک کل زشمالِ تاجِ نوب

کہتی ہے اس کی موت پر تیرگی دیا ر فن

کہیے کہ ”آہ آہ آج تجھ وطنِ موداعِ د“

(۱۳۹۴)

ان کی شادی اپنے منجھلے حاکم شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی (ذیب النساء) سے ہوئی تھی اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ دو چھوٹے بیٹے (محمد رفیع اور محمد وسیع) ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے سب سے بڑے محمد رفیع اور چاروں لڑکیاں (نجمہ، زینب، سعیدہ، شامہ) ماشاء اللہ حیات میں۔

موت کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

ہاے، اس ہوش کی جلوہ گسری کل رات کو
اس کے سن ضیف لگن پر اتنی نازاں تھی زمیں
ہاے، وہ بلور سے تر شاہو اس کا بدن
اس کی آنکھوں میں وہ جادو، اس کا لب پڑو
تاکتے تھے گلستاں سے لالہ دسرو دامن
تھالب ز ابر پر شور و درداہم الصمد
محفل انجم میں ڈھلتی تھی شراب رنگ و نود
اس کے نیلے جسم پر وہ چودھویں کا چاند
کلیہ احزماں مرا، تھا غیرت بزم طرب
ہو رہی تھی نور کی بادش درود دیوار پر
ہاے نازک پریشاں سجدہ ریزاں کچھ طرح
جذب یوں ہیں میں مل کر ہو گئے تھے سن و عشت
رک گئی تھی اس کی گردش، ختم گئی تھی اس کی
صاف میں نے کمر دیا انکار لینے سے اسے

تھی جنوں آگیاں بہار دہری، کل رات کو
کر رہی تھی آسماں سے سمیری، کل رات کو
ہے حقیقت تھے بتان آذری، کل رات کو
ہو گیا تھا، مع سحر سامری، کل رات کو
بھا نکتی تھی آسماں سے مشری، کل رات کو
اد و زبان برہمن پر ہے ہری، کل رات کو
کہکشاں تھی صورت تار ندی، کل رات کو
بن گیا تھا آسماں نیلم پری، کل رات کو
مٹ گئی تھی میری تیرہ اختر، کل رات کو
صحن تھا آئینہ اسکندری، کل رات کو
عین ایماں بن گئی تھی کافری، کل رات کو
کچھ نہ تھا "من دیگرم" تو دیگر، کل رات کو
تھامے قابو میں چرخ چنبری، کل رات کو
دے رہے تھے مجھ کو تاج قیصری، کل رات کو

عمر بھر وہ کے یاد آئیگی، اے نجمی

میری قسمت نے جو کی تھی یاد دہری، کل رات کو

کچھ گزشتہ راحت و آرام کی باتیں کریں
آؤ، پھر گزشتہ ایام کی باتیں کریں

آؤ کیوں بیکار نہیں کام کی باتیں کریں
یہ اگرچہ ہو کہ ذکر عیش نصف عیش ہے

ابتداءے عشق کی وہ سلسلہ جنبانیاں
اک ذرا افسانہ زلف مسلسل چھڑ کر
وہ کسی کے وعدہ جاں بخش پر بیچتیاں
وہ دفور اشتیاق دید، وہ ذوق نظر
یاد تو کر لیں ذرا کبجِ قفس کی راحتیں
دھمے لگیں، وہ بزمِ کیف، وہ سرشاریاں
جذبیہ شوق شہادت کی سائیں سرگزشت
اجرا کچھ کہے اپنے عشق کے آغاز کا
کس طرح ہم نے جلائی تھی یہاں شمع امید

آؤ، پھر اس نامہ و پیغام کی باتیں کریں
آؤ، پھر قیدِ دلِ ناکام کی باتیں کریں
آؤ، پھر اس انتظارِ شام کی باتیں کریں
آؤ، پھر ان جلوہ ہائے بام کی باتیں کریں
آؤ، پھر رنگِ فریبِ دام کی باتیں کریں
آؤ، پھر اس ساقیِ کلفام کی باتیں کریں
آؤ، پھر اس تیغِ خونِ آشام کی باتیں کریں
آؤ، پھر اس عشق کے انجام کی باتیں کریں
آؤ، پھر اس آرزوئے خام کی باتیں کریں

یہ جہاں فانی ہے، سبھی ایسے یہاں کس کو ثبات

آؤ، کچھ اپنے نمودِ نام کی باتیں کریں

جب دل ہی نہیں ہے پہلو میں، پھر عشق کا سودا کون کرے

اب ان سے محبت کون کرے، اب ان کی تمنا کون کرے

اب ہجر کے صدمے سہنے کو، پتھر کا کلیجہ کون کرے

ان لمبی لمبی راتوں کو مر مر کے سویرا کون کرے

ہم رسمِ وفا کو مانتے ہیں، آدابِ محبت جانتے ہیں

ہم بات کی تہ پہچانتے ہیں، پھر آپ کو رسوا کون کرے

اے جذبیہ الفت! تو ہی بتا، کچھ حد بھی ہے اس ناکامی کی

بالوش نگاہوں سے ان کا محفل میں نظارہ کون کرے

ہم دیکھ چکے، ہاں دیکھ چکے، دستورِ تھاری محفل کا

جب شکر پہ یہ پابندی ہے، پھر جرأتِ سکوت کون کرے

سمجھ رہا ہے تو بندوں کو بربہاں نبھو
تو کیوں نہ لطفِ خالی ہو تیرا لطفِ سحر

ہیں تیرے واسطے شیشِ جہاتِ جلوہ کف
ہے تیرے واسطے فطرت بھی گرمِ قصہ سرود

تو کہ رہا ہے یہاں کہ جس کو جنت لا حاصل
بلند ہوئی گئی جس قدر نگاہِ بشر
ہے تیرے سینے میں پوشیدہ مومنِ طوفانِ خیر
یہ زندگی کی کشاکش، یہ سوز و سازِ جانتا
تو اس کو پھونک دے، بن کر عمل کی چنگاری
کمی نہیں ہے جہاں میں آتشا سوں کی
یہاں تو، تو ہی سلیم و خلیل بن نہ سکا
”ہمہ از دوست“ سمجھ اس کو، تجھی ایاتِ خداست“

سوا خدا کے یہاں، جو ہے وہ ہے لا موجد

بھکتا ہی نہ تھا پھر ایسا جھکا، نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں

معلوم نہیں اس کرنے کیا اس شگِ در میں دیکھ لیا
انتفاتِ اولیں کی بات ہی کچھ ادا ہے
بھگوان کی بزم میں اب ورجام آیا تو کیا

کیوں یہ کہتے ہو، کوئی چاہنے والا ہی نہیں

چاہنے والوں کو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں

بجائے فرطِ جنوں نے ہمیں کیا رہسوا
گریز کیا میں کروں، ناصحوں کی صحبت سے
جمالِ یار میں آخر یہ بکسی کیا ہے
جہاں نہ کچھ ہو، یہ صحبتِ ہاں بری کیا ہے

عزیز جھالا واڈی، محمد عزیز الرحمن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالا داڑ کے باعزت ملازموں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کے دادا نشی علی بہادر منصرم کو کھٹی دکان خانہ جات تھے۔ ان کے بعد عزیز کے دادا نشی عبداللطیف بھی کانا خانہ جات کے منصرم رہے۔ عزیز یہیں جھالا داڑ میں بسنت سمجھی کے دن جمعرات ۱۹ فروری ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔

خاندان میں تمام سہولتیں میسر تھیں، لہذا تعلیم مناسب طریقے پر گھر ہی پر ہوئی، اور اس کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں لے لیے گئے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ بھی منصرم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے "کشنر" کے مساوی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالا داڑ کے چار حکمرانوں کا عہد حکومت دیکھا: (۱) راج رانا ظالم سنگھ، ان کے زمانے میں ان کا شباب تھا۔ (۲) ہمارا رانا بھوانی سنگھ؛ (۳) ہمارا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز مقرب خاص رہے۔ (۴) راج رانا ہریش سنگھ یہاں کے آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریہ ہند میں ضم ہو گئیں، تو ابتدائی زمانے میں راجندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔ ہمارا رانا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم و ادب تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو جہاز پر ہوا جب وہ علاج کے لیے لندن جا رہے تھے۔ لاش عدن میں سپرد خاک ہوئی، اور پھول جھالا داڑ آئے، جہاں بقیہ رسوم ادا ہوئیں۔ ان کے زمانے میں ادبی اور ثقافتی قسم کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے ذمے ہوتا تھا۔ عزیز

کے کلام میں جو متعدد نظمیں ساگرہ کی مبادیاد، ہولی، جشنِ غسلِ صحت وغیرہ کے عنوان سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہی تھیں۔

ہمارا نا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹھ شالہ، ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناٹک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کچل تقاریر منعقد ہوتی تھیں۔ ان ادارے کے ہنرمیں بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریبوں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا۔ ان کے جانشین ہمارا ناٹھ اجندر سنگھ کے تھے۔ وہ مصاحب خاص اور ہر وقت کے ندیم حاضر باش تھے۔ ہمارا ناٹھ اجندر سنگھ شعر بھی کہتے، اور مخمور تخلص کرتے تھے۔ عزیز جب چلے پرآتے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے عہد کے قصے بیان کرتے اور ان کی علم پروری اور ادب فوازی کے واقعات سنایا کرتے تھے، وہ ان دونوں کے ہمیشہ مداح رہے۔

عزیز کے مکتبی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب الدین تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی عزیز کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب موصوف سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالصمد شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر جناب فقیرالاشعر مولوی عبدالوحید نرننگ کا کوری کے شاگرد ہو گئے۔ یہ تلمذ انھوں نے ہمارا ناٹھ بھوانی سنگھ کے ایما پر اختیار کیا تھا۔ نرننگ خود نشتی عبدالحمید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور نعت گو مولوی محمد حسن کا کوری (ف: اپریل ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے۔ نرننگ ۲۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کوری میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اردو کے فروغ میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ بہت ذہین اور طبائع آدمی تھے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے ان سے کسبِ فن کیا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت پختہ سخن گو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حینِ حیات شائع نہیں ہوا۔ دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں، دوسرے میں رباعیات، قطعات

نظیں وغیرہ۔

عزیز بہت وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شیر والی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نیرے کے قلم سے لکھتے رہے۔ یہاں نواز اور سیر چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی، ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ جھالاداد سے باہر سات آٹھ میل دور سکیست کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک بچا داری لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۲ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۸۹ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا۔ تو وہ کچھ سے گئے، اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شفقتگی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ دولڑکے (ڈاکٹر محفوظ الرحمن اور محبوب الرحمن) اور دولڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ سب اشاء اللہ اپنے اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش دھرم ہیں۔

مفتون کوڑی نے تاریخ وفات کہی:

گر گئی زید و زبر بزم خیال
دہ عریز خوشنوا رخصت ہوا
جنت الفردوس ان کو ہو نصیب
ہے یہ مفتون! ان کی تاریخ وفات
اطلاع احوال پر ملا
تھے جو بزم دوستاں میں خوش مقام
معفرت فرمائے رب ذوالجلال
"قرب سبحان" پاگیا رنگیں خیال

(۴۲۳ + ۹۷۱ : ۱۳۹۴)

افیس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل میں بھی زیادہ نہیں ملتا کیونکہ انھیں اپنی درباری معروضیوں سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے چھپنے کے لیے بھیجتے۔ چند شعر بعض رسائل سے لیے گئے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں:

تری نظر سے نظر مل گئی ہے کیا میری
بلا ہی ہے اشارے سے اب قضا میری

عزیز! عمر و روزہ کئے نہ راحت سے تو پھر بقا میں ہے یہ بھی کوئی بقا میری!

ہاں کا جس طرح سے کرے میزبان کا ظہاں لطف اسی طرح سے کرے میہاں کا ظ

بگو لوں سے تھی دشتِ بخت میں امید مجنوں کی کہ اب لیلیٰ کا چہرہ بردہ محل سے نکلیگا
ہیں وہ لطفِ بزمِ یاد حاصل ہو کہ جیتے جی نہ محفلِ دل سے نکلیگی نہ دل محفل سے نکلیگا

ساتھ لایا نہ کر دغیر کو تم محفل میں درناک روز یہ جھگڑا سرِ محفل ہو گا

تری تصویر مری آنکھوں میں ہر دم پھرتی کچھ عجب لطف ترا درِ جدائی دیتا

دل میں رہ رہ کے یادِ مرگاں ہے بتلا ہم ہیں درِ پیہم میں
جب قلمِ الفت اُٹا یا شبِ معراج
محبوب کو خالق نے بلا یا شبِ معراج
قدسی یہی کہتے تھے، عجب شانِ خدا ہے
یہ کس کا قدمِ عرش پہ آیا شبِ معراج

مسدس کا ایک بند:

حضرت یوسف و یعقوب و یسح . مریم
نضر و الیاس تھے خوش ، خواہ آدم
ہود و ایوب تھے ، موسیٰ بھی تھے شاد و خرم
لوط و ابرہیم خوشی سے تھے بغلیں ہم
انبار سب ہی کہتے تھے خوشی سے پیہم
عرش پر آئینے محبوبِ خدا آج کی دشا

ہجوری، سید عبدالقیوم

ضلع ردتاس (بہار) کے تاریخی شہر سہرام کے رہنے والے تھے جسے شیر شاہ سوری کا مسقط الرأس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت کی اسناد کے مطابق وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد "مولوی" محمد ادا س (ف: ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء) ریلوے پولیس میں داد و غتہ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیرہ، سہرام میں ہوئی؛ ثانوی مدرسہ حنفیہ، آگرہ میں اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں کی۔ یہ مدرسہ شمس الہدیٰ کا تعلق ہی تھا جس کے باعث بعد کو شعر گوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص "ہجوری" کے ساتھ شمس کا اضافہ کیا؛ بلکہ بعض غزلوں میں تو انھوں نے "شمسی" بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف ادد کے مضمون میں امتحان دے کر بی اے کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسہ شمس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ضلع اسکول، گیا میں فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاٹو ضلع اسکول، ڈالٹن گینج میں تبادلہ ہو گیا؛ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزرا، اور یہیں سے اوائل ۱۹۶۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مشکل سے ہدینہ بھر گزرا ہو گا کہ حجم ۸ فروری ۱۹۶۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ قنارہ دم کا عارضہ پڑا تھا، لیکن موت حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوئی قیمت

کی ستم نظریفی دیکھیے کہ اسی دن پلامون نٹ رائج کینڈران کے اسرار میں "شبِ غزل" منانے والا تھا کہ بعد نماز جمعہ تین بجے سہ پہر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آناً فاناً جان بحق ہو گئے۔ "بجشنِ غزل" مجلس عزائیں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہزاری باغ اسکول کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ سامانِ بندھ چکا تھا، اور دو تین دن بعد روانگی طے تھی کہ سفرِ آخرت پیش آگیا۔ فاعبتروا یا اولیٰ الابصار۔ ڈالسن گینج کے قبرستان میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔ ان کے شاگرد مجیب نشر نے تماریح کہی :

حضرت ہجور رخصت ہو گئے مردِ کامل، صاحبِ فن، لغزگو
لوحِ دل پر کیوں نہ پھر شخص کے "شاعر شیریں سخن کا نام ہو"

(۱۹۷۴ء)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیما ب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) ساغر نظامی (ولادت: دسمبر ۱۹۵۰ء) اور آرزو بکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی ردائی رنگ کے خوش گلو ہونے کے باعث مشاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی زندگی سی میں ان کے شاگردوں نے "ہجرِ ہجور" کے نام سے ایک انجمنِ قایلیم کی تھی۔ یہ آج بھی حتی المقدور اردو کی خدمت کو رہی ہے۔ اس کی طرف سے ان کے شاگردوں کا تذکرہ "نقوشِ ہجو" (پٹنہ ۱۹۷۵ء) بھی چھپ چکا ہے۔

دو مجموعے: پردہ ساز (ڈالسن گینج ۱۹۶۶ء) اور ڈالے راڈ (گیا ۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ دو اور مجموعے (گلِ ائمہ و کلامِ ہجور) بھی مرتب تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی سہسرم میں ہوئی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے: ایک لڑکا (محمد مخدوم) اور بیٹی نہت جہاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔

پختہ کلام ہے مضمون آفرینی کی کوشش ہر ایک شعر سے ظاہر ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکی انداز کے سخنور ہیں، لیکن انھوں نے جدید رنگ سے اجتناب کیا؛ قدیم ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہر چند دیکھتا ہوں یہاں بام و در نہیں آگے چلے جنوں ہر اصحر ابھی گھر نہیں
خون دل، خون جگر، خونِ نظر، سب رہ گئے ہر بک رد، آگے، امیر کا رداں بنتا گیا
ہر آستان سے پہنچنے لگے جبیں کو پیام پھل گیا مرے سجدوں میں کس کا نام ابھی
یہ کیا جشن رہائی ہے، کیسی آزادی جانِ فکر و نظر ہیں کہ ہیں غلام ابھی
یہ کیا خبر تھی کہ دستِ وحشت لباسِ سستی پہ جا پڑ لگا

کچھ ایسے عالم میں ہوں کہ اکثر خیال آتا ہے پیر کا
کچھ غم نہیں مہجور! کہ اپنا نہیں کوئی معلوم ہے بیکس کا بہر حال خدا ہے
دہو جو عشق، تو ڈرے میں آدمی اٹ جائے جو ہو، تو وسعت کو نہیں میں سامنے سکے
پھیلا ہی تری جفا کا قحطہ بات آہی گئی مری و فسا کی
کہنے کو ہے ابتداء الفت اس میں بھی ترپ ہے انتہا کی
مہجور! دوا کا نام نکلا اللہ نے زندگی عطا کی
صبح نہ آیا، شام نہ آیا آج بھی کچھ پیغام نہ آیا
محبت آغازِ محبت پیشِ نظر انجام نہ آیا
سکوت، آغازِ جستجو کا؛ سکوت انجامِ گفتگو کا

حدودِ آدابِ بندگی میں سکوت اک ہے کہ حکمران

نہ وہ رشکِ طلعتِ چور ہے، نہ جوابِ بلوہِ طور ہے

مگر ایک بات ضرور ہے، کوئی بات اُس میں ضرور ہے

یہ خار بھی ہیں متاعِ بہارِ گل ہی نہیں نگاہ چاہیے اسرارِ گلستاں کے لیے
جھکا جھکا کے اسے اور پایاں نہ کر جہیں کو دفع بھی کر ایک آستان کے لیے

دہر دان رہِ تسلیم کی منزل ہے وہی آپ کے گھر سے چلے، آپ کے گھر تک پہنچے
اب شکایتیں بجا، گردشِ مسلسل کی اس زمین پر خود ہم نے آسماں بنائے ہیں
ترے رخ پہ رنگ چھڑکا مرے خونِ آرزو سے

مرے شانہ جنوں نے تیری زلف کو سنو ادا
ہر آئمانہ ہو، تو بندگی بھی ہو نہیں سکتی خدائی کرنے دا لے کر گئے، اہل بہر ہو کر
عہد کے مسخوں نے، وقت کے طپیوں سے زندگی کے ماروں کو موت کی دوا دی ہے
سوچ سمجھ کر، سیر چین کر پھول لگا دیتے ہیں نشیتر
پھر لیتا ہے ہاتھ میں ساغر! بھول گیا، تارا رخ کا پتھر؟

آپ کی بزم میں مستی و نغمہ ہی نہیں وہ بھی ہیں جو دُسنِ ددار سے ہو گزرتے ہیں
خوش نصیبانِ کرم تھے کہ ملی جا بے پناہ ہم بھی اک سایہ دیوار سے ہو گزرتے ہیں
ترے سکوت سے زندہ ہے حسنِ رمزِ کلام وہ سادہ دل ہیں کہ مرتے ہیں گفتگو کے لیے
اہلِ دل سے زندہ ہے، رسمِ ناصیہ سالی ورنہ کیا تعلق ہے ہمار کو آستانے سے!
شرابِ دانشِ حاضر کی سرستی ارے تو بہ! نظر تک روشنی پہنچی، دیوں تک ترگی آئی
کچھ تو اہلِ وحشت کا حوصلہ بڑھانا تھا تم کو اک تبسم سے بیچوں حجاب آتا ہے

انور، منوہر سہاے، ڈاکٹر

داغ کے مشہور شاگردوں میں "پروفیسر" نراین پرشاد ہرگودایا دی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ قوم کے سکینہ کا ستھ تھے، قومی لقب درما، تھا کسی زمانے میں یہاں دلی کے مضافات (اور شاہدرہ کے نواح) میں ایک مختصر گاؤں سٹھولی نام تھا، ان کا خاندان وہیں کا رہنے والا تھا، اسی لیے یہ لوگ "سٹھولے" کہلاتے تھے۔

خاندان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں ان کے بزرگ شاہی ملازم تھے۔ چنانچہ ان کے مورثا علی رائے پرآگ داس اکبر کے عہد میں دیوان ہوتات کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد شاہ کے عہد تک ملازمت کا یہ سلسلہ قائم رہا جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا، تو اس خاندان کا شیرازہ بھی بکھرا اور یہ لوگ تلاش معاش میں یوپی کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ جا کے سہسوان (ضلع بدایون) اور اکبر آباد میں بس گئے، کچھ سرکاراودھ اور حکومت انکرنری کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ ہر کے والد نشی کنھیالال بھی فکر روزگار میں سرگرداں تھے۔ ان کے خشنی چھپ لال بریلوی، اس وقت بدایون کی کلکری میں ملازم تھے۔ غدر کی افراقری شروع ہوئی، تو وہ اپنے مرشد پنڈت ہر ناتھ، نائب دیوان ریاست گوالیار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد کو ان کی وساطت سے وہاں مفتحت مالوہ میں نائب صوبہ کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔ نشی چھپ لال کے پائو جم گئے، تو انھوں نے اپنے داماد نشی کنھیالال کو بھی اپنے پاس بلایا، اور اپنے اثر سے انھیں ریاست گوالیار کے ضلع بس گڑھ (موجودہ مدھیہ پردیش) کی تحصیلداری دلوادی۔ اس کے بعد خاندان نے

یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ زائن پر شاد ۶۸۶۸ میں سبیل گڑھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے خاندان کی روایت کے مطابق ہر کی تعلیم بھی فارسی اور عربی سے شروع ہوئی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی کے تحت بریلی کالج سے دسویں درجہ کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بدقسمتی سے درہ شقیقہ کے مستقل عارضے کے باعث آگے تعلیم جاری رکھنے سے معذور رہے۔ لہذا انگریزی مڈل اسکول، گوالیار (پرائی آبادی) میں مدرسہ اختیار کر لی مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۲ء میں عارضی طور پر کمشنر دفتر مردم شماری، گوالیار کے نجی تعاون (پرنسپل اسٹنٹ) مقرر ہو گئے۔ یہاں کی خدمات کے جلد میں کچھ انعام بھی ملا تھا۔ اس دفتر سے فارغ ہوئے، تو ریاست کے سب سے مقدر اسکول، دکنوڑیہ کالج ہائی اسکول میں اونچے درجوں کے پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس اسکول میں ۱۹۳۵ء تک رہے۔ اس اثنا میں عارضی طور پر غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر احسن خان ثاقب کے انتقال پر انھیں دکنوڑیہ کالج، گوالیار میں انٹر اور بی، اے کے درجوں کو فارسی پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی باعث ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بالآخر ۱۹۳۵ء میں محکمہ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد زیادہ وقت اندر ہی مطالعے میں گزرا۔

مہر کو شاعری کا شوق ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ضیا امروہوی کی وساطت سے داغ کی شاعری اختیار کی، جو ان دنوں راجپور میں مقیم تھے۔ مہر کا دیوان (شعاع مہر) ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ (مطبع محمدی، بمبئی؛ ۱۹۳۷ء) اس کے علاوہ بعض اور کتب

بھی موجود ہیں! اور نمایان ہند۔ یہ انگریزی کتاب (Prophets of India) کا ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا؛ (۲) سفید جوگی، معاشرتی ناول ہے؛ (۳) انثر شریا! یہ چھ مضامین کا مجموعہ ہے؛ (۴) رہبر مضمون نگاری؛ درسی کتاب ہے۔ انھوں نے ایک کتاب "محاورات مہر" بھی مرتب کی تھی۔ اس میں اردو کے محاورات ردیف وار جمع کر کے ان پر بحث کی تھی۔ یہ ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکی تھی۔ نہ جانے، اس کا سہ

کیا ہوا!۔

ہرے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو بوقت صبح اچانک عارضہ قلب سے انتقال کیا۔ ان کے استاد بھائی نوح نادری نے تاریخ کہی:

نوح کے دل سے یہ نکلا سال فوت
لکھ: "غروبِ مہرِ زریں بارگاہ"

(۶۱۹۴۹ - ۶ - ۶۱۹۴۳)

داغ ہی کے ایک دوسرے شاگرد حب لال رعد کی تاریخ تھی:

شاعرِ خوش فکر دنیا سے گیا (۱۹۴۳)

منوہر سہاسی انور انھیں نراین پرشاد مہر کے خلفِ رشید تھے۔ یہ قبلِ گودھی میں یکم جنوری ۱۹۰۱ء بوقت صبح پیدا ہوئے۔ ان سے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ اولِ رام سرود اور رام دریا (۶۱۸۹۵ - ۶۱۹۷۰)؛ یہ نوح میں کپتان کے عہد سے تک پہنچے۔ شریک کے دلدادہ اور ماہرِ نشانہ باز تھے۔ ان کی عمر زیادہ حصہ آگرے میں بسر ہوا۔ دوسرے بھائی ان سرود، (۶۱۸۹۸ - ۶۱۹۷۱) کھٹو میں رہتے تھے۔ موسیقی سے بدرجہ غایت شغف تھا۔ ۱۹۲۶ء میں کھٹو میں بڑے پیمانے پر ایک موسیقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا تھا۔

منوہر سہاسی کا اصلی نام کھٹی گووند سرودپ تھا، جسے بعد کو ناخیال والوں نے تبدیل کر کے منوہر سہاسی کر دیا۔ یہ مشکل سات ماہ کے ہونگے کہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تربیت ناخیال میں ہوئی۔ یہ خاندان بھی علم و فضل اور جاہ و مرتبہ میں ممتاز تھا۔ یہ لوگ ریاست ٹونک کے جاگیردار تھے۔ ان کے بہن بھائیوں نے نرجس سہاسی (ف: ۷ - ۱۹۰۷) اور نانا دیوی (ف: ۱۹۱۶) دونوں قادی کے شاعر تھے۔ ان کے قادی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اردو کو حقیر زبان سمجھتے اور اس میں معمولی مراسلت تک کو اپنے دون مرتبہ خیال کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں ان کی تعلیم کس نہج پر ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خود بتایا کرتے تھے کہ حروفِ حجاب

سے بھی قبل مجھے یوسف زینجاے جامی کے ابتدائی تین صفحات زبانی حفظ کرا دیے گئے تھے جب حرف شناس ہو گئے، تو گلستان سعدی سے بسم اللہ ہوئی پھر بوستان اور دوسری ابتدائی اور درمیانی کتابیں اسی طرح گھر پر پڑھیں۔ مانا اور پرنا مانا کے استاد تھے پرنا مانا کی وفات کے بعد مانا نے اکیلے پوری توجہ اور دلسوزی سے نواسے کی تعلیم کی نگرانی جاری رکھی۔

۱۹۱۱ء میں انور باقاعدہ اسکول بھیجے گئے۔ ان کی استعداد کے پیش نظر براہ راست ساتویں درجے میں داخلہ ملا۔ اسکول میں اردو اور انگریزی پڑھتے، اور گھر پر فارسی بہر حال فارسی کا درس ۱۳-۱۴ برس کی عمر تک ہا۔ اس وقت تک انھوں نے فارسی کا بشیر کلاسیکی ادب ختم کر لیا تھا؛ اور اس سے مزید کی واقعا ضرورت بھی نہیں تھی خصوصاً جب کہ اس سے اسکول کی تعلیم میں بھی حرج ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ فارسی کی وسیع تفہیم بعد کے زمانے میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۱۲ء میں اسکول سے فارغ ہوئے، تو مانا نے اپنے اثر و رسوخ سے انھیں ریاست ٹونک کے محکمہ پولیس میں ملازمت دلوا دی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انھوں نے جوانی کی تنگ میں کسی موقع پر ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ اعتراض کر دیے۔ اس زمانے میں اسی باتیں اور وہ بھی دیسی ریاستوں میں بغاوت سے کم تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں بیک میٹری ددگوشت ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ اس اثنا میں (۱۹۱۶ء) میں مانا کا بھی انتقال ہو چکا تھا؛ جو ان کے حامی اور سرپرست تھے۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا ریاست ٹونک ان کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کر دے، یہ اپنے والد کے پاس گوا لیار چلے آئے۔ انور کی والدہ کے انتقال کے بعد مہرنے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خاتون بھی سہوان کی تھیں۔ ان سے مہر کے چار بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی (برندارانی) اور تین بیٹے: بدری پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۳ء) جگنا تھ پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۵ء) اور سدرج پرشاد سٹھوے پلیٹی افسر ضلع دتیا (ولادت: ۱۹۱۹ء) بیڈن بھائی بفضلہ زندہ موجود ہیں (۱۹۷۷ء)

انور کو یہاں گوالیار کا ماحول راس نہ آیا، اس لیے انھوں نے چنبرے بعد پھر خستہ سفر باندھا۔ اب کے لاہور پہنچے اور منشی محبوب عالم (دف: مئی ۱۹۳۲ء) کے مشہور پیسہ اخبار میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس زمانے کا لاہور صحیح معنوں میں اردو علم و ادب اور صحافت کا گہوارہ تھا۔ انور نے کسی کیا کہ یہاں کے علمی حلقوں میں برابری کی سطح پر باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے اشرف و رومی ہے کہ نہ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل کریں بلکہ یونیورسٹی کی سند حاصل کریں۔ فارسی کی بنیاد اور وہ بھی خاصی مضبوط پہلے سے موجود تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ ایم اے اور ایم اڈال کی سند حاصل کر لیں۔ وہ غالباً دہلی کے شاہجہاںپور سے اپنے مقالے (انگریزی) "سراج الدین علی خان آذر و جہات و تصانیف" پر پی ایچ ڈی کی سند ملی۔

دہلاہور کے مشاعروں میں شریک ہوتے، شہر کی گونا گون ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، اور مختلف اذقات میں بعض رسائل و جرائد کے دفین میں بھی کام کرتے رہے۔ چند ڈی اے، وی کانج، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس (لیکچرر) بھی رہے تھے۔ اس طرح جہاں ان کا حلقہ احباب وسیع ہوتا چلا گیا۔ وہیں وہ کبھی ایسے اصحاب اثر و رسوخ سے بھی متعارف ہو گئے جو ان کے اردو اور فارسی کے فاضل کی حیثیت سے معترف تھے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ لاہور میں جہاں اس وقت ان دو ذی زبانوں کے عالموں اور استادوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میاں سرفضل حسین (دف: جولائی ۱۹۳۶ء) نے انھیں اپنے بیٹے میاں عظیم حسین (آئی، سی، ایس) کو اردو اور چودھری شہاب الدین نے اپنے بیٹے میاں ممتاز محمد خان دکنانہ کو فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا، یہ دونوں اس وقت بی اے کے طالب علم تھے۔

۱۹۲۵ء میں سرکنڈریات خان کے مشورے سے انھوں نے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی۔ اس زمانے میں شہاب الدین پنجاب کی مجلس دارالافتاء دہلی کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے لاہور صاحب کو مجلس میں مترجم مقرر کر دیا۔ تقریباً ایک سال تک وہ اسی جگہ

کام کرتے رہے، اور ۲۱ سالہ ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں سپرنٹنڈنٹ شہر کے عہدے سے منشی
پرسبکدوش ہوئے۔ اپنی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی
کیمپ کالج، نئی دہلی میں شعبہ اردو، فارسی، عربی کے صدر بن گئے۔

صحت طرت سے خراب چلی آ رہی تھی، فضا دیم (ہائی بلڈ پریشر) کی شکایت تھی۔ مارچ
۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ بارے دوادوش سے حالت کچھ سدھ گئی، جنوری
۱۹۷۴ء میں دوسری مرتبہ بیمار ہوئے۔ ایک پھر چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد کچھ فاقہ
ہو گیا اور وہ مکان پر آ گئے۔ یہیں ۱۵ فروری کو طبیعت یکایک پھڑپھڑا ہو گئی اور وہ
بعد ۱۷ فروری ۱۹۷۴ء دوپہر کے وقت روحِ قدسِ عنصری سے پردا ذکر نہی، ہی شام
پونے نو بجے جب خاکِ نذرِ آتش کو دیا گیا۔

ان کی پہلی شادی ٹونک کے شری زندگی لال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون ایک لڑکی
اپنی یادگار چھوڑ کر ۳ مئی ۱۹۲۲ء کو رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد دوسری شادی مارچ
۱۹۳۱ء میں منشی برج دھن لال کی صاحبزادی شری جاند رانی سے ہوئی۔ منشی صاحب
موصوف میں پوری کے رہنے والے اور ریاست جنید میں تحصیلدار تھے، اور ان دنوں سنگر
میں تعینات تھے۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ پانچ بچے ہوئے، چار بیٹے اور ایک بیٹی۔
بفضلہ وہ خود بھی موجود ہیں اور سب اولاد بھی خوش و خرم ہے (۱۹۷۷ء)
انہوں نے شرگوئی بہت کم عمری میں شروع کی۔ اپنے گوردیش کے تقاضے سے ان کا سب
سے پہلا شعر فارسی میں تھا:

چیز نہ حدیث تو بقرآن نفردم

کفرے کہ راست، بائیاں نفردم

پھر اسی زمانے میں اردو میں بھی کہنے لگے، تو کہا:

جواب نامہ نکھا دوستے، لیکن خفا ہو کر

نوید زندگی آئی ہے پیغامِ قضا ہو کر

ان کے نام کو معلوم ہوا۔ تو فرمایا کہ فارسی کلام میں خود دیکھو ٹکا، لیکن اردو کلام اصلاً

کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیج دو۔ مرحوم کہتے تھے کہ حالی نے مشکل دو تین غزلیں دیکھی
 تھیں۔ پھر لکھا کہ "مقدمہ شعر و شاعری" کو بغیر بار بار پڑھئے، اس سے مذاق سخن بھی
 درست ہوگا اور زبان و بیان کے حسن و قبح کی تمیز بھی پیدا ہوگی۔ افسوس کہ مجموعہ کلام
 ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ یوں بھی تقسیم ہکت تک کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔
 یہ دہیں لاہور میں رہ گیا تھا۔ بعد کے کلام میں سے ابھی چار شعر کا انتخاب کیا تھا اور
 اس کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ موت کا بلاوا اٹھ گیا۔

انہوں نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی لیے تھے؛ یہ البتہ چھپ چکے ہیں بعض
 رسائل میں شائع شدہ کچھ غزلوں سے چند شعر نمونہ کلام کے طور پر درج کر رہا ہوں۔
 ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر دل سے نہیں دماغ سے کہہ رہے ہیں۔
 وہ کہتے ہیں: کسی پر مر کے جتیا کیوں رہے کوئی

سمجھنے کے لیے اتنا اشارہ کم نہیں ہوتا
 نہ کر کچھ کو طاعت، کوئی اپنے آپ، اے ناچ

گرفتار کند زلفِ خم در خم نہیں ہوتا
 بارِ جادو اگر اسے عبتِ منسوب ہے شورش

جنونِ شورشِ ساماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

وہ آئینے، نہیں آئے، خط آئیگا، نہیں آئے	غلط نکل رہی تعبیر خواب آؤں سے آخر تک
بہت سی سکون نا آشنائی کم نہیں ہوتی	دی رہتا ہے جوشِ اضطرابِ دل سے آخر تک
یادش بخیر، زاہدِ مرتاض کے لیے	پندار کی شکست کا ساماں ہے آج کل
گو کفر ہے پرستشِ خود بان خود پرست	لیکن یہاں تو کفر ہی ایسا ہے آج کل
اور ان عیشِ دگر دیش ساغر، خوش نصیب	سب را دگر دیشِ دوراں ہے آج کل
ردایا نادر داء، ہوتا ہی کیا ہے!	وہ جو چاہیں، کریں، بجا ہی کیا ہے!
جھکڑے میں بھی ہے اک لطف، دراز	ہمارا آپ کا جھکڑا ہی کیا ہے!

غصہ امردز ہی میں عمر گزری
وہ تنہا دیتے ہیں، میری بات سن کر
"ہنٹ" ہے سرسری سی اک نظر بھی
دو عالم کے مزے، ہیں میلہ سے میں
مرے امردز کا فردا ہی کیا ہے
نہ ہو یہ بات، تو رونا ہی کیا ہے
یہ تھوڑا سا گرم "تھوڑا" ہی کیا ہے
یہاں حنٹ بھی ہے، دنیا ہی کیا ہے

کرم ان کا امید افزا نہیں ہے
ہمارے پاس جب جوتے نہیں وہ
ادھر بھی کچھ نہ کچھ، ہے بیقراری
کبھی ہوتا، کبھی ہوتا نہیں ہے
کوئی ان کے سوا ہوتا نہیں ہے
مگر کچھ اس طرح، گویا نہیں ہے

لگتا نہیں نگاہ لانے سے دُور مجھے
در تک ہزار بار اک اُمید سے گئی
لے دو ستوا! تمھاری عنایت کا شکریہ
دم بھر کو میری گردنِ تقدیر اک گئی
اس رشک ہر دماہ کی رخصت کے بعد بھی
میں خود کو رازِ دہرے کیوں بخیر نہیں!
افو! اگرچہ عشقِ بیت کی نیاہ کی
لگ جائے، اے خدا! بتوں کی نظر مجھے
گھر ہی میں پیش آگئے کتنے سفر مجھے
کب تھے نصیبِ رنج و الم، اس قدر مجھے
جب اک گئے وہ خاکِ سردِ کچھ کر مجھے
لگتا ہے اس کے نور سے معمور گھر مجھے
کیا کم ہے یہ خبر کہ نہیں کچھ خبر تھے
پھر بھی بنا ہونے کا نہ آیا ہنر مجھے

کس موڑ سے گزرا ہوا تھا انھیں خیال
خوش فہم کر دیا تری الفت اس قدر
مڑ مڑ کے دیکھتے تھے سرِ بگڑ مجھے
آرام کا گمان ہے آزار پر مجھے

اظہر احمد الدین (اے، ڈی اظہر)

سیالکوٹ (پاکستان) کے تاریخی شہر سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ڈگر احمد نام۔ یہاں زمانہ قدیم سے لہاروں کے بہت خاندان آباد ہیں (یا کم از کم۔) برس اُدھر تک تھے، اسی لیے بعض اوقات اسے کوٹلی لہاراں بھی کہتے ہیں! ۱۹۰۰ میں اس گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سہمی تعلیم سے بہرہ ور نہیں تھے۔ لیکن آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بالکل اُن پڑھ آدمی بھی علماء و فضلاء کی صحبت میں رہتے رہتے نہ صرف خود علمی اور دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں زیادہ علم حاصل کرنے کی اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم دلانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔

احمد الدین کی تعلیم کا آغاز لٹکائی مسجد سے ہوا کیونکہ یہاں کوئی مکتب نہ تھا، نہ اسکول۔ مسجد میں بھلا تعلیم کیا ہوتی! پیش امام صاحب نے نماز یاد کرا دی۔ وضو اور طہارت کی کچھ ابتدائی باتیں بتا دیں۔ اور پھر ناظرہ قرآن پڑھانے لگے۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اردو کے اتنے حرف شناس ہو گئے کہ جلد سی اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی پنجابی زبان کے منظوم قصے اور سی حرفیاں ردائی سے پڑھنے لگے۔ ان کے والد نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ ڈگر احمد سے چند کوس دور ایک دوسرے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری مدرسہ تھا، انھوں نے احمد الدین کو وہاں بھیج دیا۔ یہ اپنی بستی کے پہلے طالب علم تھے، جو کسی مدرسے میں داخل ہوئے! احمد الدین بہتر اصحاب نے ان کا نام "احمد الدین" لکھا ہے، ٹھیک اور پورا نام "احمد الدین" تھا۔

نے برائمری کے چاروں درجے تو مکمل کر لیے، لیکن اس کے بعد خدا معلوم کیا آفتاد
 پڑی کہ بھاگ نکلے۔ ڈیرہ دو سال تک گاؤ گاؤ چوہاڑوں میں قصے سناتے اور مہر پڑھتے
 پھرے یا پھر اپنے مجمعوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہے۔ ان کے والدوں
 سوس کر رہ جاتے کہ بیٹا کس راہ پر چل نکلا ہے۔ لیکن آدمی تھے بردبار اور سمجھدار
 انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی جگہ نفسیاتی علاج کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مرتبہ ان کا
 کسی کام سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ واپسی پر بیٹے کے لیے گلستان سعدی اور عربی کی
 کتابیں صرف اور کتاب انٹو کا ایک ایک نسخہ لیتے آئے۔ احمد الدین بھانپ گئے
 کہ والد کی کیا تمنا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں مجتہد گئے، اور دم اس
 وقت لیا، جب مرے کانچ، سیالکوٹ سے بی اے کی سند لے لی۔

اسکول اور کانچ میں ریاضی اور عربی ان کے خاص مضمون تھے۔ تعلیمی مشاغل کے علاوہ
 رونا بھر دینا اور اپنے احباب کے جھگڑوں میں ان کے لیے ہر موقع پر سینہ سپر ہو جانا
 ان کا طرہ اختیار تھا۔ اسی لیے اپنے بتکلف دوستوں کے حلقے میں وہ "جریل" کے لقب
 سے مشہور تھے (اور اس عرف سے وہ آخر تک پکارے گئے)۔

مرے کانچ، سیالکوٹ کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے شمس العلماء مولانا سید میر حسن (جو
 (ف: ستمبر ۱۹۲۹ء) سے بھی استفادہ کیا تھا، جن کا نام علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)
 کی سوانح عمری میں بہت نمایاں ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اڈالا چندے تدریس کا مشغلہ رہا۔ چونکہ ریاضی اور حساب کتاب سے
 شغف تھا، اس لیے انڈین آؤٹ اینڈا کاؤنٹ سر دس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھے اور
 کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سرے پہلا تقریر راولپنڈی کے ملٹری اکاؤنٹنس کے دفتر
 میں ہوا۔ راولپنڈی کے زمانہ اقامت کا ایک لطیفہ قابل ذکر ہے:

شہر میں مسلمانوں کا خاصا بڑا جلسہ منعقد ہوا، جس میں تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل پر
 مختلف اصحاب نے تقریریں کیں۔ جلسے کی صدارت اپنی جوان عمری کے باوجود، اظہر صاحب
 کے حصے میں آئی۔ ایک پرانی وضع کے مقرر کی جو شامت آئی، انھوں نے اپنی تقریر

میں مختلف جماعتوں کی تعلیمی اور محیسی پر اعتراض کرنا شروع کر دیے اور چونکہ خود عربی کے عالم تھے، جہاں تہاں اپنی علمیت کا سنگہ جانے کے لیے عربی کے حلقے اور اقتباس بھی تفسیل کرتے گئے۔ اظہر مقررہ کے لیے اور خاص ارفعاء کی تنک سے سخت منغض ہوئے۔ جب جلسے کے اختتام پر وہ صدارتی تقریر کرتے کواٹھے تو انھوں نے موصوف کو آڈے ہاتھوں لیا اور ان کی عربی دانی کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھوں نے جو عربی فقرے کہے تھے یا اقتباس سنائے تھے، ان میں صرف دتو کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ اگر دوسروں نے ملی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے، تو آپ نے جو تعلیم پائی ہے، اسی میں کونا سرخاب کا پیر حاصل کر لیا۔

اس کے بعد تو شہر میں اظہر کی دھاک بیٹھ گئی۔ جدھر ٹکڑے ناگلیاں اٹھیں کہ دیکھو یہ انگریز لباس میں، سوٹ بوٹ پہنے افسر، عربی کا اتنا بڑا عالم ہے کہ اس نے فلاں مولوی کی تقریر کی ہر ہر جملہ غلطیاں نکالیں۔

رادلینڈی سے تبدیلی ہوئی، اور یہ حکومت مند کے سپلائی اور ریلوے کے محکموں میں ڈپٹی فنانسئل میشر کے عہدے پر مقرر ہو کر دئی آگئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں المضاعف ہو گئیں۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو یہ آسٹریلیا میں ہندستان کے ٹریڈ کسٹمر رنڈوب تجارتی کی حیثیت سے سڈنی میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو پیش کر دیں، اور وہیں اس ملک کے پہلے رنڈوب تجارتی بنادیے گئے وہاں سے ۱۹۴۶ء میں وطن واپس آئے۔ چھپے مشرتی پاکستان میں تعینات ہوئے، قیام چاٹلگام میں رہا۔ تین سال بعد وسط ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب میں سکڑمال اور پھر مرسر حکومت پاکستان میں جائنٹ سکڑ مقرر ہوئے۔ سبک آخرم ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے سفارتخانہ لندن میں میشر مالیات و وزیر اقتصادیات مقرر ہو کر لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۸ء میں کراچی آئے اور جلد بعد ہی یہاں ملازمت سے پیش پر سکد ویش ہو گئے۔ اس کے بعد کراچی کی ایک تجارتی فرم ڈین اینڈ دیبر کے مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے۔

بچپن کا ابتدائی زمانہ چھوڑ کر صحت ہمیشہ قابل رشک حد تک اچھی رہی۔ لیکن زندگی کی بے اعتدالیوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ عارفِ قلب کا پہلا حملہ مئی ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بارے علاج معالجے سے بچ نہ سکے۔ لیکن دل کی بیماری ایسی ہے کہ اگر اس میں پوری احتیاط نہ کی جائے، تو یہ بد بخت کام تمام ہی کر کے پھیا چھوڑتی ہے۔ اپنی فطری لذتِ آوارگی اور لاابالیاہ پن کے طفیل، اظہر سے یہ احتیاط ہونے لگی اور بالآخر اسی میں ۱۴ فروری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں جان بحق ہو گئے۔ کراچی کے فوجیوں کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔

اپنی عربی فارسی کی تعلیم کی بدولت مڈ توں ان کا رجحان تحقیق کی طرف رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے بعض بلند پایہ علمی مضامین قلمبند کیے، جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں جمع کر دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا مزاج رومان پرور اور شاعرانہ تھا۔ رہی سہی کسر ان کی عیشِ کوشی اور تن پروری نے پوری کر دی۔ ان کے کلام میں ان کے تعلقاتِ حسن و عشق کی بعض تلمیحات موجود ہیں، جن سے واقفانِ حال بخیر نہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "لذتِ آوارگی" ان کی زندگی میں پھیا تھا (لاہور ۱۹۶۱ء) اس میں سب اصنافِ سخن کا کلام موجود ہے۔ اس کے بعد کا کلام بھی چھپ جانا چاہیے، تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

عربی فارسی کے بعد ان کا دوسرا موضوع مطالعہِ مذہبیات تھا، اور اس میں بھی اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ عیسائیت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے عقائد سے لے کر مشنریوں کی تبشیری سرگرمیوں اور دسیسہ کاریوں تک اس کی تاریخ کا کوئی گوشہ ان سے غفی نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اہل اسلام کو ان کے ہم رنگ زمینِ اجم کی موجودگی اور اس کے دور رس نتائج سے خبردار کر دیں۔ اسی مقصد سے انھوں نے

انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی: Christianity in History

خدا معلوم، وہ اسے مکمل کر سکے یا نہیں؟ اور اس کا مسودہ کہاں ہے؟ بڑے کام کی چیز تھی!

نمودہ کے چند شعر دیکھیے :

اک تری بے رخی سے ، دوست ! کتنے چراغ بجھ گئے
 پھول میں رنگ نہ کہاں ! چاند میں چاندنی کہاں !
 حسن کی ساکھ عارض و زلف ہی سے یہاں نہیں
 لاکھ حسیں جہاں میں ہوں ، تیری سی دہری کہاں !
 تم نے تو جیسے عمر ہی ہجر کی شب میں ڈھال دی
 میری کبھی سنی کہاں ! اپنی کبھی کہی کہاں !

چھوڑے جاتے ہو جسے دیرانہ پھر اسی دل میں بسائینگے تمہیں
 کاش ! وہ بھی تو کہیں مجھ سے کبھی دوسٹھا جاؤ ، تو سنائینگے تمہیں

مری عاشقی سہی بے اثر ، تری دہری نے بھی کیا کیا
 وہی میں رہا ، وہی بیدلی ، وہی رنگ یلہ ہمارے
 نہیں خوب کچھ ، نہیں زشت کچھ ، نہ نگاہ و دل کے گم
 کبھی ہے چین کا چین خزاں ، کبھی ایک گل ہی ہمارے
 ہے محبت بھی عجب کھیل کہ اس بازی میں
 لطف سے ہے کبھی لذت ، کبھی دشنام سے ہے
 راہ الفت میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
 کہ جہاں کام نہ آغاز ، نہ انجام سے ہے
 میں رہ عشق میں پہنچا ہوں وہاں اب کہ جہاں
 حاجت راز خود اپنے دل کا کام سے ہے

تھا جس پہ ناز کبھی اب وہ آرزو نہ رہی نیاز عشق کی پہلی سی آرزو نہ رہی
 تو ایک بار تو آ ، دن پھر میں تمنا کے اگرچہ اب وہ تمنا کی آرزو نہ رہی
 نشیمن اپنا ہے پھر برق و باد سے سرشار نہی ہوا کبھی کیا سا ناز کا گزرا ہی ہے
 میں اپنے دعویٰ الفت سے آج باز آیا گزرا کئی ہے ، مگر شرما دگر رہا ہے

وہ کہتے ہیں: اگر تجھ کو جفا راحت نہیں ہوتی
 تو الفت چھوڑ دے، اس رنگ سے الفت نہیں ہوتی
 اک ایسا بھی مقام آتا ہے راہِ عشق میں نظر
 جہاں انجامِ بیہوشی کے لیے فرصت نہیں ہوتی
 اس سے تو ہمیں انکار نہیں، دنیا کی ساکھ کرم سے ہے
 لیکن اس ایسی دنیا میں خود ساکھ کرم کی تسم سے ہے
 تم حسن میں لاشمالی ہو، تو کیا؛ سب سے ہے خنکِ عشق نہیں
 جس حسن کی شان دکھاتے ہو، اس حسن کی آن تو ہم سے ہے
 جب اس ہی ٹوٹ گئی اپنی، پھر کون کریگا شکوے لگے!
 اس کھیل کا سارا لطف ترے اک لطفِ دکر کے کھرم سے
 ہم دل کی بات سناتے ہیں، تم دنیا ہمیں جھڑپاتے ہو
 تم دنیا دالے کیا جانو، یہ دنیا دل کے دم سے ہے
 اک عالم جب ہم دیکھ آئے، تب جا کے ہمیں معلوم ہوا
 سب رونق اپنے دم سے ہے، عالم کا عالم ہم سے ہے
 ہم جن پر ہر دم مرتے ہیں وہ ہم کو دیکھ کے درتے ہیں
 ہے یہ ظہی پیادہ کی صورت، اس حسن کی شان ہی کرم سے
 تقدیر محبتِ غم ہی سہی تسلیم ہمیں، لیکن، اظہر
 اس غم پر سزا جوشی قربان، یہ غم ہے، تو سب کچھ غم سے ہے

اظہر کو سنجیدہ مزاح پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی
 طبعی سنگدلی اور جدت پسندی اور بذلہ سنجی کے پورے جوہر ان کے فکاہی کلام ہی میں
 کھلتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں کسی منطوبات اس دوسری قبیل کی بھی ملتی ہیں۔ بنوئے
 کے طور پر ایک نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے: ایک دہیر کی دوسری شادی پر۔ اس
 میں انشا کی مشہور غزل کا نتیجہ کیا گیا ہے۔

کراچی میں کمر باندھے ہوئے سب یاد بیٹھے ہیں
 جو بیٹھے جا چکے اک بار، پھر تیار بیٹھے ہیں
 جسے دیکھو، وہی ہے دوسری بیوی کے چکر میں
 غنیمت ہے، مگر جو یہاں دو جا رہے ہیں
 نہ چھڑاے شیخ! ہم اپنی بھلی چلا رہے ہیں
 تجھے تو بیاں سو بھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
 نہ کریں چار جبک شیخ جی کیوں مل گئے لینے
 وہ دکر کے بھی کہتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں
 کہاں اب چین گھر کا، حبیبی بیوی دوسری آئی
 "نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار، بیٹھے ہیں"
 بلائے ناگہانی ہے، ہوائے زورہ شانی
 جو بیوی جیت کر اٹھے، وزارت ہار بیٹھے ہیں
 بھلا آپو کی لاٹھی چین دیتی ہے کسے؟ اظہر!
 سبھی شوہر یہاں بھینسیں بنے، لاچار بیٹھے ہیں

(All Pakistan Women's Association)
 APWA ملک میں عورتوں کی سب سے بڑی انجمن کسی زمانے میں اس کا بڑا زور
 تھا

ساگر نگو دری، بلونت کمار

پنجاب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر قصبہ نگو در ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔
۱۹۱۲ء میں ولادت ۲۲ دسمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ ان کے والد سادو زل نچو در منڈی میں چھڑا موٹا
کام کرتے تھے۔ چونکہ گھر کے حالات تسلی بخش نہیں تھے، اس لیے بلونت کمار کی تعلیم
خاطر خواہ نہ ہو سکی؛ بمشکل پرائمری کے درجے پورے کر سکے۔

ہوش سنبھالا تو کسی نہ کسی طرح گھری سادی کا کام سیکھ لیا اور اسی کو بسر و قات کا
ذریعہ بنایا۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ جب ۱۹۳۰ء میں جہاتا گا ندھی
نے نمک ستیہ گڑ شروع کیا، تو یہ بھی میدان میں کود پڑے، پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔
یہ تجربہ بعد کو بھی دو ایک مرتبہ ہوا۔

جیل خانے کے زمانے میں انھیں وہاں کے کتابخانے سے استفادے کا موقع ملا، جس
سے استعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب انھیں شعر گوئی کا شوق چرایا۔ رہا ہوئے
تو اپنے پڑوس میں روشن لال روشن نگو دری کی خدمت میں جانے لگے۔ ان سے شوق
کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شعر کے حسن و قبح کی تمیز ہونے لگی۔ اس پر روشن نے انھیں
اپنے استاد حضرت جوش ملیح آبادی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) کے حوالے کر دیا؛ یہ ۱۹۳۷ء
کی بات ہے۔ جوش صاحب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے پھر
کوئی اور در نہیں دیکھا اور آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھیں
جوش صاحب کے طویل استفادے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ جوش صاحب کے
دو شوق اور تھے: حق اور شہر سنج۔ ساگر جب ان کی خدمت میں ہوتے، تو حق تازہ

کرنے کی خدمت اکثر ان کے حصے میں آتی۔ خود ایک شعر میں کہا ہے۔

مری آتش بیانی کیوں نہ پائے داد اے ساگر!

بھری ہیں میں نے چلیں جوش سے کال سخن دار کی

۲۵ فروری ۱۹۷۳ء کو خلق کے کینسر سے جان بحق ہوئے۔ اولاد جسمانی سے کوئی نام نہ نہ
اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔

اردو ادب ہندی دونوں زبانوں میں معتد بہ کلام موجود ہے۔ حرامے اور افسانے بھی
لکھے، ہندی میں رامین ڈراما کی شکل میں "نرلیلا" کے نام سے لکھی تھی، شکنتلا ناناک
بھی ہندی میں ہے۔ ایک سوشل ڈراما "سودا" نام کا بھی موجود ہے۔ افسوس کہ حالات
کی ناسازگاری کے باعث ان کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اردو کلام کا
انتخاب "مد و جزر" کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا (مکمل دور ۱۹۷۴ء)۔
کلام بے عیب ہے جس کی حضرت جوش ملیح آبادی کے کسی شاگرد سے توقع ہو سکتی ہے، لیکن
اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دنیا میں خوشی سے وہ بشر رہ نہیں سکتا دنیا کے جو آزار دستم بہ نہیں سکتا

جس کو نہیں کوئی بھی غم، اس کے ہے غم مرگ آرام سے دنیا میں کوئی وہ نہیں سکتا

مجھ کو سمجھانے سے باز آتا نہیں کیوں کوئی ناصح کو سمجھاتا نہیں

زندہ سے کیا نسبت، اے ناصح کچھ وہ بہک جاتا ہے، بہکاتا نہیں

کس سے پوچھیں حال بارانِ غم جو دہاں جاتا ہے، وہ آتا نہیں

اب مصیبت سے غم ہے، نہ ہے مشکل کوئی موت نے آ کے دیا خوب سہارا مجھ کو

چاند سا ذہل مضطرب ہے، اے ناصح! کس طرح ترک محبت ہو گوارا مجھ کو

خرد بھکی تو بھکی ہی رہی راہِ محبت میں مگر دیوانگی بھکی، تو وہ منزل پہ جاں

محبت باعثِ آرام جاں معلوم ہوتی تھی مگر اب غٹ آزار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھ

ذوقِ نظر جس ہے، تو سب کچھ جلیں ہے جب یہ نہیں، تو کوئی بھی صورتِ حسیں نہیں

جینا ترے بغیر، تو مزارِ ترے حضور
 آسان بھی نہیں مجھے دُشوار بھی نہیں
 اُس پر جو محبت میں اگر جذبہٴ کامل
 لہرِ درد کو غمِ دودی منزلِ نہیں ہوتا
 یہ آرزو تھی کہ ہم شرحِ آرزو کرتے
 زبانِ نہ چلتی، تو آنکھوں سے گفتگو کرتے
 ہمیں تو مل نہ سکی موت بھی محبت میں
 حیات کے لیے کیا خاکِ آرزو کرتے
 اس سے بھی آگے ہے کچھ منزلِ جبینِ شوق کی

کعبہ ہی کافی نہیں ہے سر جھکانے کے لیے
 داغِ لالہ، خونِ بلبل، رنگِ گل، نورِ شفق

سرخیاں اتنی ہیں اک دل کے فیلنے کے لیے
 مٹ رہے، مے ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے
 ایسے میں آئیگا زوہ جانِ بہار کیا
 یہ کم ہے کیا کہ ان سے ملاقات ہو گئی
 لے دل! وہ بات کرتے ہر رنگِ زار کیا
 ہے تمنا ہی پر موقوف مدارِ ہستی
 یہ جو مرجائے، تو انسان بھی مرجاتا ہے
 کچھ مستیِ شباب ہے، کچھ نشہٴ شراب
 نعرہ ہے ان کے پاؤں میں، سکنتِ زبان میں
 میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے چمن، تیرے بغیر

ہر گھلِ ترے مجھے کاٹا سا نظر آتا ہے
 کیا لکھا ہے مری قسمت میں، خدا خیر کرے

چہرہٴ اُتار اٹھا اقصا کا نظر آتا ہے
 آپ کرتے ہیں جو منہ پھیر کے اقرارِ وفا
 اس میں بھی صورتِ انکا نظر آتی ہے
 موت کے ایک ہی جھونکے سے یہ گرجا بیگی

زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے
 چوٹیں بھی سو طرح کی کھاتا ہے دل
 صدے بھی شبِ غم کے اٹھاتا ہڈل
 لیکن شیشے سے بھی وہ ناز کرتا ہے
 اک ٹھیس لگے، تو ٹوٹ جاتا ہے دل
 حالِ وافی کی، اور مستقبل کی
 رہتی ہے خبر اسے ہر اک منزل کی

دنیا کے خیالات کا مرکز دل ہے دنیا سے مگر جدا ہے دنیا دل کی
 آجائگی جس وقت اجل کیا ہوگا! اس خدشہ بھل کا حل کیا ہوگا!
 تو آج کی رات کو تو غم میں نہ بدل ناداں! کسے معلوم ہے کل کیا ہوگا!
 جب غنچہ سرشاخ چٹک جاتا ہے کاشا سا محبت کا کھٹک جاتا ہے
 جو دل پہ گزرتی ہے، نہ پوچھو! ساگر! منہ پر سردار لٹک جاتا ہے
 بدنام کی صحبت کا ہے انجام برا چوری سے بھی چوری کا ہے انجام برا
 یہ قول بھی کیا خوب، داناؤں کا فرماتے ہیں: بد اچھا ہے بدنام برا

محمود احمد عباسی، امر و موی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطہ خلیفہ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلف ہارون رشید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبد المطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹ - ۸۱۲ء) حضرت عباسؓ سے نوں پشت میں تھے جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ النبی عباس مستعصم ہاشمی کو تہ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان و ناموس بچانے کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انھیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندوستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیش نظر انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، اور شاہان شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آلہ ام و آسائش سے دلی میں مقیم رہا تھا کہ آٹھویں قہر خدایندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین بیان سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رحمن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودی کے عہد میں پنجاب سے نقل مکان کر کے امر دہ آئے۔ عباسیان امر دہ انھیں مولانا رحمن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رحمن الدین کی نوں پشت میں مولانا سید احمد علی شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت بزرگ تھے، شہر دہ سے خاندانی جاہ و شہرت سے کناادکشی

اور یاد اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانچھوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعہ کتب دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادت الہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امر وہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عباسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حکومت انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثناء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امر وہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جوار حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کے نام لکھنؤ طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابل ذکر ہیں: سب سے بڑے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تضمین کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، انھیں سید علی محمد عباسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ وہ ۲۰ رمضان ۱۳۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۴ء) کو امر وہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بعارضہ تپ دق ۲۷ جون کو فتح آباد ضلع (اگرہ) میں انتقال ہوا، اور وہیں احاطہ عید گاہ میں دفن ہوئے (خزانہ احادیث (۳) میں دونوں تاریخیں غلط ہیں)۔ ان کی شہزادی "لحسن داؤدی" محمد احمد عباسی نے شائع کی تھی۔ محمد داؤد کے چھوٹے بھائی حکیم فرید احمد عباسی کا اپنے عہد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ تینوں طبیبہ کالج، دہلی کے پرنسپل بھی رہے۔

سید علی محمد عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدیقی کی صاحبزادی (صغیر النساء)

تھیں۔ ان بگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے۔ محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے، یہ گویا محمد داؤد عباسی نذکرہ الصدر کے علائقی بھائی تھے۔ وہ منگل کے دن ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ (۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ۱۵۰ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آگئے، جو ان کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ ۱۵۰ انھیں ادلیا اللہ کے واقعات سناتے، اگر کسی درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے، تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ اور سیرت ادلیا اور تصوف کا شوق پیدا ہوا، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رخ متعین ہو گیا۔

تعلیم کا زمانہ آیا تو امرہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ اپنے دوسرے علائقی بھائی ڈاکٹر محمد حسن عباسی کے پاس آناؤ اور رائے بریلی میں رہنے لگے، وہاں میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ کالج میں بھیج دیے گئے۔ وہاں یہ کالج اقامت گاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور وہی ان کی تعلیم سے بے توجہی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب ذقادر اللہ مولوی مشتاق حسین امرہ ہویان کے والد کے دوست تھے۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی نگرانی اور تعلیمی رہنمائی پر مقرر کر دیا تھا، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لائے۔ غرض محمود احمد عباسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی، لیکن ان نگران صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدد اداہوں اور اکابر سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں شبلی اور شہر بھی تھے، تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آرائی اور ہنگامہ پردہ کا چسکا پڑ جائے، تو تعلیم کے لیے اس سے زیادہ ہلکا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

مولانا شبلی اور شہر کے زیر اثران کا زیادہ وقت تاریخ و سیر کی کتابوں اور سیاسی اور قومی لٹریچر، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا، اور وہ نصاب کی طرف

بے پردا ہو گئے۔ چنانچہ امتحان میں بار بار ناکام رہے، اور سیاسیات میں روز بروز زیادہ
مخوڑ سنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعہ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ
بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے
جب مولانا حالی اپنے مرگی کے مریض نواسے عبدالولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔
جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں، شبلی اور شرر نے محمود احمد عباسی کی حوصلہ افزائی
کی تھی، اسی طرح حالی بھی ان کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے
لطف و عنایت پیش آئے۔ عباسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کا مضون
نگاری کا شوق دراصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا مرہون منت تھا۔ یوں رسمی تعلیم
کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ تلافی ہو گئی۔

حالی ان سے بہت شفقت سے پیش آئے رہے۔ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی
تھا (جیسا کہ مکتوبات حالی میں شائع شدہ خطوط سے ظاہر ہے) آخر کار انھیں کی
سفارش پر عباسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علیگر
کے دفتر میں بطور نجی معاون (پرنسپل اسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عباسی صاحب
یہاں ۱۲ برس رہے۔ ان میں سے تقریباً دس برس انھوں نے صاحبزادہ آفتاب
احمد خان جاسٹ سیکرٹری (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) کے ماتحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت
نوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انھوں نے عباسی صاحب کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر
ادبی معاون اور پھر صدر دفتر کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ جب تک وہ ستمبر ۱۹۹۱ء
میں وزیر منہ کی کونسل کے رکن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غل و
غش یہاں کام کرتے رہے۔ اور اس زمانے کے تمام اصحاب مجاذ نے بھی ان کے
کام کی تحسین کی (صدر یار جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمن خان شروانی (ف: ۱۹۸۱ء)
(۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظام دکن کی خواہش پر صدر القدر اور امیر
ندہی ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی

باگ ڈور آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے صاحبزادہ صاحب موصوف کی سفارش پر انھیں انگلستان جا کر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ ہزار روپے وظیفہ دینا منظور کیا تھا۔ عباسی صاحب نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لیکن مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باعث نہ صرف یہ بل منڈھے نہ چڑھ سکی بلکہ انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن امردہ واپس آ گئے۔

یہ طویل قیام علیگڑھ ان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی غتگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کارِ منصبی سے جو وقت بچتا، وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کانج اور کانفرنس کے کتاب خانوں میں کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ اس پر افسر ایسے ملے، جو کام اور علم کے قدردان تھے۔ عباسی صاحب کے دل میں بھی انگ انگ اور کام کرنے کا دلولہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور لیاقت میں متعدد اضافہ کر لیا۔

اب امردہ میں مقیم ہوئے، تو دفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن انہیں وطن کے عدم تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ "سمیرا" جاری کیا۔ انھوں نے عباسی صاحب کو بھی اس کے صیغہ، ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلی میں قیام رہا تھا۔

امردہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے "تاریخ امردہ" (جلد اول) اور پھر "تذکرۃ الکرام" (دوسری جلد) اور تحقیقی "النساب" تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، حتیٰ پڑوسی اور حق گوئی میں کسی کی رو رعایت ان کے سدراہ نہیں ہوئی۔ "تاریخ امردہ" میں اور پھر "تحقیقی النساب" میں کئی خاندانوں کا گچا چٹھا تھا۔ اس

سے قدرتنا بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی عباسی صاحب نے بکلیف برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انھوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ بعد کو امر و ہ کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور انگریز مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جو اسر لال منرو دوسرے پر امر ہے گئے ہیں، تو وہاں جلسے کا انتظام، اور نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی نضا مکدر ہو گئی اور امر ہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا، تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ چنانچہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب مہاجرین کو اپنی مستقل حیثیت کا تعین کرنا پڑیگا، فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور رازداری کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ سندھستان واپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ تھی۔ کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسراوقات کے لیے کوئی تشویش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملا مان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (درجیس فاطمہ) ہوئی، جو جناب سبط رسول فاروقی کے حوالہ عقد میں آئیں۔ پاکستان بننے پر بھی اور داماد ہاں چلے گئے تھے۔ جب عباسی صاحب تقاضائے عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امر ہے میں ان کا کون تھا! لہذا بیٹی کے بلائے پردہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت

کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد فروخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے۔ غرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانہ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں ہینے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت قوم کبوتر" چھپی جو امر دے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب سے زیادہ سنگا مرہا کیا، وہ "خلافتِ معاویہ و زید" ہے، یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے ابیر معاویہ اور ان کے جانشین زید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعہ حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کو خاموش نہ کر سکی، انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیقِ مزید" شائع کی (۱۹۶۰ء) مخالفانہ جلسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خموشی اختیار کی اور یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی۔

انھوں نے شرعاً امر دہہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ دراصل یہ ان کی تائید امر دہہ ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے پسندیدہ ان کے مسودات کی جھان بین کر کے اسے الگ کر لیں، اور شائع کر دیں، تو یہ اب کی مستقل خدمت ہوگی۔

۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طارق روڈ کراچی پرسوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ہندرناتھ

مشہور افسانہ نگار، قوم کے کھتری (چوڑہ) تھے۔ ان کا خاندان دراصل پنجاب میں زیر آبادی ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد گوری شنکر صاحب پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ ان کی اولاد میں پانچ بیٹے پیدا ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا صغریٰ میں فوت ہو گیا تھا۔ ہماری زبان کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہندرناتھ ان سے نو سال چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے راجدھرناتھ تھے، جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ پھر بہن سرلادیوی (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء) جو خود بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ سب سے چھوٹے اپندرناتھ، ماشاء اللہ سلامت ہیں۔

ڈاکٹر گوری شنکر اسی حیثیت سے ریاست بھرتنور میں ملازم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ وہاں کی ملازمت ترک کر کے کشمیر چلے گئے۔ یہاں وہ کشمیر کی ذیلی ریاست پونچھ میں سرکاری اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ ان کی عمر کا خاصا بڑا حصہ پونچھ میں گزرا۔ انھیں اس ریاست کی ہر ایک تحصیل میں تین تین چار چار سال قیام کرنا پڑا تھا۔ ہندرناتھ یہیں پونچھ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کا بچپن بھی کشمیر کی دلفریب وادیوں اور فلک بوس پہاڑیوں، روح پرور نظاروں اور خوبصورت جھیلوں میں گزرا۔ یہی حال بڑے بھائی کرشن چندر کا تھا۔ ان دونوں کی کہانیوں اور ناولوں میں جو فطرت کی نقاشی اور قدرتی حسن کی دیکھت تصویریں ملتی ہیں، ان کا پس منظر ان کے بچپن کا یہی ماحول ہے۔

جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو کرشن چندر کی طرح انھیں بھی مقامی وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ ہندو زمانہ نے انھوں نے درجے تک ہیں تعلیم پائی۔ کرشن چندر ان سے پہلے دسویں درجے کی سند لے کر فورین کرپچین کانج لاہور میں داخلے چکے تھے۔ ڈاکٹر گودی شنگر نے خیال کیا کہ اگر ہندو زمانہ بھی لاہور چلے جائیں، تو یہ نہ صرف ان کی تعلیم کے لیے بہتر ہوگا، بلکہ دونوں بھائی ایک ساتھ رہیں گے۔ چنانچہ ہندو زمانہ بھی لاہور آگئے، اور ڈی، اے، دی ہائی اسکول میں داخلے لیا۔ دسویں کا امتحان انھوں نے اسی اسکول سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھی فورین کرپچین کانج ہی میں پائی، جہاں سے انھوں نے بی، اے کی سند حاصل کی۔

کرشن چندر نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی کی سند بھی لی تھی۔ لیکن انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ عملی سیاست در وہ بھی پساری قسم کی (اور تصنیف تالیف میں لگ گئے۔ سیاست کا خاذا ان کے بس کی بات نہیں تھا، اس لیے انھوں نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا، اور تصنیف و تالیف کو بقیہ زندگی کے لیے اپنا ادھنا بھونا بنالیا۔

اس زمانے میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے مدیر اعلیٰ (ڈائریکٹر جنرل) تھے اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستند اور موثر اادیبوں اور شاعروں کو ریڈیو میں جمع کر رہے تھے۔ جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، انھوں نے اسے ریڈیو کی ملازمت کی پیشکش کر دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو واقعی کان ادب بن گیا، متعدد ادیب اس کے مختلف مراکز میں ملازم ہو گئے۔ کرشن چندر بھی اسی سیلاب میں بہ گئے۔ ان کا افسانہ (پرتان) ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا، جس نے انھیں شہرت کی شاہراہ پر گھرا کر دیا۔ اس کے بعد اردو چار چیریں بھی چھپیں۔ پطرس بڑے ذہین اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے اس نوجوان مصنف کو ریڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ یہ اپنے سیاسی بلکہ انقلابی خیالات کے باعث کچھ دن ٹال مٹول کرتے رہے، لیکن تاکے (احتیاج نے تو بڑے بڑے شہروں کو رو بہ مزاج بنادیا، بھلا کرشن چندر کب تک اپنے انکار پر قائم

رہ سکتے تھے۔ القصہ نومبر ۱۹۳۸ء میں وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ سال بھر بعد تبادلہ ہوا تو دہائی پہنچ گئے۔ اور پھر کوئی سال بھر بعد لکھنؤ۔

رشن چندر جہاں بھی گئے، ہندوستان کے ساتھ تھے۔ نئی کے قیام کے زمانے میں ہندوستان بھی شاہد احمد دہلوی سے ملے اور ان کے افسانے بھی ساتھی میں شائع ہونے لگے۔ اگر کبھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی گئی، تو اس وقت کھلیکا کہ ساتھی نے اردو افسانے کے فروغ میں اور خود افسانہ نگاروں کی امداد اور ان کی شہرت میں اضافہ کرنے میں کیا اہم نمایاں کیے۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے۔ بہر حال ہندوستان نے اس زمانے میں افسانے لکھے، اور یہ ساتھی کے علاوہ اب دوسرے رسالوں میں بھی چھپنے لگے۔

ہندوستان نے یہاں کئی ڈرامے بھی لکھے تھے، جو دہائی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے ایک مرتبہ یہاں کے قیام کے دوران میں دوستوں کے کہنے سننے سے انھوں نے حکومت ہند کے محکمہ سلائی میں ملازمت کا امتحان دے دیا، اور اس میں پاس ہو گئے۔ لیکن جب واقعی حاضری کا سوال آیا تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

جب کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ گئے تو ہندوستان بھی ان کے ساتھ گئے، کرشن چندر پروگرام اسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، اور خاص طور پر ڈراما کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں شوکت تھاڑی وہاں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر تھے۔ تھوڑے دن بعد انھوں نے پنجولی آرٹ پروڈکشن، لاہور کی نوکری قبول کر لی، تو ان کی جگہ پر ہندوستان کا تقرر ہو گیا۔

اب دیکھیے، نظریہ کارشمہ! ایک دن رچانک کرشن چندر کو مشہور فلم ساز ڈی۔اے۔اے۔ احمد کا پونا سے رٹا کہ اگر آپ ہماری فلموں کے لیے مکالمے لکھنے کی خدمت قبول کرنا چاہیں، تو حلے آئے۔ دوستوں نے انھیں سمجھایا کہ جی جانی سرکاری نوکری چھوڑ کر شخصی ملازمت قبول کرنا ناشمندی نہیں، لیکن وہ واقعی اس سرکاری نوکری ہی سے ہزار روپے چلے تھے، انھوں نے استغنیٰ حاصل کر دیا، اور پونا کی راہ لی۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ

اس سے اردو ادب کو کتنا فائدہ پہنچا بہر حال دونوں بھائی ۱۹۴۲ء میں پونا گئے اور دو سال احمد کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن چندر نے ممبئی ٹائمرز سے معاہدہ کر لیا۔ اور ایک سال بعد (۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء) خود پیشہ نخل کشی کے تعاون سے اپنی ایک پرانی کہانی پر مبنی فلم "سراے کے باہر" بنائی۔ اس میں ہندو ناتھ نے ہیرو کا پارٹ کیا۔ پھر دوسری فلم "دل کی آواز" تیار کی، اس میں بھی ہندو ناتھ ہیرو تھے۔ (مخیمہ خاتون نے حمیرا دین کا رد ادا کیا تھا)۔

اس کے بعد زلزلہ نے جب فلم کیپی قائم کی، تو ہندو ناتھ کوئی چار برس تک اس میں مکالمہ نویس رہے۔ اس کیپی کی ایک فلم "زلزلہ" میں انھوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کی ایک فلم "دھرتی کے لال" میں انھوں نے "سماج سیوک" کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب ہندو ناتھ کی بطور مکالمہ نویس اور افسانہ نگار کے مسئلہ حیثیت تھی۔ لیکن وہ جو عام مشاہدہ ہے کہ برگد کے درخت کے نیچے اور کوئی چیز اُگ یا پڑ نہیں سکتی، وہی حشر ہندو ناتھ کا کرشن چندر کی وجہ سے ہوا۔ کرشن چندر کی شہرت اور عظمت کے باعث ہندو ناتھ کو احساس ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے میرا جائز حق دینے کو تیار نہیں، اس لیے وہ کچھ بے پروا سے ہو گئے۔ ان کے بعض افسانوں میں زبان و بیان کی ہتھامیاں نظر آتی ہیں، ان کا اصل سبب یہی ہے۔

ان کا ایک بڑا کلام نامہ یہ ہے کہ انھوں نے "فلم رائٹریسی لیشن" قائم کی اور فلم سازوں سے فلم لکھنے والوں کے حقوق منوائے اور ان کا حق دلوا دیا۔ وہ زندگی بھر بلا مقابلہ اس انجمن کے سکریٹری چنے گئے۔ وہ ۱۹۴۰ء کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ہندو ناتھ کے افسانوں کے دس مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) چاندی کے تار، (۲) مائی ڈارلنگ ہوٹل، (۳) گالی، (۴) یہاں سے دہلی تک، (۵) پاکستان سے ہندوستان تک، (۶) جہاں میں رہتا ہوں، (۷) برات، (۸) نئی بیگم، (۹) تہنا، تہنا، (۱۰) داتا میری، ذکر تیرا۔

ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ہندو ناتھ ناول ہیں: (۱) آدمی اور سگ، (۲) رات اندھیری

ہے؛ (۳) سوانح، اہلیت اور گناہ؛ (۴) وعدہ؛ (۵) پیاد کا موسم؛ (۶) ایک شمع، ہزار
پر دانے؛ (۷) منزل ایک، مسافر دو (۸) تیری صورت، میری آنکھیں؛ (۹) لیڈر؛ (۱۰)
لڑپا، (۱۱) بچن؛ (۱۲) زید سے بیرو؛ (۱۳) درد کا رشتہ؛ (۱۴) ٹھوکر؛ (۱۵)
ارمانوں کی سیج۔

ان کی متعدد کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور رومانی
زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر گورکی (روسی)، اور موپاساں (فرانسیسی)
افسانہ نویسوں کا بہت اثر ہے۔ اور ان ہی کی طرح بھوک اور جنس ان کے خاص
موضوع ہیں۔

۲. مارچ ۱۹۷۷ء کو بمبئی میں بعارضہ قلب انتقال کیا۔ لا دارفوت ہوئے۔

حمید احمد خان، پروفیسر

اردو صحافت کی اور بہت سے ملک کی تحریک آزادی کی کوئی تاریخ، لاہور کے روزنامے زمیندار اور اس کے مدیر شہیر مولا نا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار دراصل مولا نا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان (ف: دسمبر ۱۹۰۹ء) نے ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا۔ ان کے زمانے میں یہ دہائی زمینداروں اور کسانوں کے کام کا ذرا غنتی پرچہ تھا۔ اسے سیاسی اور علمی روزنامہ تو ان کی وفات کے بعد مولا نا ظفر علی خان نے بنایا۔ لیکن اس وقت مجھے "زمیندار" کی تاریخ لکھنا منظور نہیں۔

مولوی سراج الدین احمد خان کی سادی اولاد، ماشاء اللہ ایک سے ایک بڑھ کر ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو کا ح کیے۔ بڑی بیگم کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے: ظفر علی خان، غلام حیدر خان اور محمد اکبر خان؛ کچھوٹی سے چھٹی تین ہوئے: محمود احمد خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں اور ہمارے خزانہ علم و ادب کو مالا مال کیا ہے۔

یہ خاندان دراصل کرم آباد تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب، حال پاکستان، کا رہنے والا تھا، لیکن حمید احمد خان یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک ان کی تعلیم چرچ آف اسکول لینڈ مشن ہائی اسکول، وزیر آباد میں ہوئی۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں تاریخ ادب اردو (انگریزی) کے مشہور مصنف اور ماہر لسانیات ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گماہم بلی (ف: ۱۹۴۲ء)

اس اسکول کے مینجر تھے اور طلبہ کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خان بھی ان کے شاگردوں میں ہے، بلکہ اپنی انگریزی کی قابلیت کے باعث یہ ان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک میں بھی وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول کا طالب علم رہا ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈاکٹر سیلی کو دیکھا تھا۔ چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے غالباً سچیل نہیں ہوگا، اگر یہاں بطور حبلہ و معترضہ ڈاکٹر سیلی کا ایک لطیفہ محفوظ کر دوں:

ڈاکٹر سیلی اپنے طویل تیام پنجاب کے باعث بہت اچھی پنجابی سمجھتے اور بولتے تھے۔ اور انھیں اپنے ملنے والوں اور طلبہ اور طلبہ کے والدین کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا تھا، بلکہ وہ اس زبان میں بہارت کا مظاہرہ کر کے بجا فخر محسوس کرتے تھے۔ بعد کو انھوں نے ولایت دہلی پر پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی تھیں۔ اس میں کوئی شہرہ نہیں کہ مسلسل مشق اور مزاحمت سے ان کی پنجابی سے واقفیت حیرتناک حد تک وسیع ہو گئی تھی، اور وہ اس کے خاص محاورات اور لہجے پر بخوبی قادر تھے۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وزیر آباد کے مصنفات سے ایک دیہاتی اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں داخلہ دلانے کو لایا۔ داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی اور درجے میں جتنی جگہیں تھیں، وہ پُر ہو گئی تھیں۔ طالب علم کے والد نے بہت مدت سماجت کی، لیکن ڈاکٹر سیلی ٹس سے ٹس نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ درجے میں جگہ ہی نہیں رہی، ہم داخلہ کیسے منظور کریں! لیکن دیہاتی اس کے باوجود اصرار کیے جا رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر سیلی کو مذاق کی سوچھی۔ فرمایا: اچھا، اگر آپ مجھ سے پنجابی میں کوئی بات ایسی کہیں، جو میری سمجھ میں نہ آئے تو میں لڑکے کو داخلے کی اجازت دے دوں گا۔ یہ گویا ان کا اپنے پنجابی کے علم پر اعتماد کا اظہار تھا! اس پر لڑکے کے والد کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بیاختہ کہا: ادے، توں کون ہوناں ایں ایس چھورے نوں داخل نا کرن آلا! میں گھسٹن مار تیرا بھسٹن بھسٹن دیوونگا! ارے تم کون ہوتے ہو اس لڑکے کو داخل نہ کرنے والے! میں گھو نا مار کر لٹھارے منہ کا جیرا توڑ دوں گا! اس فقرے کا پہلا حصہ ایسا مشکل نہیں

لیکن آخری حصہ واقعی مشکل ہے اور جس شخص کو دیہاتیوں کے ساتھ رہنے اور ان سے مقامی روزمرے میں بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کے لیے یہ عیسر الفہم ہے۔ نیلی نے جو یہ فقرہ سنا، تو ان کا منہ کھلے کا کھلا دہ گیا۔ لیکن زبان دے چکے تھے، اب وعدہ خلافی کیسے کرتے! کہنے لگے، اچھا صاحب، لڑکا تو داخل ہو گیا، لیکن جو کچھ آپ نے کہا، اب اس کا مطلب بتا دیجئے۔ جب دیہاتی نے معنی بتائے، تو بہت دیر تک ہنستے رہے (یاد رہے کہ یہ ساری گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی)۔

تو خیر، دسویں کی سند لینے کے بعد حمید احمد خان، حیدر آباد (دکن) چلے گئے، جہاں ان کے بھائی جناب محمود احمد خان عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے (بعد کو وہ چندے اسی یونیورسٹی میں رجسٹرار بھی رہے) حمید احمد خان نے عثمانیہ میں داخلہ لے لیا اور تین سال بعد بی اے آنرز کی یہیں سے سند لی۔ وہ اس سال اپنے درجے میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور انھوں نے اول ڈویژن حاصل کی تھی۔ ایم اے (انگریزی) کا امتحان انھوں نے بعد کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے دیا۔

حمید احمد خان بعد کے زمانے میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت مولانا عبدالباری (رع۔ باری) کا بنایا ہوا ہوں۔ مولانا عبدالباری ندوی (ف: ۱۹۷۹ء) اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور حمید احمد خان کے استاد۔ ان کے دل فروغ کی فتوحات اس وقت بھی نمایاں تھیں، اور بعد کو وہ جس مقام پر پہنچے، وہ تو ہم عامیوں کی پروا نہ کیاں سے بھی کہیں بلند تھا۔

حمید احمد خان نے ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے کیا، وہ جنوری ۱۹۳۲ء میں یہاں انگریزی کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ وہ بہت کامیاب معلم ثابت ہوئے۔ اپنے ہمکار مدرسین اور اساتذہ اور طلبہ میں وہ یکساں ہر دو عزیز تھے۔ اگرچہ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، لیکن اردو سے محبت اور اس کی ترقی اور ترویج کا جذبہ انہیں درشتے میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کالج میں "بزم فروغِ اردو" قائم کی، اور کالج کے رسالے کریسٹ

کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ادارت تعلیم، حکومت ہند (ڈاکٹر ٹریٹ آف ایجوکیشن) کے ادارے دہلی پالی ٹیکنک میں انگریزی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ اگلے تین سال ان کا قیام دہلی میں رہا جب آزادی کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا، تو اگست ۱۹۴۷ء میں وہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ فروری ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ٹریٹ کی خدمت ہونے کے باعث ان کی آئندہ ترقی مشتبہ ہے۔ اس پر وہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج (انگلستان) گئے اور وہاں سے ایم، لٹ (ماسٹر آف لٹریچر) کی سند حاصل کر کے وطن آئے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: درہ سورتھ کی شاعری میں شہوانی اور روحانی تصورات۔ پروفیسر آدبری مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۶۹ء) جو ان کے یوٹر بھی تھے اور ایک ممتحن بھی، جیتے تھے کہ وہ سال بھر اور رک جائیں اور اپنے مقالے کا دائرہ وسیع تر کر کے اسے از سر نو قلمبند کر دیں، تاکہ انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی جاسکے۔ لیکن حمید احمد خان کے خانگی حالات ان کے مزید قیام انگلستان کے لیے سازگار نہیں تھے؛ انھیں بادل ناخواستہ واپس آنا پڑا۔ دہلی پر وہ اپنے اصلی کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۵۵ء میں کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ ان کا پانچ سالہ عہد ادارت اس کالج کی تاریخ کا زریں دور ہے۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) بنایا گیا۔ انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں پنجاب یونیورسٹی کی کاپی لٹ دی جس جگہ انگریزی کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی، وہاں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک سب کام اردو میں ہونے لگا۔ وہ خود اپنا دفتری کام اردو میں کرتے، ریلوں پر اپنی یادداشتیں اور حکم احکام اردو میں لکھتے، اردو سرکل کو کبھی اسی کی ترغیب دیتے۔ اساتذہ کو عام اجازت تھی کہ وہ تمام مضامین اردو میں پڑھائیں۔ طلبہ کو کھلی چھٹی تھی کہ بی اے،

بی ایس سی، ایم اے تک تمام امتحانات کے پرچوں کے جواب اُردو میں لکھیں۔ اور تو اور تمام امتحانات کی اسناد بھی اُردو میں چھپنے لگیں۔ وہ ساری زندگی انگریزی پڑھاتے رہے اور یہاں سے ولایت تک سب معترف ہیں کہ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو یا اُردو تحریر میں، اصطلاحات کے ماسوا، وہ بھی انگریزی کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں دونوں زبانوں کے خانے الگ الگ تھے جب ایک بند ہو جاتا، تو دوسرا کھلتا؛ وہ دونوں کو آپس میں گڈ مڈ نہیں کرتے تھے۔

یہ پاکستان کی سیاست کا دُرِ آئینی تھا، اور وہاں ایک نئی قسم کی نوکر شاہی عالم وجود میں آگئی تھی۔ ہر سرکاری دفتر اور ایریا غیر افسر ہر اعلیٰ میں دخل در معقولات دنیا اپنا پیدائشی حق سمجھتا؛ ادھر حمید احمد خان ضابطے قانون کے صدر درجہ پابند۔ ان کا اصول یہ تھا کہ تعلیم کا درجہ سب سے بلند ہے؛ اور کسی "سردنی" کا پونیو سٹی کے معاملہ میں ان کی اجازت کے بغیر، دخل دینا کفر کے مرادف۔ وہ خود کسی وزیر یا تدبیر تک کی ملاقات کو تو جلتے نہیں تھے، سکرٹری، نائب سکرٹری کا کیا ذکر ہے! کبھی ضرورت پیش آگئی، تو ضابطے کا خط پرچہ کچھ کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا۔ جہاں بنیادی اصولوں میں اور طریقہ کار میں یہ بعد المشرقیں ہوا وہاں، بھلا کتنے دن عافیت سے گزر سکتی تھی! کمال تو یہ ہے کہ اس پر بھی انھوں نے چھ برس گزار دیے۔ بہر حال ارباب حکومت کو ان کی آزادہ روی اور بقول شخصہ "اکر" کھلنے لگی۔ چنانچہ ان کے خلاف طرح طرح کی ایسے دو انیاں ہونے لگیں۔ اولاً طلبہ کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ پھر ان سے کہا گیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ حمید احمد خان نے دیکھا کہ اس ماحول میں عزت نفس اور خودداری کی قربانی دیے بغیر گزارا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے "عطائے نو"، بلقائے نو "کہتے ہوئے"۔ فروری ۱۹۶۹ء میں استعفادے دیا۔

ابھی وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے کہ حکومت نے مارچ ۱۹۶۲ء میں ان کی علمی اور

تعلیمی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستارہ امتیاز کا اعزاز دیا۔ پھر یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں اگست ۱۹۶۸ء میں اس سے بھی اعلیٰ "ستارہ پاکستان" کا نشان عطا کیا۔ جون ۱۹۶۴ء میں جا کارتا (دارالخلادہ انڈونیشیا) میں ایک ایشیائی/افریقی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اور اس کے اگلے برس مارچ ۱۹۶۵ء میں باندنگ میں دونوں میں وہ پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے مستقل ادارے کے نائب صدر بھی چنے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی باندنگ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی داس چانسلری کے دوران میں انھوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اور جس محنت اور دلسوزی سے دن رات کام کیا، اس نے ان کی تندرستی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سکندرشہز تو ہو گئے، لیکن اس کے بعد صحت کے پہلو سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس کے باوجود جب حکومت نے اپریل جولائی ۱۹۶۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا اضافی مدیر (ایڈیشنل ڈائریکٹر) بنانے کی پیشکش کی، تو انھوں نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس سے ملک و ملت اور زبان کی خدمت کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد سید امتیاز علی تاج کی وفات (اپریل ۱۹۷۰ء) پر وہ جولائی ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب کے ناظم مقر ہو گئے۔ اپنی وفات رسیدہ اسی عہدے پر مشغول تھے۔

انھیں فشار دم کا عارضہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا حملہ جون ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد طبی ہدایت کے تحت وہ کچھ محتاط طور پر رہنے لگے، لیکن کام کی وہ بھرمار تھی کہ سکون مفقود تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ قے ہوئی۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد پھر جانے کو اٹھے۔ گھر کے لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ آج دفتر نہ جائیے اور ڈاکٹر کو بلا کر اس سے مشورہ کیجیے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ اتنے میں دوسری مرتبہ قے ہوئی اور ساتھی بیہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر آیا، معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ جہاں اسی دن شام کے چھ ساڑھے چھ بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اَنَا لَشَدِيدُ اِيَّا اَلْبِرِّ رَا جَعُوْنَ . جاذہ اگلے دن سہفتہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کی صبح میں اٹھا اور انھیں ہلنگ کے قبرستان میں (غالب روڈ اور سرسید روڈ کے مابین) سپرد خاک کیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے غفود و کرم کا سلوک کرے، آمین!

طاہر شادانی نے آہ کے تخرجہ سے تاریخ کہی ہے:

طاہر! اس کے سن رحلت پر گہو کھینچ کے آہ

”اہر و حبتا فردوس“ حمید احمد خان

(۱۹۸۰-۶ : ۱۹۷۳)

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چھ بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید احمد خان ایم، ایس سی، ایم ایس (امریکہ) کیمیکل انجینیر ہیں۔ ان سے چھوٹے بیٹے خلیل احمد خان بھی انجینیر ہیں؛ جمیل مہیاں نیاک میں ملازم ہیں۔ ذقار، منصور اور ممتاز ابھی طالب علم ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔

جس طرح وہ بات چیت میں بہت کم گو تھے، اسی طرح لکھنے میں بھی بہت محتاط اور سست رہتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس میں سے بھی بہت کم کتابی صورت میں جمع ہوا۔ لیکن یہاں سوالی مقدار کا نہیں، بلکہ معیار کا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ایک انتخاب ”سہفتہ“ ادب“ (نظم و نثر) شائع کیا تھا، جو نصاب کے لیے بہت مؤثر ہے۔ لیکن دراصل ان کی اپنی سب سے پہلی کتاب حضرت رسول کریم صلعم کی مختصر سوانح عمری ہے، جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ دیوان غالب کا نسخہ بھوپال، جو بعد کو نسخہ حمیریہ کی بنیاد بنا، ایک مدت سے غائب اور علمی دنیا اس سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ خوش قسمتی سے حمید احمد خان نے اسے اگست ۱۹۳۸ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا، اور اس سے یادداشتیں لے لی تھیں۔ انھیں کو مرتب کر کے غالب صدی کے موقع پر جولائی ۱۹۶۹ء میں نسخہ ”حمیریہ“ شائع کر دیا اور اس طرح یہ دیوان دوبارہ بلکہ زیادہ محکم طور پر حمید کے نام سے منسوب ہو گیا۔

ان کی تیسری کتاب "ارمغانِ حالی" ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) اس میں حالی کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ اس کے دیباچے کا مطالعہ حالی کے سمجھنے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی ذفات کے وقت و کتاب میں زیرِ طبع تھیں، تعلیم تہذیب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری؛ یہ بعد کو شائع ہوئیں۔

ان کی کئی کتابیں کم دہش ترتیب و تدوین کے آخری مرحلوں پر تھیں۔ ان میں غالب اور اقبال کے بارے میں بہت کام سوچا تھا۔ غالب سے متعلق مضامین خلیفہ سائل و جبرائیل میں منتشر ہیں، ان کا ایک مجلد شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے معصروں اور بزرگوں کے حالات میں متعدد مضامین قلمبند کیے تھے، جو اسی زمانے میں چھپے تھے، انھیں سچی جمع کرنا چاہیے۔ غرض کوشش کر کے ان کی تمام اردو اور انگریزی تحریروں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

افسر میرٹھی، حامد اللہ

میرٹھی میں مفتیوں کا خاندان بہت مشہور ہے، بلکہ وہ محلہ جہاں ان اصحاب کی سکونت ہے، "محلہ مفتی صاحبان" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو ضلع میرٹھی میں معافی کے چند گانے عطا ہوئے تھے، جس سے انھوں نے میرٹھی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس آخر زمانے میں ان کے ایک فرد مفتی محمد عصمت اللہ ہوئے ہیں۔ وہ بھی اسی خاندانی روایات کے حامل اور زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اور طویل مدت مقامی گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی کے مدرس رہے۔ ان کے چھ اولاد ہوئیں: (۱) بلقیس۔ شعر بھی کہتی تھیں اور مقامی طور پر کافی مشہور ہوئیں؛ (۲) شفقت اللہ، (۳) حامد اللہ، (۴) مطیع اللہ۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول میرٹھی سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جیپور میں سکونت اختیار کر لی؛ وہاں اسکول میں معلم ہو گئے تھے۔ نجی مطالعہ سے بالآخر ایم اے پاس کر لیا اور اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے تھے؛ غالباً داد پینڈی میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ قمر تخلص ہے (۵) مبشرہ؛ (۶) مومنہ۔ حامد اللہ ۲۹ نومبر ۱۸۹۵ء کو اپنے خاندانی مکان (محلہ مفتی صاحبان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو والد نے انھیں خود فارسی اور اردو پڑھانا شروع کی جیب کافی استعداد ہو گئی، تو حکم ہوا کہ روزانہ کسی اپنی پسند کے موضوع پر ایک مضمون اردو میں لکھ کر دکھایا کرو۔ موضوع کی قید نہیں تھی؛ یہ کسی برتن، پھول، چادر پانی، گائے، کھیتیں

پر ہو سکتا تھا۔ ردزانہ نماز مغرب کے بعد وہ یہ مضمون دیکھتے، ادنیٰ آواز سے اسے خود پڑھتے اور ہمیشہ اس کی تعریف کرتے۔ سال کے آخر میں یہ ۳۶۵ صفحات مجلد کر لیے جاتے۔ اب آغاز سال سے دو کام ان کے ذمے ہو جاتے: ایک نیا مضمون حسب معمول لکھنا؛ اور دوسرے پچھلے سال کے اسی تاریخ کے مضمون کی شرح روشنائی سے اصلاح کرنا۔ مغرب کے بعد وہ یہ دونوں چیزیں والد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح انھیں پڑھتے، تعریف کرتے اور لوٹا دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک رہا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے:

اگر کسی دن کسی وجہ سے مضمون نہیں لکھتے تھے، تو والد ناراض نہیں ہوتے تھے، نہ زبرد تو بیع کرتے، بلکہ انھوں نے تنبیہ کا ایک الگ طریقہ اختیار کیا تھا شب کا کھانا باب بیٹے دونوں ردزانہ دیوانہ خانے میں ایک ساتھ کھاتے۔ تھے جس دن یہ مضمون نہ لکھتے، والد اندر کھلا بیٹھتے کہ آج کھانا صرف حامد اللہ کے لیے بھیا جائے، ہم کھانا نہیں کھائیں گے اور کھانا آجانے پر انھیں حکم ہوتا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا تھی کہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ تیز سے تیز بخار تک کی حالت میں بھی وہ ایک صفحے کا یہ مضمون ضرور لکھ لیتے تھے۔

رات کو یہ اپنے والدی کے پاس دیوانہ خانے میں سوتے تھے۔ سونے سے پہلے وہ اپنے ملکوں ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں کے، خاص طور پر تاریخ اسلام کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کے حالات اور قصے سنایا کرتے تھے۔ جب تک یہ انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوئے، وہ پہلا دستور ایک صفحہ ردزانہ لکھنے کا جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہو گئی کہ اب موضوع اپنی پسند کا نہیں بلکہ پچھلی رات جو مشاہیر کے واقعات سناے گئے تھے، ان میں سے کوئی واقعہ ایک صفحے میں کھا جائے۔

مفتی محمد عصمت اللہ بیٹے کو فارسی اور عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں مدرسہ عالیہ میرٹھ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سال بھر بعد امتحان ہوا تو کسی مضمون میں ممکن نے انھیں پچاس نمبر کے پرچہ میں پچیس نمبر دے دیے۔

جب یہ بات مفتی صاحب کے علم میں آئی تو بہت متعجب ہوئے۔ کہتے: یہ پاس تک تو خیر
 غنیمت تھا، یہ سچپن کیسے ہو گئے؟ پنج فاضل کہاں سے آئے؟ اس پر وہ کچھ بدظن
 ہو گئے؛ حامد اللہ کو مدرسہ عالیہ سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا، جہاں کے اکابر سے ان
 کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن یہ وہاں سال بھر سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایسے بیمار پڑے
 کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علاج کے لیے میرٹھ آنا پڑا۔ علاج سے اچھے تو ہو گئے۔
 لیکن پھر دیوبند واپس نہ جاسکے۔ اب مفتی صاحب نے خود ہی پڑھانا شروع کیا۔
 فادسی کا نصاب ختم کیا، بلکہ اسی زمانے میں یہ فادسی شاعری کرنے لگے۔ پھر ان کے داماد
 بنو گرام نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اذہر، قاہرہ بھیج
 دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے اپنا ایک مکان بیچنے کی تیاریاں
 کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی سفر کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی۔ لیکن عربی
 کی تکمیل قسمت میں نہیں تھی تھی۔ پاسپورٹ کی درخواست منظور نہ ہوئی اور یہ مصر
 نہ جاسکے۔

اس اثنا میں ان کے ایک مکان میں آگرے کے ایک نقشہ نویس کرایہ دار آگئے۔ ان کا
 ایک بیٹا اسکول کے ساتویں درجہ میں فادسی میں قیل ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو انگریزی
 اور ریاضی کے مضامین گھر پر بھی طور پر پڑھانے کا انتظام کر رکھا تھا، لیکن فادسی کا
 کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے مشورہ کیا، تو انھوں
 نے حامد اللہ کو بلوایا اور پوچھا کہ انھیں یہ شکل درپیش ہے، کیا آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں؟
 یہ اس لڑکے کو فادسی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن اس لڑکے نے حامد اللہ صاحب
 سے پوچھا کہ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟ ان کے نفی میں جواب دینے پر اس نے پیشکش
 کی کہ میں آپ کو انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود ساتویں درجے میں
 پڑھتا تھا، اس لیے وہ زیادہ دن تک ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ بہر حال یہ انگریزی
 پڑھنے لگے۔ جب ان کے والد مفتی عصمت اللہ کو ان کے نئے شوق کا علم ہوا، تو انھوں
 نے جو صلاح فرمائی کی اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی منگوادیں۔ استاد کی شاگردی کا یہ

سلسلہ دد برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد محض حسن اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی زندگی کا رخ ہی بدلا گیا۔ اپنے ڈپٹی منڈیر احمد کے دل کا رخ میں داخلے کا قصہ تو پڑھا ہو گا کہ کیونکر داخلے والے دن بھڑ میں ان کا پالوڑیا تھا، جس سے وہ گر گئے، اور پرنسپل نے لیک کر انھیں اٹھایا اور مفتی صدر الدین آزاد کے حوالے کر دیا اور مفتی صاحب نے ان کا امتحان لے کر انھیں کالج کے عربی درجے میں داخل کر لیا۔ اور یوں وہ کسی مسی کی پیش امامت سے بال بال بچ گئے۔ حامد اللہ کے ساتھ جو کچھ گزری وہ اس سے کم دلچسپ نہیں۔

ان کا وہ فادسی کا شاگرد اب آٹھویں کا امتحان پاس کر کے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ جس دن داخلے کا فیصلہ ہونا تھا، یہ بھی تقریباً ٹہلے ٹہلے اس کے ساتھ اسکول چلے گئے۔ کسی نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سب انڈر اور کا خود امتحان لینگے، اور داخلے کا فیصلہ کریں گے۔ اسی سال نے ہیڈ ماسٹر ولیم فریئر صاحب ولایت سے تشریف لائے تھے۔ سب امیر داران کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے اتنے میں فریئر صاحب بنگلے سے برآمد ہوئے اور حکم دیا کہ سب طلباء ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں اس پر اسکول کے کوئی اور معلم آگے بڑھے، اور بچوں کی قطار بنوانے لگے۔ جب اس نے حامد اللہ کو بھی قطار میں کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں داخل ہونے کو نہیں آیا۔ استاد نے ان سے پھر ک کہہ کر کہا: خاموش رہو اور چپ چاپ قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس معلم نے غالباً سنا بھی نہیں تھا کہ حامد اللہ نے کیا کہا ہے۔ طوعاً و کرہاً یہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر قطار میں سے لڑکوں کا انتخاب شروع کیا۔ وہ جس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے وہ قطار سے الگ ہو جاتا۔ یہ دونوں استاد شاگرد قطار میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ ماسٹر صاحب نے حامد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان کے شاگرد (یا استاد) کو چھوڑ دیا۔ اب اسکول کے اسی استاد نے ان سے نام، پتہ وغیرہ پوچھا شروع کیا۔ یہ پھر امتحان کرنے لگے کہیں نویں درجہ میں داخلہ نہیں چاہتا۔ میں اس کے لائق ہی نہیں۔ لیکن وہ استاد

ہوئے کہ جب نو دہیڈاسٹر صاحب نے تمھارا ذوق کے لیے انتخاب کر لیا ہے، تو تم کون سوتے ہو انکار کرنے والے تو صاحب، یہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجہ میں داخل ہو گئے۔ خیر یہ داخل ہونے کو تو ہو گئے، لیکن اس نعمت غیر مترقبہ کے باعث اچھی خاصی مصیبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی (حساب، الجبرا، آلفیڈس) وغیرہ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہلی سالہ ہی کے اخیر میں اردو فارسی اور انگریزی میں تو کسی طرح پاس ہو گئے، بقیت مضامین میں صفر۔ اس پر والد نے ان کے پڑھانے کے لیے خاص استاد کا انتظام کیا۔ ششماہی میں، ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی کھلے بُرے پاس ہو گئے۔ اس سے کچھ حوصلہ بڑھا۔ بہر حال سال کے آخر میں ششم پشتم چل نکلے۔ غرض انھوں نے ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد ایم اے اور وکالت کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے۔ لیکن عین امتحان کے زمانہ میں انھیں تباہی نے آدھو جلا۔ میرٹھ چلے آئے اور امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں (۱۹۲۲ء) میں انھوں نے یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے بجائے شہر میں ایک کمرہ کرایے پر لے لیا تھا۔ یہ کمرہ شہر بھر کے شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر کے شاعر بھی آکر ان کے وہاں ڈیرہ اداں دیتے جتو اور فانی کئی مرتبہ ان کے یہاں رہے۔ انھوں نے ایک پرچہ "ذہب سار" کے نام سے جادی کر دیا جس کے لیے وہ مخلف عنوان خود ہی تجویز کر کے دستوں سے مضمون لکھواتے رہے۔ اس سلسلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک حصہ دوسرے ہندی اور اردو کے رسائل میں چھپنے والے تمام مقالات کے لیے وقف تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کا یہ تصدیق بالکل نادر تھا۔

جب وہ علی گڑھ سے واپس آکر میرٹھ میں مقیم ہوئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار انجیل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

ان کے دسویں کی سند لینے کے بعد ہی سے والد ان کی ملازمت کے لیے کمشنر میرٹھ کے پاس سفارشیں پہنچا رہے تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامد اللہ صاحب نائب تحصیلدار کی

کے لیے نامزد ہو گئے، جب انہیں معلوم ہوا، تو انہوں نے والد سے احتجاج کیا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ میرٹھ کالج کے انٹر میڈیٹ کے متعلم تھے۔ والد نے ان کے شوق کے پیش نظر اصرار تو نہ کیا، لیکن یہ کہ اب ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے کینے کی پرورش کے ساتھ ان کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کر سکتے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر جمیس کو جب معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے سرکاری ملازمت پر تعلیم کو ترجیح دی ہے، حال آنکہ اس کے گھر کی مالی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ملازمت قبول کر لیتا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انہوں نے منجھارا دیسہولتوں کے اس طرح سے کیا کہ انہیں ایک انگریز مسٹر نکسن کو اردو فارسی پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ مشاہرہ چالیس روپے مقرر ہوا۔ لیکن ایک ہینا بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ انہوں نے مسٹر نکسن سے کہا کہ میں آپ کو اردو، فارسی پڑھاؤنگا، آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کیجیے، اس صورت میں آپ کو مجھے تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی جیص بیص کے بعد مسٹر نکسن اس انتظام پر راضی ہو گئے، جس سے دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ہندستان سے واپس جانے کے بعد نکسن صاحب غالباً لیڈز یونیورسٹی میں فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے تھے۔ انہوں نے حامد اللہ افسر کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

بی اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد اکبر ضیاء الدین (ف: دسمبر ۱۹۲۷ء) نے کوشش کی تھی کہ یہ سرکاری ملازمت میں لے لیے جائیں۔ لیکن افسر صاحب نے کہا کہ میں یا تو کتابوں کی اشاعت کا کام کرونگا، یا پھر تعلیمی محکمے میں پڑھانے کا۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد مفتی محمد عصمت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں میں ان کے والد کے ایک دوست کا بیوی حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ان کی دسالت سے دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں وہ کالج کے وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔

ان کے آخری ایام بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ آمدنی تقریباً مفقود، اسباب معیشت کی دوا فروزوں گرائی، بکری سنی۔ ان سب کے ٹوٹنے نے نہ حال کر دیا تھا تب دق ہو گئی۔ یوپی حکومت اور یوپی اردو اکاڈمی نے کچھ مالی امداد دی، لیکن حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار بغرض علاج لکھنؤ میڈیکل کالج کے تب دق کے شعبے میں داخل ہو گئے تھے، لیکن اب حالت علاج کی حدود میں نہیں رہی تھی۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۷۱ء سے پہلے انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین اگلے دن ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطباء لکھنؤ کے خاندانی قبرستان محلہ جھوائی ٹولہ کی مٹی قسمت میں بھی تھی۔

افسر نے شعر گوئی بہت جلد شروع کر دی تھی۔ اول اول انھوں نے لودیاں اور گیت لکھے۔ یہ آج سے ۶۵۔ ۷۰ سال پہلے کی بات ہو، جب اردو دواؤں کو ان باتوں کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ لودیاں یوپی کے دیہات میں اُس اور بڑی بوڑھیاں آج بھی اپنے بچوں کو سناتی ہیں، اگرچہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا لکھنے والا کون ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ ”بچوں کے افسر“ کے عنوان سے لوداؤں نے چند سال پیشتر شائع کیا تھا۔ افسر کا نام خاص کزنچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، لیکن انھوں نے نظم و نثر میں خاصا بڑا ذخیرہ اپنی یاد گار چھوڑا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ”چاند چاند“ ہے جس میں چاند کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب جب پہلی مرتبہ چھپی ہے، تو وہ اُس کے پہلے سال کے طالب علم تھے۔

اسی زمانے میں بیگم کو ذیل انعام ملا، تو مسٹر نکسن نے انھیں مشورہ دیا کہ بیگم کی کتاب کریڈٹ مونس (سٹیشو) کا اردو ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس کا نام ”ماہ نو“ رکھا (مسٹر نکسن) نے ”چھوٹی چھوٹی کڑیاں“ نام تجویز کیا تھا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اسی کے ساتھ ”چاند چاند“ بھی جواب تک گنا م تھی، منظر عام پر آگئی۔ دونوں کتابوں کے سال بھر میں کئی ایڈیشن نکل گئے اور ان سے افسر صاحب کو اتنی یافت ہو گئی کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے بیفکر ہو گئے۔

”ماہ نو“ کے ترجمہ کا شاخسانہ ایک اور طرح نمودار ہوا۔ انگریزی کتاب کے ناشر (میک ملین می)

نے انھیں ہر جانے کا نوٹس دیا کہ تم نے ہماری اجازت کے بغیر ہماری "کاپی رائٹ" کتاب کا ترجمہ کیوں چھاپا ہے یہ بیچارے سیدھے سادے آدمی، بھلا ان قانونی موثر کامیوں کو کیا جانیں؛ کلکتے کا ٹکٹ لیا اور خود ٹیگور کی خدمت میں جا پہنچے۔ ٹیگور نے انھیں اس ضابطے سے نکلنے کی راہ بھجوائی۔ کتاب کا سندی ترجمہ بعنوان "ششوی" بھی چھپ چکا تھا اور اس کے جملہ حقوق خود ٹیگور کے پاس تھے۔ ٹیگور نے ان سے کہا کہ تم میک میلین کمپنی کے نوٹس کے جواب میں لکھ دو کہ میں نے اردو ترجمہ انگریزی سے نہیں بلکہ ہندی سے کیا ہے۔ یہی انھوں نے لکھ دیا، جس پر انگریزی ناشر خاموش ہو گئے اور یوں یہ بلا ٹلی گئی۔ اس کے بعد سے ٹیگور سے عمر بھر کے لیے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ نظم: پیام روح (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ جوئے ڈان (لکھنؤ ۱۹۵۴ء) دونوں میں نظمیں ادارہ غریبیس ہیں۔ دوسری کتاب پر حکومت یوپی نے ۵۰ روپے انعام دیا تھا۔ حق کی آواز (لکھنؤ ۱۹۶۲ء) دوسری جنگ عظیم سے متعلق نظمیں۔

۲۔ افسانہ: چاند چاند (میرٹھ ۱۹۱۷ء)؛ ڈالی کا جوگ (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ آنکھ کا نور (لکھنؤ ۱۹۴۰ء)؛ پرچھائیاں (لکھنؤ ۱۹۴۵ء)۔

۳۔ ڈراما: سفت نظر (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

۴۔ تنقید: نقد الادب (لکھنؤ ۱۹۳۵ء) تنقید کی تاریخ اور اس کے اصول؛ کتاب کی جنگ (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ نورس (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ تنقیدی اصول اور طریقے (ادارہ فردغ اردو لکھنؤ)۔

۵۔ ترجمہ: ماہ نو (میرٹھ ۱۹۱۸ء) ٹیگور کے کریسٹ مون کا ترجمہ

۶۔ قومیات: ہمارا جھنڈا (لکھنؤ ۱۹۵۸ء) پندرہ اگست (لکھنؤ ۱۹۴۷ء)۔

تاریخ تحریک آزادی؛ گاندھی جی کے ساتھ (لکھنؤ ۱۹۶۰ء) گاندھی جی کے اقوال؛ حکایات گاندھی (سنگم، دلی) گاندھی جی کی روزمرہ کی زندگی کے سبق آموز واقعات۔

۷۔ متفرقات: آسمان کا ہمایہ (الہ آباد ۱۹۵۴ء) ایورسٹ کی کہانی؛ ترقی

کی راہیں، عملی نفسیات (بچوں کے لیے) جانوروں کی عقلندی (سنگم، دلی)، گلیو، کا سفرنامہ (بچوں کے لیے) سوفٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ، مکانوں کی کہانی۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو برسوں یوپی کے مدراس میں پڑھائی گئیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں ایک طویل مشنری آدم نامہ ہے، جس میں انسان کی آفرینش کا مقصد بیان کیا ہے۔ ایک مسدس "رزمِ آخر" بھی ہے، اس کا موضوع اوزنگ زب۔ اور دارا شکوہ کی جنگ ہے۔ ایک اور کتاب "ذوقِ ادب کی تربیت" بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی سوانحی لکھنا شروع کی تھی۔ خدا معلوم یہ مکمل ہوئی تھی، یا نہیں۔

اب آخر میں چند شعر ملاحظہ کیجئے۔ بختگی اُن کا طرہ امتیاز ہے۔ حسنِ فطرت کے دلدادہ اور رجائیت کے علمبردار ہیں۔ محبِ وطن اور نبیِ نوعِ انسان کے مجدد۔

ہزارینِ نیکیوں کے مالک! مجھے تباہی سے کب اترے
کہ تیرے کعبے میں رسنے والا، کبھی خداسی، کبھی صنم ہو
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو وہ دیکھتے تھے کہ حال کیا ہے
مگر میں بے اختیار، افسر! یہ کہ اٹھا: آپ کا کرم ہے۔

چاہتے ہیں اب تو یہ سوداِ ثمانِ جستجو — کاش، منزل پر کوئی کہہ دے کہ یہ منزل نہیں
تاروں کا گوشہ میں آنا محال ہے — لیکن کسی کو نیند نہ آئے، تو کیا کرے

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا، کیا ضبط کریں کیا صبر کریں!
مجھ جیسے کاش، وہ ہو جائیں جو آ کر سمجھاتے ہیں

ببِ خوشی کا خیال آتا ہے — دلِ مایوس کا تپ جاتا ہے
صدائیں آتی ہیں دھیمے رُسنِ گلانے کی — اب کج پھر نہیں امید نیند آنے کی
کیا پوچھتے ہو، کیا حالت ہے؟ جو پڑتی ہے وہ سہتے ہیں

پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، یہ دن بھر دھڑکے رہے ہیں
فطری سہی خاموشی لیکن کچھ چوٹ بھی دل پر کھائی ہے
یہ میں نے اکثر دیکھا ہے، کچھ افسر چپ چاپ رہتے ہیں

یہ بھی اک تماشا ہے کا اوبار الفت میں دل کسی کا ہوتا ہے، بس کسی کا چلتا ہے
اس قدر بھی الفت میں ہونہ کوئی بے قابو دل میں سوچتا کیا ہوں منہ سے کیا نکلتا ہے
انسان وہ ہے جو، اے افسر! ٹھکرائے مصائب کو بہیم

ساحل جسہ کہتی ہے دنیا، سمایہ ہے طوفانوں کا
حسن ہزنی کے اندر بنقاب حسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب
دیر و کعبہ پر حقیقت تو کھلے اب الٹ سی دیکھے رخ سے نقاب
جب سفر، افسر! کبھی کرتے نہیں دیکھتے پھر کیوں ہو تم منزل کے خواب
موت ہے وہ راز جو آخر کھلیگا ایک دن زندگی ہے وہ مہما جس کا کوئی حل نہیں
جو جینا ہو تو پہلے زندگی کا مدعا سمجھے خدا تو فیق ہے، تو آدمی خود کو خدا سمجھے
ہے وہ، جس کی امیدیں ہیں خزاں پر موقوف

شاخ گل سوکھ کے گر جلے، تو کا شانہ بنے
کیف سامان کوئی مجھ سا بھی نہ ہو گا، افسر!

آنکھ جس بھول پر ڈالی، دی ہی پمانہ بنے
شے نہیں کم ہجر کے ماروں کی سحر بھی یعنی دی غفلت ہے، دی بھری ہے
اب آپ اسے دل کہیں، یاد دل کی تمنا اک آگ سی افسر! مرے سینے میں بجھ رہی ہے
جو غم حد سے زیادہ ہو، خوشی نزدیک ہوتی ہے

تھکے ہیں ستارے رات جب تار یک ہوتی ہے
ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سرا فراز فطرت کے ہر انداز سے افشا ہے یہ راز
پر داز سے مل جاتی ہے جگمگ کو تیرے تاب تار یک ہے جگمگ کا جہاں، گم نہ ہو پرداز
بے ادج سی، بے جہاں سی پھر آج ہے دنیا دیران ہے، برباد ہے، تار ادج ہے دنیا
اب منہ نہیں پزدان سے گن سننے کا، افسر! انسان سے گن سننے کی محتاج ہے دنیا

اندر حیدر آبادی، صدیق احمد

حضرت امیر مینائی (ف: اکتوبر ۱۹۰۵ء) کے شاگرد رشید فصاحت خبک جلیل مانچوری کے نام نامی سے کون اوردودان واقف نہیں ہوگا۔ وہ امیر اللغات کی ترتیب تدریس میں استاد کے دست راست تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب نظام دکن میر محبوب علی خان شہابی سند کی سیر کے لیے تشریف لائے، تو استاد داغ (ف: ۱۹۰۵ء) نے امیر مینائی کو جنھیں وہ اپنے قیام راپور کے زمانے سے جانتے تھے، بنارس کے مقام پر حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ایمان فرمایا کہ امیر مینائی حیدر آباد آئیں راپور کی ساٹھ چکی تھیں اور امیر بہت پریشان حال تھے۔ یہ تھوڑا سا سہارا ملنے پر انھوں نے پرانے اور گوناگون جسمانی عوارض کے باوجود طوعاً کرہاً دکن کا کالے گوشوں کا سفر گوارا کر لیا۔ لیکن یہ سفر حیدر آباد کا نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ جہاں حیدر آباد سے ہو کر جانا ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ وہاں پہنچنے کے چند ہی ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر اس سفر میں اپنے چچے شاگرد جلیل مانچوری کو بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد جلیل حیدر آباد ہی میں مقیم رہے، اور انھوں نے بقیہ زندگی وہیں بسر کر دی۔ داغ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کی تو ان کے بعد میر محبوب علی خان مرحوم جلیل سے شہادہ کرنے لگے اور جب ۱۹۱۱ء میں خود ان کی رحلت کے بعد اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام ہفتم ان کے جانشین ہوئے، تو انھوں نے بھی جلیل کی شاگردی اختیار کی۔ اس عہد میں جلیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدر دان شاگرد نے جاہ و منصب کے نوازے یہ

کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جلیل نے یہیں حیدر آباد میں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

صدیق احمد اثر انھیں جلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۲۲۵۵ اگست ۱۸۸۷ء (۲ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف) نومبر ۱۹۵۳ء میں وہاں طالب علم تھے، ان دونوں کا بارانہ بھی تھا۔ لکھنؤ سے فارغ ہوئے تو یہ بھی والد کے پاس حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں وکالت اور عدلیہ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ (۱۹۱۰ء) لاگچھ مدت پایگاہ وقار الامر میں عہدہ داد عدالت کے طور پر کام کیا، بعد کو ۱۹۱۵ء میں ریاست کی باقاعدہ ملازمت مل گئی اور منصف دیوانی مقرر ہوئے۔ بتدریج ترقی کر کے ناظم ضلع عدالت کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر یہیں سے ۱۹۳۰ء میں وظیفہ حسن خدمت (پنشن) پر سکد و شس ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد حضور نظام نے ادل ہتم نوشہ خانہ مقرر کیا، پھر محکمہ صرف خاص (پریوی پرس) میں منصف بنا دیا۔ وہاں کی میعاد پوری کرنے کے بعد بھی فراغت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ چونکہ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اب کوئی دفتری ذمہ داری حائل نہیں رہی تھی، اس زمانے میں انھوں نے ایک گلدستہ فصاحت "دماہانہ" جاری کیا۔ اس میں مشاہیر عہد کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جلیل کے انتقال (۱۹۴۶ء) کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم اپنی وفات (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) تک اثر سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی نگرانی بھی ان کے سپرد کر دی تھی اور اس سلسلے میں احکام بھی جاری ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظام ٹرسٹ قائم ہوا، تو محکمہ جاہ بہادر نواب میر برکت علی خان بالقابہ نے اثر کو ادبی ٹرسٹ کا صدر نامزد کر دیا۔ چنانچہ نظام مستقیم مرحوم کا کلام مرقب ہو گیا اور اب شاید زیر طباعت ہے۔

وفات سے قبل دونوں آنکھوں میں موتیا بندھا آیا تھا، جس کا آپریشن نہیں ہو سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ بنیائی بالکل زائل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کے دماغ پر پڑا اور تو اذن قائم نہ رہا؛ سو جھ بوجھ مطلق نہیں تھی۔ دماغ کا علاج آخر وقت تک جاری رہا۔ اسی حالت میں اپنے مکان جلیل منزل، حیدر آباد میں سہفتے کے دن ۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء (۳ ربیع الثانی ۱۴۰۳) فجر سے پہلے چاندی کے انتقال کیا؛ ۷۷ برس کی عمر پائی۔

خطہ صالحین (نام ملی، حیدر آباد) میں سپرد خاک ہوئے یہ سرکاری قبرستان ہے۔ اعلیٰ حضرت بر عثمان علی خان مرحوم کے عہد میں یہ قبرستان مخصوص بزرگ شخصیتوں اور عمائد سلطنت کے دفن کرنے کو استعمال ہوتا تھا، اب یہ بھی نظام چیرٹی ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ ان کے والد حضرت جلیل بھی اسی قبرستان میں آسودہ خواب ہیں۔

کتبہ مزاد کے لیے ان کے برادر خرد جناب علی احمد جلیلی نے عیسوی میں تادمخ کہی؛ وہ جو تھے صدیق احمد خوش سیر

کر گئے اس دار فانی سے سفر
بائے بسم اللہ سے مصرع ملا
(۲)

۴ ۶۱۹۷۲ = ۶۱۹۷۴

مرحوم صاحب فن تھے جلیل کی قدرت کلام اور اہارت فن ان کے متعدد نظم و نثر کے مجموعوں سے عیاں ہے۔ اثر اپنے والد کے شاگرد اور متبع تھے۔ انھیں کی طرح رموز و بشر اذکات عروض گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے جلیل کی ذفات کے بعد ان کے اکثر تلامذہ نے اثر سے رجوع کیا۔ اثر کا ضمیمہ دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن انھوں نے کہ آج تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ چند شعرا ملاحظہ ہوں، جو ان کے برادر خرد جناب علی احمد جلیلی نے عنایت فرمائے ہیں:

جان دیتا ہوں میں اس پر کہ مجھے یاد کیا	صل منظور ہو یا قتل نہیں اس سے غرض
بال دہر باندھ کے صیاد نے آذا کیا	اس سے ظاہر ہے کہ ہے شاق جدائی سیری
مجھ کو دوسرا صفت نہ کہتے یہ یاد کیا	تیرے دامن کی ہوا بھی کہ صبا کے جھونکے
ہجوم حسرت درنخ دالم میں دل نہیں ملتا	وہ دل لینے کو آئے ہیں، مگر طرہ تماشا ہے
وہ چپ یوں ہو کہ کوئی بات کے تمنا نہیں ملتا	تیری تصویر کا رازِ خموشی کیا کوئی جانے!

کہاں کھویا کہاں بھولا، خدا جانے کہاں چھوٹا
اثر! اشعار تیرے سن کے اہل ذوق کہتے ہیں

حشر کا نہکا نہ کہتے ہیں جسے
ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگے

نہ چھو سیگی جہنم کی آگ رندوں کو
پھر ایسے دیکھنے والوں سے تنگ آئے ہیں
ادائیں مست، نظر مست، چال میں مستی

دل جلوں سے بڑھ گئی رونق تھادی بزم کی
تھی نوراسی نے، مگر تیرے کرم سے ساقیا!

کہتا ہے یہ انداز گل و سرو و کسمن کا
دیر نہ گدائے درمیان ہوں ساقی!

موسم گل میں چمن گردش میخانہ ہے
وہی اچھا ہے جو ہے بزم و چمن میں آزاد

دی صدا آہ نے، جب نادر جلا د آیا
اور اک تیر یہ کہ کر مجھے اس نے مارا

کیا تو وضع ہے جو ہم کو چہ قاتل کو چیلے
جام و خم دینا سے ہر دم ہے مشناسا

کترما ہے دو عالم میں وہ حشر بیا، لیکن
ترا بھی دور کیا، لے باغباں ہے

خیال زلف میں بہتے ہیں آنسو
کہاں پہنچی ہے، مشت خاک اڑ کر

سیر منزل پہنچ کر پوچھتا ہوں
چمک اٹھیلی اب قسمت اثر کی

تھے کوچے میں کب سے ڈھونڈتا ہوں دل نہیں ملتا
غنیمت ہے یہ ناقص! جب کوئی کامل نہیں ملتا

وہ ہے میری داستانِ دردِ دل
سن رہے تھے جو بیانِ دردِ دل

جو میکدے میں ہے ڈوبا ہوا شراب میں ہے
کہ آئینہ بھی وہاں آج کل عتاب میں ہے
جو میکدے میں ہے عالمِ دی شباب میں ہے

آہ کی چنگاریاں شمعِ شبتاں بن گئیں
پیاس میں وہ چند بوندیں آبِ حیاں ہو گئیں

کیا رنگ پہ جو بن ہے عروسانِ چمن کا
ساغر ہو غنایت کوئی صہبا سے کہن کا

ہر طرف خندہ گل، خندہ ہمایا نہ ہے
گل کا بلبل، نہ کسی شمع کا پیر دانہ ہے

کے تھے اب تو قرار لے دلِ ناشاد آیا
ہو گیا دل جو نشا نہ، تو جگر یاد آیا

پیشوائی کے لیے نادر جلا د آیا
میں ہوش میں کب ساقی بیگانہ نہیں ہوتا!

پردے سے عیاں رہے جانانہ نہیں ہوتا
ففس آباد، ویراں آشتیاں ہے

اندھیرے میں رواں یہ کارواں ہے
زمین نیچے ہے، اوپر آسمان ہے

یہ تہلا دد، مری منزل کہاں ہے
جبیں اس کی ہے، سنگِ آستان ہے

مے پائے نگہ مست . رہیں ہم بیشاد طرف اتنا ترے قربان کہاں سے لائیں !
 مان لی بات دُن کی دھوکا ہو گیا مہفت میں خونِ تمنا ہو گیا
 حشر کا دن بھی بُرے خوف کا دن ہے ، لیکن

منہ دکھانا نہ ، الہی ! شبِ تنہائی کا
 حوصلہ دل کا ، : دل سے نہ جگر سے نکلا اشک بن بن کے مرے دید کا تر سے نکلا
 چھاؤ نا جیب و گریباں کا بہاد کرنے پر عاشقوں کا یہ طریقہ گل تر سے نکلا
 اتنی نسبت مری بخشش کو بہت کافی ہے تیرا بندہ ہوں ، ترا نام بیا کرتا ہوں

حضرت مہمی، مولانا بخش

کسی زمانے میں چیونٹ، ضلع جھنگ (پاکستان) میں قصابوں کی برادری بڑی با اثر اور متمول تھی، شاید اب بھی ہو۔ مولانا بخش اسی خاندان کے نورِ نظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی کبھی ال راہِ تفنن کہا کرتے تھے۔

ادنیٰ دزدانِ قصا بیم

اگرچہ سرکاری اسناد اور کاغذات میں ان کی تاریخِ ولادت ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء درج ہے لیکن دراصل یہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء تھی۔ خود لکھتے ہیں:

۱۱ مارچ پیدائش (دردغ، برگردنِ رادی) یکم جنوری ۱۹۰۸ء ہے۔ بیماری پیدائش کے اثرِ ازدحام میں اس روز بھی اور پارسِ دنیا میں تعطیل منائی جاتی ہے۔ (شعراے پنجاب ۱۲۵۰)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن چیونٹ میں پائی۔ انٹر کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائل پور حال فیصل آباد اور بی اے کا اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا۔ چونکہ طبیعت میں شعر و ادب کا مذاق تھا، اس کے بعد لاہور کے مختلف روزناموں اور ماہانہ پرچوں میں لکھنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے روزنامہ احمد اور حریت (۱۹۲۹-۱۹۳۱ء) اور اختر شیرانی مرحوم کے ماہانہ رسالوں خیالستان اور روان میں کام کیا (۱۹۳۱-۱۹۳۳ء) اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فارسی) کے سند پرائیویٹ طور پر حاصل کی۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں شام کے وقت قانون (لا) کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، تاکہ دفتر دن کے ملازم وغیرہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر قانون کے درجوں کی تعلیم

حاصل کر سکیں۔ رنجود میں نے وہاں سے ۱۹۳۳ء میں اسی طرح ایل ایل پی کا امتحان پاس کیا تھا، مولابخش نے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا اور یوں ایم اے، ایل ایل بی ہو گئے۔ اب انھوں نے چینیوٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اور رفتہ رفتہ زیادہ تر اپنی برادری کی پشت پناہی اور اثر و رسوخ سے، اور کچھ اپنی محنت اور ریاض کی بدولت، ان کا وہاں کے اچھے وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔

چینیوٹ کے اسی قیام کے دوران میں انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار پرچہ "جہاں نما" جاری کیا تھا۔ وکالت اور ادبی پرچے کی ادارت، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ چنانچہ سال بھر کے اندر پرچہ بند کرنا پڑا۔ لیکن ہے یہ کہ درحقیقت کسی مرحلے پر بھی وکالت انھیں راس نہیں آئی۔ شاید چینیوٹ کا دیہاتی ماحول بھی سبب راہ رہا ہوگا۔ کچھ ہو، ۱۹۳۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج، دھرمسالہ میں اردو فاضل کے مدرس مقرر ہو گئے۔ شکل

سے سال بھر وہاں گزارا ہوگا کہ مستعفی ہو کر اب کے لاہور میں وکالت شروع کر دی یہاں لاہور میں حکومت وقت اور ریڈیو نے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا حکمہ دیہات سدھار و پنچایت نے انھیں اپنا تعلیمی افسر مقرر کر دیا۔ اس میں جہاں انھیں پنجاب کے دیہاتی علاقے کی خاک چھاننا اور تقریر بازی کرنا پڑی، وہیں محکمے کے انجمن پنچایت کی ادارت بھی ان کے سپرد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چراغ حسن حیرت

(دف: جون ۱۹۵۵ء) کے ہفتہ وار "شیرازہ" اور مجید لاہوری (دف: جون ۱۹۵۷ء) کے "ننگران" میں مزاحیہ مضامین اور نظمیں بھی لکھتے رہے۔ سیاسی نوعیت کے مضامین "قائد" کے قلمی نام سے "روزنامہ" "نوائے وقت" میں لکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ جذباتی طور پر یونیورسٹی کالج، لاہور میں لیکچرر بھی رہے۔

انجمن سب طرف سے فارغ ہو کر پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی تھی اور اچھے وکیلوں اور قانون دانوں میں گنے جاتے تھے۔

اپریل ۱۹۷۷ء لاہور میں انتقال ہوا۔

ادب اور موسیقی گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی طبلہ بجانے میں لاہور کے چوٹی کے طبلہ نوازوں میں سے تھے؛ یہ فن انھوں نے سبقاً سبقاً اساتذہ وقت سے سیکھا تھا۔ شعر میں زیادہ توجہ طنز و مزاح اور سپرد ڈی پر مبذول رہی، اگرچہ سنجیدہ کلام بھی مقدار میں کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں مکالمہ لکھنے میں خاص مہارت تھی۔

اسی انداز کی ایک نظم "مناظرہ سازنگی و طبلہ" ملاحظہ ہو، جس میں چودھری خوش محمد ناظر کی نظم "جوگی" دشاغر کا اثر نمایاں ہے؛ بحر بھی ویسی ہے:

دنیا بھر کے بیفکر دلوں نے کل بزم سرور سجائی تھی

کیا بدل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سازنگی رنگ لائی تھی

بہل کی رگ جان منتی تھیں، طاؤس کی ماریں لرزش سے

چائے کا پیالہ دور میں تھا، حق نے دھوم مچائی تھی

زندوں نے جھنڈے گاڑے تھے، زہاد نے دیرے لے لے تھے

اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی گانے آئی تھی

یاں شکوے سے پُر سازنگی، داں بیچ و تاب میں تھا طبلہ

گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی، واں ہاتھوں کی بن آئی تھی

داں ننھا پکے ار گرجتے تھے، نمنوں کی پھہاریں پڑتی تھیں

یاں ہر دل پر موسیقی کے گہرے نے قنات لگائی تھی

اُڑتی تھیں فضا بھر میں تائیں، تھی چال صبا کی ستاں

اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعرستانہ

سازنگی بولی طبلے سے، تم یونہی شور مچاتے ہو

بے منہ پھٹ طبلے دیوانے، کیوں کان ہمارے کھاتے ہو

آواز تمھاری کوئے سی اور شکل چھلاوے سی تیری

ان میٹھی میٹھی تالوں سے، تم رنگ میں بھنگ لاتے ہو

لعنت ہے تمھارے جینے پر، آرام نہیں عزت بھی نہیں
 میں گو وں بھی ملتی ہوں، تم سراپا پڑاتے ہو
 ہے خام ابھی تک عشق ترا، کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
 یاں تان اڑی اک سٹیھی سی، داں تھام کے دل جاتے ہو
 میں راج دلاری لیلی ناری ہوں، پریم کنھیا ہوں
 تم مونڈی کاٹے مردک ہو، ہر جا پر دھکے کھاتے ہو
 تہذیب تمھیں منظور نہیں، اور عقل ترا دستور نہیں
 تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے جاتے ہو
 نازوں سے پی شہزادی ہوں، میناری محلوں والی ہو
 تم جس ددام کے قیدی ہو، ضد و قو میں ڈٹ جاتے ہو
 جب سازنگی نے طبلے سے یوں دشمنی کا کلام کیا
 کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر بھابی جاں کو سلام کیا
 یوں کہنے لگا سازنگی سے: جلتی پر تیل گھراتی ہو
 ہم رنج و الم کے مارے ہیں، تم اکرا اور ستاتی ہو
 عشاق سے یوں منہ پھیرا کیوں، پھر قے ہمیں گھیرا کیوں؟
 اپنے دوا سے چپ، مجبوراً کیوں میری زباں کھلواتی ہو
 میں زنجیوار کا شہزادہ، میدان میں اگر ضیغم سا
 جب ایک دھاڑ لگا تا ہوں، تم پردوں میں ڈجاتی ہو
 پیمان و ناجس سے باندھوں میں پاس اسی کے رہتا ہوں
 تم ہر جانی ہو، ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو
 کچھ دطف ہے سینہ کو بی بی پر کھوٹنے میں ہم مستوں کو
 بی بی یہ تو عشق کے زیور ہیں، تم یونہی ہمیں بناتی ہو
 عزت پر ہماری حرف زنی؟ اللہ غنی، اللہ غنی

وہ وقت بڑی بی بھول گئیں، جب ان اپنے کھواتی ہو
تو پریم کھنیا، محفل میں کس بیباکی سے گاتی ہے
گویوں تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو
میں تیری شہیم نغمہ کو، مانند نسیم اڑاتا ہوں
یہ میری تھاپ کی برکت ہے، دل بزم میں مٹلے جاتی ہو
جب لڑکے مل کر گاتے ہیں، عرفان کی تائیں اڑاتے ہیں
ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں، تم یاد کب ان کو آتی ہو!
میں آذر عشق کی تابش سے دل محفل کے گراتا ہوں
طاؤس کو، طبنورے کو، تجھے دن میں تارے دکھلاتا ہوں
یہ سن کر شمس الدین ڈرے، تلوار مبادا جل جائے
اور طبلہ سکتا رہ جائے، سازنگی ردتی رہ جائے
چمکارے سازنگی سے، تم سیدھی سادی بھولی ہو
زیبا نہیں، مگر منہ میں ترے گنواروں کی سی بولی ہو
طلے کے دکیل مطلق نے، داں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں، خوں کی ہنردوں سے گر محفل بھر میں بولی ہو
تم زنجیوار کے شہزادے، سازنگی، سازنگی ٹھہری
پھبتی نہیں، مگر شہزادوں کی ایسی بولی ٹھولی ہو
خاموش ہوئیں بی سازنگی، اور طبلہ صم بکم تھا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی آب کو شرم میں دھولی ہو
انقصہ بچھڑے دوست ملے، نہ جھگڑا تھا، نہ کدہ تھا
نے تن تنائن، تن تن تھی، نے تاکر تاکر بھیا تھا۔

نثار اٹاوی، نثار حسین

یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو اٹاویہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد داد لاد حسین صاحب عطر فریش تھے، اٹاویہ کے محلہ مقصود پورہ میں ان کی دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ کیٹی کے رچس میں ان کے نام کے ساتھ ولدیت کے خانے میں کپھراج (عرف چھو) لکھا ہے۔ یوں خیال ہوتا ہے کہ کوئی اُن پر ہر عورت اندراج کرنے لگی؛ اسے ان کے والد کا نام معلوم نہیں تھا، اس نے ماں کا نام لکھوا دیا۔ مگر توں بعد خود نثار صاحب نے اس کی اصلاح کر دی۔

ابتدائی تعلیم انجمن ہدایت الاسلام جوئیر ہائی اسکول میں پائی۔ آٹھویں درجے تک یہاں پڑھے۔ اس کے بعد چونکہ حالات کی عدم موافقت کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اس نے اسکول ہی میں بارہ روپے ماہرے پر مدرسہ قبول کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر شیدا اٹاوی سے اصلاح لینے لگے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مقامی اسلامیہ اسکول (حال انٹر کالج) میں ایک کل منہ شاعر ہوا تھا۔ حضرت سیاب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) بھی اس میں مدعو تھے۔ نثار نے بھی غزل پڑھی۔ سیاب مرحوم اسے سن کر چونکے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شیدا کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے نثار کو جوہر قابل پا کر انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ آخر تک سیاب کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ استاد نے بھی ان کی تہذیب تربیت میں کوئی دقیقہ فرو کرنا نہ تھا۔ نثار نے بھی ان کی تہذیب تربیت میں کوئی دقیقہ فرو کرنا نہ تھا۔ ان کا شمار سیاب کے ممتاز فارغ الاصلاح شاگردوں میں ہوتا تھا۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس ٹرننگ کی سند نہیں تھی، اس لیے جب اسکول کا سالانہ معائنہ ہوا تو سرکل انسپکٹر مدراس نے یہ بات اپنی رپورٹ میں درج کر دی۔ اس سے اسکول کی ادائیگی رقم میں تخفیف ہو جاتی۔ لہذا اسکول والوں نے انھیں نوکری سے برخاست کر دیا۔ اب یہ پریشان حال تھے۔ بارے بیدم شاہ وادٹی نے کچھ سہارا دیا۔ وہ خود مفلوک والی تھے، کتنی مدد دے سکتے تھے ابہر حال اس سے سرچھپانے کا آسرا ہو گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما "سوداگر بچہ" لکھا اور اسے بیس روپے میں فروخت کر دیا۔ اس سے انھیں کچھ حرات ہوئی اور انھوں نے ایک طویل نظم "سیر پرستان" کہی اس میں بازا دہسن اور اس کے مکینوں اور اس سے وابستہ لوگوں کا طنز یہ انداز میں خاکا اڑایا گیا ہے۔ اس پر شہر کی طوائفوں نے بہت منگامہ برپا کیا، جس سے واقع ہے کہ نثار صاحب کو بے گھر دینے پڑ گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں انھیں کچھ عشق مجازی کا بھی تجربہ ہوا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں راگرچہ میں پورا واقعہ جانتا ہوں، ان کے اس زمانے کے کلام میں اس کے نام تک کی تلمیحات موجود ہیں۔ بہر حال یہ طوفان بحیرہ دُخولی گزر گیا، بعد کے زمانے میں وہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔

بیدم وادٹی صاحب ان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی دساطنت سے بدھونہ تحصیل میں زائدا میں کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس اسامی کے لیے کچھ ذریعہ نقد بطور ضمانت جمع کرانا پڑتا ہے، اور اسی کا انتظام نہ ہو سکا، وہ اس موقع سے ناامید نہ اٹھا سکے۔ اس کے بعد بیدم صاحب ہی نے سفارش کی اور انھیں دوبارہ اپنے اسی پرانے انجمن ہدایت الاسلام اسکول میں غرضی جگہ مل گئی۔ اٹادہ کا اسلامیہ ہائی اسکول اپنے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں بعض مشاہیر کے نام ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند بھی ان میں سے تھے یہاں کے ہندو خاں الطاف حسین مرحوم، خدا بخش، بڑی خوبیوں کے فرشتہ صفت بزرگ تھے۔

انھوں نے نثار کی بے بسی کا اندازہ لگایا کہ اگر انھیں سہارا نہ ملا تو یسے بادبان کی کشتی کی طرح طوفان مصائب کا شکار ہو جائینگے۔ انھوں نے دستگیری کی اور انھیں اپنے اسکول میں جگہ دے دی۔ یہ گویا ان کے لیے شاہراہ ترقی پر پہلا قدم تھا۔ یہیں سے انھوں نے ملازمت کے دوران میں کچے بعد دیگرے انٹر، ادربی اے، اور ایم اے (اردو) کے امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ اردو کے صدر مدرس رہے اور جب یہ ترقی کر کے انٹر کالج بنا، تو صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ اپنی دنات تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے۔

انھوں نے ۶ مئی ۱۹۴۲ء کو گلے کے کینسر سے انتقال کیا۔ ایک مرحلے پر ان کے کالج کے رفیقوں اور دوستوں نے چندہ جمع کر کے ان کے علاج کی پیشکش کی، لیکن مرحوم نے اسے قبول نہ کیا۔ کہا: یہ مرض لاعلاج ہے صحت تو مجھے اب نصیب ہو نہیں سکتی، آپ حضرات کیوں اپنے گارٹھے پسینے کی کماٹی برباد کریں! ڈیڑھ برس بیمار رہے اور آخر اسی میں جان بحق ہو گئے۔ انھوں نے دذکراج کیے تھے پہلی بیوی موضع بلجھور کی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا ہوا لیکن یہ معلوم کس بات پر اختلاف ہو گیا اور انھوں نے اس بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ۱۹۴۴ء میں جالون کے ایک سفر گھرانے میں ہوا۔ اس سے چھ بچے ہوئے: چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ان میں سے صرف بڑی بیٹی (رافعہ) کی شادی اپنی زندگی میں کر سکے تھے۔ یہ بیگم اور ان کی اولاد ماشاء اللہ آدھ میں موجود ہے۔

اگرچہ نثار صاحب نے شاعری ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی، لیکن ان کا اصل دور شعر گوئی سیلاب کے تلمذ کے بعد شروع ہوا۔ اب تک وہ صرف غزل کہتے تھے، اس کے بعد نثار کے کہنے پر انھوں نے نظم پر بھی توجہ کی۔ ہندی بھی اچھی جانتے تھے (انھوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندی کا "ڈیشیس یوگیتا" امتحان پاس کیا تھا) اسی لیے انھوں نے اردو میں ہندی نپگل کے تجربے کیے۔ ان کا ایک مجموعہ "ہندی میں" دھرتی میرے پیار کی" شائع ہو چکا ہے۔ مدت ہوئی، اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب "ماہ و انجم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا (دئی ۱۹۵۲ء) یقیناً بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ہوگا۔ کسی زمانے میں کلام

بڑے دلکش انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلا انداز رخصت ہو گیا، جلد تھک جاتے تھے کسے معلوم تھا کہ یہ گلے کے کنیسر کا آغاز ہے۔

کلامِ نچتہ اور فنی پہلو سے بے عیب ہے اور بجا بلور پر وہ سیما ب کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے۔ نمونے کے پسند شروع مل نظر ہوں!

کس گوشہ ظلمت میں ہاں ہے دنیا ہے بھی کہ فقط وہم و گماں ہے دنیا
پیمانے میں تھوڑی سی جگہ ہے اب بھی لانا تو زرا کوئی کہاں ہے دنیا
زہاد کی تسبیح ریا چھوٹ پڑی آنکھوں سے امیدوں کی کرن پھوٹ پڑی
گھونگھٹ سے جو مسکرا کے جھانکا اس نے آکاش سے شرما کے دھماک ٹوٹ پڑی
سوچتے ہیں سرِ منز، یہ معنی کیا ہے! جس سے گزرتے تھے، اسی راہ گزرا تک پہنچے
جو لوگ یہاں کچھ کرنے کے، دیکھینگے وہاں کیا کرتے ہیں

امروز یہ جن کا زور نہیں، اندیشہ فردا کرتے ہیں
نا بید و قمر نے راتوں کے ماحول کو روشن کر تو دیا
وہ دیپ کسی سے جل نہ سکے جو دل میں اجالا کرتے ہیں

بادہ عشق کو ہے ہمتِ شرمِ ہاتھ اگر کانپتا ہو، جام نہ لے
شوق کتنے فریب دیتا ہے مسکرا کر ہمارا نام نہ لے
یہ بھی سچا کہ دردِ ترا کر سکے تلاش یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گزر گئے
بھٹکا سکیں نہ عقل کی منزل فریبیاں گمراہ بن سکے راہ گزرتے سے گزر گئے
نامے رہا ہے عرش پہ پہنچے تو تھے، مگر بچ کر زرا مقامِ اثر سے گزر گئے
رگِ رنگ میں ہے سرورِ محبت کا انسا اب تم حرد و قلب و نظر سے گزر گئے
آنکھوں سے دل کا کام نہ لینا تھا، اے کلم جلوے ترپ کے دامِ نظر سے گزر گئے
ہر لمحہ بڑھ رہی ہیں مرے دل کی دھڑکن جیسے ابھی ابھی وہ ادھر سے گزر گئے
حریفِ جاں سہی وہ، لیکن اس کا کیا کرے کوئی کہ اس کی دشمنی بھی دوستی معلوم ہوتی ہے
لٹا ہے دل کو تیری گلی میں سکون سا کیا اس زمین پر ظلمتِ یلگوں نہیں!

اے عقل! ساتھ رہ کہ پڑ گیا تجھی سے کام لیا ہ طلب کی منزل آخر جنوں نہیں
مجھ کو، نشانہ از غم نظر نے کیا خراب جلوے تو ہر قدم پہ کیا رکھ کر یوں نہیں
ہمیں بدل گئے ہیں کچھ، کہ گلستان بدل گیا زمیں و سی، فلک دہی، مگر سمان بدل گیا

موندے تخیل، گل کا تبسم، پر تو شبنم، بجلی کا سا یہ

دھوکا ہے دھوکا عہد جوانی، اس کو جوانی کوئی نہ سمجھے

ان کی بھی قسمت، میری بھی قسمت، دونوں میں لیکن کتنا افتاد

ان کے اشارے دنیا سمجھ لے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے

ماتا یہ ہم نے دنیا ہے فانی، فانی سمجھنا ہے نادانی

جینے کی دل میں گر ہو تمنا، دنیا کو فانی کوئی نہ سمجھے

دامن تو یہ رہا، مگر اے موسم بہار! میں سوچتا یہ ہوں کہ مری آستیں بھی تھی

زندگی کی بائے، وہ راتیں بھی کیا راتیں ہوئیں

ان سے جب چھپ چھپ کے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوئیں

لگ گئی جب چپ، تو گھنٹوں بت بنے میٹھے رہے

چھپ گئیں باتیں، تو پھر دود پر باتیں ہوئیں

یاد ہے اب تک وہ ملتھے کا پسینا، یاد ہے

ان سے جب پہلے پہل میری ملاقاتیں ہوئیں

وہ گئے وہ اپنے دانتوں میں دوڑا داب کر

آنکھوں آنکھوں میں خدا معلوم، کیا باتیں ہوئیں

ایک بجلی آسمان پر، ایک بجلی گود میں

زندگی میں بار بار ایسی بھی برساتیں ہوئیں

اے نشانہ! اب تک مرا ہر سانس ہے ہکا بکا ہوا

مذقوں اس ذلف کے سایے میں برساتیں ہوئیں

ہم کو بھی دیوانگی بھاتی نہیں، پر کیا کریں
 پھر دے گیا فریبِ تسلی کوئی مجھے
 ہاتھ اگر آجائیں خود اٹھ کر گریبانوں کے پاس
 اب صبر آچکا مجھے، موت آچکی مجھے
 تمیزِ شمع ویرد چراغِ حرم نہیں
 پردائے ہوں، نہیں بھی ملے روشنی مجھے
 صبح بچھڑ کر شام کا وعدہ، شام کا ہونا سہل نہیں

ان کی تمنا پھر کر لینا، صبح کو پہلے شام کر دو
 موسمِ گل ہے، بادل چھائے، کفناک ہے ہیں پیمانے

کیسی توبہ! توبہ! توبہ! توبہ نذرِ جام کر دو
 پوچھا کسی نے اے شاعر! مقصدِ شاعری ہے کیا؟

میں نے کہا حضورِ دوست ایک طریقِ التماس

امجد (مجید امجد) عبدالمجید

۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو پنجاب (پاکستان) کے شہر جھنگ لکھیا نہ میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد میاں علی محمد نے دوسری شادی کر لی، تو عبدالمجید کی والدہ اپنے کسین بیٹے کو ساتھ لے کر میکے چلی گئیں۔ ان کے نانا میاں نور محمد فارسی عربی کے عالم تھے۔ انھیں کئی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی عربی کے علاوہ کچھ طب بھی پڑھی۔ اس کے بعد ذاتی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مقامی اسلامیہ ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر گورنمنٹ انسٹرکٹنگ کالج، جھنگ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۲ء میں انسٹرکٹنگ امتحان پاس کر کے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کسب روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو سب سے پہلے ایک قانوننگو صاحب کی زیر نگرانی دس دہائیوں کی فہرستیں بنانے کا کام ملا جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے انتخاب کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ یہ کام عارضی تھا، اور چند مہینوں میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایمپائر آف انڈیا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ لیکن اس کام کے لیے جس محنت مشقت کی ضرورت ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں متواتر سفر ناکزیر تھا۔ صبح کہیں، شام کہیں، غرض سال بھر کے اندر اندر وہ اپنے پیشے سے دست بردار ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کی عادت شروع سے تھی اور جھنگ کے ادبی حلقوں میں بھی وہ غیر معروف نہیں تھے۔ اسی زمانے میں وہاں ایک نیم سرکاری رسالہ ”غرض“ جاری ہوا۔ اس صاحب مجاز

کی نظر امجد صاحب پر پڑی اور وہ اس کے مدیر مقرر ہو گئے۔ یہاں تقریباً دس برس
۱۹۴۵ء تک رہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومتِ دقت کسی تحریر پر غور و
سے ناراض ہو گئی؛ نزلہ روایتی عضوِ ضعیف پر گرا، اور مجید امجد کو نوکری سے جواب
مل گیا۔

صحافت کے اس تلخ تجربے کے بعد وہ ڈسٹرکٹ بورڈ، جھنگ میں بطور ایک ملازم ہو
گئے۔ یہ تعلق چار برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے محکمہ خوراک (فوڈ ڈیپارٹمنٹ)
میں جگہ مل گئی۔ وہ ملازمت کے اختتام تک اسی محکمے سے وابستہ رہے، اور ۱۹۷۲ء میں
اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی زندگی کے آخری ۲۷-۲۸ سال ساہیوال (سابقاً منٹگری) میں بسر ہوئے۔ ملازمت کے
اختتام کے بعد بھی انھوں نے یہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ ان کے والد کی دوسری شادی سے
خاندان کا شیرازہ تو بکھرا ہی تھا، مجید امجد کی زندگی شفقتِ پدری کے فقدان کے باعث
محروری اور تلخی کا نمونہ بن گئی۔ بد قسمتی سے ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی بالکل ناکام
رہی۔ ان کی شادی اپنے ماہوں کی بیٹی سے ہوئی تھی، لیکن بچہ نہ سکی، اور وہ (طلاق
لیے بغیر) ان سے الگ رہنے لگیں۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ محکمہ تعلیم میں
ملازم تھیں اور کسی ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئیں، آخری زمانے میں ان کی
بنیائی بالکل ضائع ہو گئی تھی۔

مجید امجد بالکل اکیلے رہتے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور بڑی تنگیِ ترشی سے
گزر بسر ہوتی تھی۔ ایسے جانگزا حالات میں بھی انھوں نے اپنی خودداری کی حفاظت کی،
اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ جو روکھی سوکھی میسر آگئی، بھرپور سے
اسی پر گزارا کیا۔ آخر ان کے بعض دوستوں کے توجہ دلانے پر حکومتِ پاکستان نے مارچ
۱۹۷۴ء میں ان کا پانچ سو روپے ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن اب سفینہ کنارے
آگیا تھا۔ دو مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ بھی بڑے المناک حالات میں

ان کے ساتھ ان کی ملازمت کے زمانے کا ایک پرانا چیراسی (علی محمد) رہتا تھا۔ وہ باذرا سے سودا سلفے آتا اور وقت بوقت ان کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ صبح جب وہ اپنے کام پر جاتا، تو مجید امجد کی ہدایت کے مطابق باہر سے تالا ڈال دیتا اور واپسی پر اسے کھول دیتا۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو بھی یہی ہوا۔ ۹ بجے صبح تالا بند کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن جب دو بجے واپس آیا، تو اسے ان کی جگہ امجد کی لاش زمین پر پڑی ملی۔ لاش جھٹک گئی اور اگلے دن (۱۲ مئی) وہیں سپرد خاک ہوئی۔

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زندگی میں تو کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ کہو بھی، کیسے بسر ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ساہیوال کے مشہور باغ "کنعان پارک" اور "ساہیوال ہال" کا نام بدل کر علی الترتیب "امجد پارک" اور "امجد ہال" رکھ دیا گیا۔ ہائے، اس زورِ پشیاں کا پشیاں ہونا۔ کسریٰ منہاس نے قطعہ "تاریخ وفات" کہا:۔

موت برحق ہے، مگر اک جو ہر قابل کی موت	و اے برحق، جد اہم سے مجید امجد ہوئے
کیسے کیسے دوست کسریٰ اچل دیے منہ پھیر کر	دوستی کے جتنے دعوے تھے، وہ سارے ادھوئے
چن لیا دستِ قضا نے ہر گلِ شاداب کو	زندگی پر اے فلک تیرے کرم بیکر ہوئے
عجز و ایشاد و خلوص دے ریائی کے قصو	ایک شخص ایسا تھا جس سے عمر بھر نہ ہوئے
نغمہ جس کا ہر نفس، ہر بات تھی سحرِ طلال	وہ نشانِ زندگی بھی نہ منتِ مرقد ہوئے
ایک روشن طبع تھا جس کی بدولت کتنے دوست	محفلِ شعر و ادب میں نہ منتِ مسند ہوئے
جس کے فن میں وقت کی نئے دل کی دھڑکن تھی	اس کے گیتوں میں ڈھلے، جتنے بھی جہز و ہوس

تیسویں فروری ۱۹۷۴ء مصرعِ سالِ وفات

"داخلِ باغِ جاں عبدالمجید امجد ہوئے"

(۲۱۹۷۴)

وہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن حالات کی مجبوری نے اشاعت سے محروم رکھا۔ ایک مختصر انتخاب "شبِ رفتہ" کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بقیہ کلام کا مسموط مجموعہ ان کی موت کے بعد ۱۹۷۶ء ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں، لیکن دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بہت تہ دار ہے۔ حزن و ملال کی زیریں لہر تو مونا ہی چاہیے کہ خود ان کی اپنی زندگی کہاں کی آرام آسائش اور مسرت و سرور کی زندگی تھی! لیکن جس انداز سے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، وہ سراسر ان کا اپنا ہے۔ انھوں نے زبان اور اسلوب میں بھی کئی تجربے کیے۔ افسوس کہ زندگی میں انھیں وہ مقام نہ ملا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

حسین

وہ شام صبح دو عالم تھی جب بسر حد شام
متابع کون و مکان تجھ شہید کا سجدہ
رک کا تھا آ کے تراقا فلہ، ترے خیام
زمین کرب و بلا کے نازیوں کے امام
یہ کتہ تو نے بتایا، جہان دلوں کو
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اک گام
سوار مرکبِ ددشیں رسول، پور تبول
چراغِ محفلِ ایمان، ترا مقدس نام

زمین

وہ قتل گاہ وہ لاشے، وہ بکیوں کے خیام
وہ رات جب تری آنکھوں کے سامنے لڑنے
یہ کون جان سکے، ترے دل پہ کیا گزری
ستم کی رات کی کالی قنات کے چمھے
تری ہی برقِ صدا کی کرد کے کان پہ لگے
وہ شب، وہ سینہ، کونین میں غموں کے خیام
مرے موؤں کی صفوں میں ڈھے ہوؤں کے خیام
مے جب آگ کی آندھی میں غمزدوں کے خیام
بڑے ہی خیمہ دل میں تھے عشقوں کے خیام
یہ زیرِ چترِ مطلق، شہنشاہوں کے خیام

جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی بودا

اکھر چکے ہیں ترے خیمہ افکنوں کے خیام

کیا کیسے کیا حجابِ حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
 اک چہرہ، اس پہ لاکھ سخن تاب نہ گھٹیں
 اے غم! انیس دل! یہ تری دل لڑا زیاں
 ہے، وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں عید
 اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دام پر
 ابجد! طریقے میں ہے یہ احتیاط غریب
 اک بوڑا درمڑ کے چوڑیکھا، زمانہ تھا
 اے جرات نگہ! تری قسمت میں کیا نہ تھا
 ہم کو تری خوشی کے لیے مسکراتا تھا
 میں ان کو دکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا
 میں اپنی زندگی انھیں دے دوں، جو ہن پر
 آگ داغ بھی کہیں نہ میرا ہن پرستے

بہار

ہر بار اسی طرح سے دنیا
 سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
 مسروں کی کلی کی زرد موت

تھا ہے جسے خم ہوانے

ہر بار، اسی طرح سے شاخیں
 کھلتی ہوئیں کوئلیں اٹھائے
 رستوں کے سلاخوں سے لگ کر

کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں
 پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
 آتی ہیں مانتوں پہ پھیلے

ہاں بے کے درق کو ٹھن ٹھناتے

ہر سال، اسی طرح کا موسم
ہر بار ایسی مہکتی دودی
ہر صبح، یہی کھوہ آسنو

روئے کے کب آئیں گے زمانے!

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانگے پہریدار
گھنے، سہانے، چھانچھڑکتے، بوندے چھتنا
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے انجدار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طاسم
قاتل تیشے چیر گئے ان سادنتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پڑوں کی نیلی دیوار
کٹے ہیکل، چھٹے پنجر، جھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب اکاری ضرب اک، اے آدم کی آل

اب یہ مسافت تیسے طے ہو، اے دل تو ہی بنا
چیت آیا، چیتاؤنی بھی اپنا دھن بھنا
کتنی عمرادر گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا
پت جھڑائی، پتر لکھے، آجیون بیت چلا

خوشیوں کا مکھ چوم کے دکھا، دنیا مان بھری
اپنا پیکر، اپنا سایہ، کالے کوس کھن
اپنے گرد، اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی
کانچ کی اک دیوار زمانہ، آگنے سامنے ہم
راہیں دھڑکیں شاخیں کو دیکیں اک اک سرائی
دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے اس کس کی تینے
جنون عشق کی رسم عجیب، کیا کہتے!
آخر کوئی کنارا، اس سیل بیکراں کا
شاید ادھر سے گزرے پھر بھی تر اسفینہ
یہ کیا عجیب راز ہے، سمجھ سکوں تو بات ہے
مری تباہیوں کا بھی فائدہ کیا فائدہ ہے!
چراغ بجھ چکے، تینگے جل چکے، سحر مونی
دل سے، ہرگز وہی بات گزری ہے
چاندنی، نیم وادریچہ، سکوت

دکھ وہ سچ کٹھور کہ جس کو روضہ کرے سہرا
دوری کی جب شکست لڑتی، کوئی قریب تھا
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب دکھ لیا
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا
بولی تو اک اک کی دیسی، بالی سب کی جدا
میں ان سے دور، وہ مجھ سے قریب، کیا کہنا
آخر کوئی مددوار، اس درد زندگی کا!
بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا
نہ اب وہ ان کی بیرخی، نہ اب وہ التفات ہے
نہ بھلیوں کا تذکرہ، نہ آشاں کی بات ہے
مگر ابھی مری جدائیوں کی رات رات ہے
کس قیامت کی رات گزری ہے
آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ریاض النزاری، ریاض الدین، قاضی

ان کا آبائی وطن ضلع بلندشہر (یوپی) کا قصبہ جیور تھا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں نیل کی کاشت بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، اور یہ بہت نفع مندرکار و بار تھا۔ وہاں کے قاضی رفیع الدین صاحب بھی نیل کی آٹھ کوٹھیوں کے مالک اور اپنے علاقے کے متمول زمیندار اور رئیس تھے۔ لیکن یورپ سے مصنوعی نیل کی درآمد شروع ہوئی تو اس دہی تجارت کو بھی گھن لگنا شروع ہو گیا۔ کساد بازاری کے باعث رفتہ رفتہ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ جب ان کے بیٹے قاضی حسام الدین ان کے وارث ہوئے تو خاندان کی شان و شوکت میں بہت کمی آچکی تھی۔ لیکن وہ منہ میں روایتی چاندی کا چمچ لیے پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کے لیے بدلے حالات سے سمجھوتا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ رہی سہی کسر شاعری نے پوری کر دی؛ آزاد و تخلص کرنے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسام الدین کا سارا وقت بارہاشی میں گزرتا اور ان کی اولاد نے خاندانی عظمت کے افسانوں کے سوائے اور کچھ نہ پایا۔

قاضی ریاض الدین انھیں قاضی حسام الدین کے دوسرے بیٹے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں جیور میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کا ابتدائی نصاب وطن میں بنی طور پر پورا کیا۔ گھر کا جو رنگ تھا، اس میں ان کی مزید تعلیم کی طرف کسی کو توجہ نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی قاضی عزیز الدین رخشاں جو پہلے سے نقل مکان کر کے اپنے ماموں کے پاس گوالیار چلے گئے تھے، جیور آئے اور چھوٹے بھائی کو اپنے

ساتھ لوالے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہو گئی۔

گوالیار میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں دسویں کی اور ۱۹۱۸ء میں انٹر کی سند حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں انفلوینزا وبائی شکل میں پھیل گیا تھا۔ بلا مبالغہ لاکھوں جانیں اس مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اسی میں نواذی عزیز الدین رخشاں بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ والد کا انتقال اس سے تین چار سال قبل ہو چکا تھا، اب بڑے لہجائی کی دائمی مفارقت کے بعد وہ بالکل بے بار و مددگار رہ گئے۔ اس لیے آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا کیا امکان تھا، بلکہ مرحوم لہجائی کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے ناتوان کندھوں پر آپڑی، جس نے انہیں ملازمت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے مقامی گورنمنٹی ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی تین چار برس کے علاوہ ان کا سارا زمانہ ملازمت اسی اسکول میں گزرا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

تعلیم کا سلسلہ انھوں نے حالات کی مجبوری سے منقطع کیا تھا، نہ کہ اپنی خوشی سے۔ جب حالات موافق ہوئے تو انھوں نے اس کمی کے پورا کرنے کی از سر نو کوشش کی۔ ۱۹۳۰ء میں بلا تنخواہ رخصت لی اور چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں رہ کر بی اے سے لے کر ایم اے (اردو فارسی) اور بی ٹی تک کے امتحان پاس کئے۔

۱۷ برس کی عمر تھی، جب انھوں نے ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کا پہلا شعر تھا،

بوجھ تم سے جب سنبھل سکتا نہیں تلوار کا

کیا کرو گے خون تم دس بیس کا، دو چار کا!

یہی زبان کی طرف رجحان ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی نے انھیں نوح

ناروی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کا تمنا اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ ۶۰ برس کی مشق

میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

اردو کے عاشق تھے۔ بزم اردو، گوالیار گویا انھیں کے دم سے زندہ تھی! ۱۹۱۹ء

۱۹۷۲ء تک اس کے سکتر رہے۔ اس بزم کے اہتمام میں جو شاندار کل ہند شاعرے ہوتے، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان کا انتظام مرحوم خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کی طویل اور کامیاب مدرسی کے اعتراف میں ۱۹۷۴ء میں ریاست نے انھیں انسپکٹر مدارس کی اسامی پیش کی مرحوم نے یہ پیشکش قبول کرنے سے اس لیے موزرت کر دی کہ ان کے چلے جانے سے گورکھی اسکول میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام باقی نہیں رہیگا اور ممکن ہے کہ اس پر یہ درجہ ہی بند کر دیا جائے۔

ان کی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان ہی کی تھیں، ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نہیں نوازا تھا، لیکن میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ اس کی دائمی جدائی کے بعد بچہ کے رہ گئے۔ مختلف امراض نے آگھیرا۔ دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا، اس سے تویح نکلے، مگر تا بجے ۲ جون ۱۹۷۴ء کو اچانک فالج کا حملہ ہوا، اور بایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ فشار دم کا عارضہ پہلے سے تھا، دماغ کی نس پھٹ گئی۔ بارہ دن تک مقامی جے آر وگیا اسپتال میں بیہوش رہنے کے بعد ۹ جولائی ۱۹۷۴ء علی الصبح تین بجے جان بحق ہو گئے۔ اسی دن ظہر کے وقت کربل حسن خان ولے قبرستان، کمپو لشکر گوالیار میں اپنی مرحومہ بیوی کے قریب دفن ہوئے۔

فیاض احمد خان فیاض گوالیار کے قلعے میں تاریخ کا شعر ہے :

کہا ہاتھ نے سینہ چاک کر کے

ریاض خلد ہے جاگسیر ان کی

(۱۹۷۵ - ۱ - ۱۹۷۴ء)

ان کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر مختلف رسالوں میں مطبوعہ غزلوں سے انتخاب کر کے دیے رہا ہوں۔ زبان کی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔

انہیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے یہ قصہ اب فسانہ ہو گیا ہے

محبت نے ہماری جان لے لی _____ قضا کا تو بہانہ ہو گیا ہے

ہجومِ غم نے یوں احساس کو میرے مٹا ڈالا

مصیبت بھی مصیبت اب نہیں معلوم ہوتی ہے

کہانہ سخاکہ محبت کا ہے بُرا انجام _____ بس اب تو اے دلِ خانہ خراب! دیکھ لیا

نہ وہ ہیں، نہ دل ہے، نہ قسمت نہ دنیا محبت میں کوئی ہمارا نہیں ہے

خدائی بھی ان کی، زمانہ بھی ان کا نہیں ہے تو کوئی ہمارا نہیں ہے

وہ ہوں نامراد تمنا جہاں میں جسے موت کا بھی سہارا نہیں ہے

کہاں کی دوستی کس کی محبت، کیسی غمخواری

یہ اندازِ خلوصِ درد منداں دیکھتے کیا ہوا!

نہ کیوں دیکھو خلوصِ باہم اربابِ میخانہ

یہ فرسودہ نزاعِ کفر و ایمان دیکھتے کیا ہوا!

حیاتِ غمگین کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کر لوں

خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم ہی کو سازگار کر لوں

ارادۂ ترکِ عشق و الفت تو، ہمیشہ میں ہزار کر لوں

جو یہ میرے اختیار میں ہو، تو میں اسے اختیار کر لوں

آج یہ گھر سے مرے کون ہوا ہے رخصت! کیوں فرسودہ در و دیوار نظر آتے ہیں

تیری جنت میں، نہ واعظ ہیں نہ زاہد یا بابا! یہ تو دنیا کے گنہگار نظر آتے ہیں

کسی کا سنگِ در ہے، اور میں ہوں یہ میرا دردِ دیر ہے، اور میں ہوں

محبت دیکھ لی، اہلِ وطن کی ریاض! اب اپنا گھر ہے، اور میں ہوں

یہ دو جہلوں میں ہے روادِ غم، بیمارِ الفت کی

جو دن ہے وہ مصیبت کا، جو شب ہے وہ قیامت کی

بجائے تو نے جو، اے ناصح مشفق! نصیحت کی
مگر جب چین بھی دے بیٹھی، دردِ محبت کی
کوئی کمبخت ہی اب رکھ سکیگا دل کو قلوب میں
جوانی، وہ بھی ان کی! اور وہ بھی اس قیامت کی!

ریاض! اس کا چھپانا محال ہے کہ یہ عشق نہ راز بن کے رہیگا، نہ راز ہو کے رہا

دنیا ہے الگ اوروں کی، مرے فن کا جہاں اور
رنگ اور، روش اور، بیاں اور، زبان اور
بے اُن کے، نہ رُت وہ، نہ سماں وہ، نہ فضا وہ
وہ تھکتے تو فضا اور تھتی، رُت اور، سماں اور
اقرار میں انکار ہے، انکار میں اقرار
ان شوخِ حسینوں کی نہیں اور ہے، ہاں اور

دید ان کی سہل ہی سہی ممکن مگر کہاں!
ذوقِ نظر بھی ہو تو مجالِ نظر کہاں!
ہر چیز میں ہے پُر تو حسن و جمالِ دوست
لیکن ہر اک نگاہِ حقیقت نگر کہاں!
جا تو رہا ہوں جوشِ جنوں میں کہیں، مگر
لے جا رہا ہے جوشِ جنوں، کیا خبر، کہاں!
محوِ طلب کو جوشِ طلب میں کہاں یہ ہوش
منزل کہاں ہے، راہِ کدھر، راہبر کہاں!

یہی دنیا، یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہونگے
یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی! ہم کہاں ہونگے!
اب آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا، کل کی خبر کیا ہے
نہ جانے تم کہاں ہونگے، نہ جانے ہم کہاں ہونگے

غم ہستی، غم الفت، غم دوراں ہو کر
 غم بہر رنگ رہا، زلیست کا عنوان ہو کر
 کر لیا ضبط غم عشق بھی بالفرض، ریاض!
 رہ سکو گے غم دوراں سے گریزاں ہو کر؟

غم دل کا نگہبان ہوا جاتا ہے ہر وقت کا مہمان ہوا جاتا ہے
 اس دور کی کشمکش الہی! توبہ انسان، پریشان ہوا جاتا ہے

کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی یگانہ نہ رہا
 کوئی مسکن نہ رہا، کوئی ٹھکانہ نہ رہا
 دن وہی رات وہی، صبح وہی شام وہی
 ہم وہی ہیں، مگر اپنا وہ زمانہ نہ رہا
 نہ امنگیں، نہ ترنگیں، نہ مسرتیں، نہ امید
 یہی جینا ہے، تو اس جینے میں کیا رکھا ہے!
 یہی کہتا ہے، ہر اک دیکھ کے صورت میری
 تو نے، کمبخت! یہ کیا حال بنا رکھا ہے!

محمد حسین حسّان

ان کا خاندان دراصل سہسوان کا رہنے والا تھا، لیکن خود ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں پبلی سبھیت میں ہوئی۔ والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا نام محمد بنی جان تھا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرستہ اسلامیہ بریلی میں عربی پڑھی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں چلے آئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ۱۹۳۰ء-۱۹۳۱ء میں کانگریس کی نمک سازی کی تحریک میں شرکت کے باعث جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور پھر اس طرف توجہ نہ کر سکے بہر حال اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ انگریزی کتابوں سے باسانی استفادہ کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی کانگریس نے اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں خبرنامے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اردو کے نگران اردو دار شفیق الرحمن قدوائی مرحوم (ف: اپریل ۱۹۵۳ء) تھے اور انگریزی کے رگھونندن سرن، بی اے (کینب) (ف: دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ قدوائی مرحوم نے اردو خبرنامے کی ترتیب و تدوین میں محمد حسین حسّان کو اپنا معاون مقرر کیا۔ یہ خبرنامہ سو فی سال بھر شائع ہوتا رہا تھا۔ جب قدوائی صاحب گرفتار ہوئے، اور قید خانے بھیج دیے گئے، تو چندے بعد خود حسین حسّان صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حوالات کے زمانے میں پولیس نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ مطالبہ یہ تھا کہ بتاؤ، یہ خبرنامے کس چھاپے خانے

میں چھپتے ہیں؟ (یہ ایک دلچسپ داستان ہے کہ رگھوناتھ سرن صاحب ان کی طباعت کے لیے کیا کیا پاڑ پیلے تھے۔ کیونکہ کوئی مطبع ان کے چھاپنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا)۔ حسان صاحب نے سب سختیاں برداشت کیں، لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولے۔ بالآخر قید کی سزا ہوئی۔

قید سے رہائی کے بعد وہ مکتبہ جامعہ میں ادبی معاون مقرر ہوئے اور بعد کو ”پیامِ تعلیم“ کی ترتیب ان کے سپرد کر دی گئی۔ ”پیامِ تعلیم“ شروع میں بچوں کا رسالہ نہیں تھا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خان (ف: دسمبر ۱۹۹۲ء) اور عبد المجید خواجہ بیرسٹر (ف: دسمبر ۱۹۹۲ء) کے ایما پر ذاکر صاحب مرحوم (ف: مئی ۱۹۹۹ء) اور ڈاکٹر سید عابد حسین مدظلہ نے ۱۹۹۶ء میں جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ہی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس کا مقصد عوام کو جامعہ ملیہ کے کاموں سے باخبر رکھنا اور انہیں نئے نئے تعلیمی مسائل اور تجربات سے مانوس کرنا اور ان کی طرف ترغیب دلانا تھا۔

جب محمد حسین حسان مدیر معاون ہو کر آئے، تو انہوں نے بہت خاموشی سے اسے آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ اس زمانے میں خالص بچوں کے لیے اچھے معیار کا قابل مطالعہ مواد بہت کم تھا۔ ذاکر صاحب مرحوم کو بچوں کی تربیت سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حامد علی خان (ف: ۱۹۹۳ء) مکتبہ جامعہ کے منیجر تھے۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ بلا کی تھی۔ انہوں نے اس خوشگوار تبدیلی کو مالی مفاد کے پہلو سے جانچا۔ غرض دونوں نے محمد حسین حسان صاحب کے کام کی تحسین کی؛ اور ”پیامِ تعلیم“ نے بہت جلد اس صنف کے صفِ اول کے پرچوں میں اپنی جگہ بنالی۔ حیدر آباد اور کشمیر کے محکمہ تعلیم میں یہ منظور شدہ فہرست میں شامل ہو گیا، اور ان دونوں ریاستوں کے مدارس کے لیے اس کی سرکاری خریداری منظور ہو گئی۔ اس سے اس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی؛ اسی کی حامد علی خان مرحوم کو توقع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں اس

کے مضمون نگاروں میں خود ڈاکٹر صاحب کے علاوہ، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بھی ملتے ہیں۔ شیخ الدین نیر کا بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نام اسی زمانے میں چمکا۔ آج کے بعض مشہور لکھنے والوں نے مضمون نگاری کی ابتدا پیام تعلیم ہی سے کی تھی۔ اس کے سالناموں اور خاص نمبروں کا بھی اس دور میں بہت شہرہ تھا؛ بلکہ اس کی یہ خصوصیت تو آج تک قابلِ لحاظ ہے۔

محمد حسین حسان صاحب نے لکھنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کیا، بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پہلے۔ مدتوں ان کے مضامین الناظر (لکھنؤ)، نقیب (بدایون)، زمانہ (کانپور)، شمع (آگرہ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے شروع میں زیادہ توجہ عربی مضامین کے تراجم پر رہی۔ ان کا ایک طویل مضمون ”محمود غزنوی کی بزمِ ادب“ بالاقساط جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ بیان ان کے اصلی جوہر پیام تعلیم کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ انھیں سہل ممتنع اور سلیس زبان اور روزمرہ پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند اور ناپسند کا انھیں گہرا شعور تھا۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ یہ بہت مقبول ہوتیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب آنحضرت صلعم کی سوانح عمری ”سرکارِ دو عالم“ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے کہ اب تک اس کے ۱۸-۱۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں؛ یہ کسی زمانے میں ریاست میسور کے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔ ان کی دوسری کتاب ”دنیا کے بچے“ کا بھی یہی حال ہے؛ اس کے بھی ۱۵-۱۶ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک اور کتاب ”نامورانِ اسلام“ تھی؛ اس پر انھوں نے بہت محنت کی تھی اور اس کا مواد بڑی تحقیق سے فراہم کیا تھا۔ پچھنے سے پہلے مسودہ ڈاکٹر ڈاکٹر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (فدائے نوہر ۱۹۵۳ء) کو دکھایا تھا تا کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ رہ جائے۔

یہ تقسیم سے کچھ قبل (غالباً ۱۹۲۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ میرے علم میں تقسیم کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ وہ اس پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ اس کا مسودہ یقیناً محفوظ ہو گا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ یا دایا، ان کی ایک اور مفید اور معلوماتی کتاب ”ہماری زمین“ بھی تھی۔ اس میں مختلف مآخذ سے سائنسی کوالف جمع کر کے یکجا کر دیے ہیں کہانی کے پیرایے میں؛ بڑے کام کی چیز ہے۔

تقسیم ملک کے ساتھ مکتبہ جامعہ پر بھی ابتلا آئی۔ پیام تعلیم بند ہو گیا۔ جب جامعہ ملیہ کے دفاتر اٹھلا آئے، تو انھوں نے کوشش کی کہ اسے دوبارہ جاری کیا جائے، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اسی زمانے میں جامعہ نے ایک ادارہ ”تعلیم ترقی“ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد بالغوں کے لیے لٹریچر پیدا کرنا تھا۔ حسین حسّان صاحب اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس جگہ انھوں نے جہاں دوسروں کے مسودوں پر نظر ثانی کی اور انھیں اشاعت کے لیے تیار کیا، وہیں خود بھی بہت کچھ لکھا۔ اس میں سے کچھ چھپ گیا، کچھ مسودوں کی شکل میں رہ گیا (اور اب تک غالباً دیمک کی نظر ہو چکا ہو گا) ”الزام کس پر؟“ ”آستین کا سانپ“؛ ”لٹی دوا“؛ ”برف کا گھر“؛ ”چاند“؛ ”تاؤ کے ایڈیشن“؛ ”زمین کے سجائی بہن“؛ ”رامونے پڑھنا سیکھا“؛ ”دیمک“؛ ”کتنی زمین“ وغیرہ۔ یہ کتابیں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۳ء میں پیام تعلیم دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو ترتیب کے لیے قرعہ فال پھر ان کے نام پڑا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے۔ صحت بہت دن سے سفیم چلی آرہی تھی۔ دے کا عارضہ تھا۔ بہت ہی نحیف و نزار ہو کے رہ گئے تھے۔ اگر کثیر العیالی اور سخی مجبوریاں دامیگر نہ ہوتیں، تو وہ کب کے ان جھیلوں سے الگ ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہندوستان کے ادیب کی قسمت میں آرام صرف کنارِ لحد میں لکھا ہے۔ اسی حالت میں ۱۲ جولائی ۱۹۷۲ء

کو اسٹھیں حبس بول کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ اس پر وہ اسپتال میں داخل ہوئے۔
لگے دن ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء (دس مول چنڈا اسپتال میں) صبح ساڑھے چھ بجے
کے قریب حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن ظہر کے بعد جامعہ
ملیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میراثاتی تعلق ان سے ۱۹۳۶ء سے تھا۔ اور میں نے عربی کا پہلا سبق اسٹھیں
سے پڑھا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے دوسرے عملے کے ساتھ وہ بھی
ٹرول باغ میں رہتے تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے بھی کرایے کا مکان اسی
جگہ لے لیا۔ جب ان سے خاصا ربط ضبط پیدا ہو گیا تو ایک دن میں نے ان
سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بچہ خندہ پیشانی سے اس پر تیار
ہو گئے۔ چنانچہ میں نے بمبئی سے ابتدائی نصاب کی کتابیں (القرآن الرشیدہ
کے چاروں حصے منگوا لیے۔ ان میں سے پہلے دو یا تین میں نے ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء
کے جاڑوں کے چار پانچ مہینوں میں سبقاً ان سے پڑھے تھے۔

پہلی بیوی سے ایک لڑکی یا دو گار تھی۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے (حسب،
شعیب، نجیب، شکیب) اور تین بیٹیاں (صفیہ، ریحانہ، فرزانہ) ان کے
سوگواروں میں ہیں۔

اب کہاں ملیں گے، اس محبت اور ذوقِ علم کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ اسٹھیں کر دے
کر دے جنت نصیب کرے۔ آمین!

ساغر صدیقی، محمد اختر

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "میری ماں دلی کی تھی، باپ پٹیالے کا، پیدا امرتسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری، میں بھی عجیب چوں چوں کا مرتبہ ہوں،" اس قول میں صرف ایک معمولی سی غلطی کے سواے اور سب سچ ہے۔

در اصل ان کا خاندان انبالے کا تھا، اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء تھا۔ گھر میں ہر طرف افلاس و نکبت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انھیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھیں سے۔ اس کے بعد شاید ورنیکلر مڈل کے کچھ درجے بھی پاس کر لیے ہوں۔ ایک دن انھوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر امرتسر کی راہ لی، اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے، جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انھوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑ رہتے۔ لیکن شعروہ اس ۱۴-۱۵ برس کی عمر ہی میں کہنے لگے تھے، اور اپنے بیشکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں تخلص ناصر حجازی تھا۔ لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ساغر صدیقی ہو گئے۔

ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال امرتسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ "لڑکا" (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انھوں نے منتظمین سے کہہ کر اسے مشاعرہ میں پڑھنے کا موقع دلوا دیا۔ ساغر کی آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترنم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ بس پھر کیا تھا، اس شب اس نے صحیح معنوں میں مشاعرہ لوٹا لیا۔

قدرتاً اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے کنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست اسباب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مزید تنگ و دو کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بیشک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا، لیکن اُسے اُن کی کیا پرواہ تھی، اس نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لیے لطیف انور گورداسپوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ امرتسر سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینما فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے حیرتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا (ابن حکیم احمد شجاع مرحوم) تھے، جو پاکستان میں فلم سازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغر کی زندگی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامت اعمال سے

حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور اخیر میں صحیح معنوں میں رقیع عبرت بن گیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے سرور و اور انجمن لال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے تعلق خاطر کا اظہار کیا اور خاص بہدر دی سے انھیں مار فیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سرور و اور انجمن لال تو دور ہو گیا، لیکن اس معمولی واقعے نے ان کے جسم کے اندر نشہ بازی کے تناور درخت کا بیج بو دیا۔ بد قسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا لکھوں!) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ اولاً بھنگ اور شراب اور ان سے گزر کر افیون اور چرس کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھنگ جائے اور توفیقِ ایزدی اس کی دستگیری نہ کرے، تو پھر اس کا تحت الشریعہ سے ادھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انھیں چرس کی پڑیا اور مار فیا کے ٹیکے کی شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جاتے، اپنے نام سے پڑھنے اور چھپواتے اور سببیت شاعر اور گیت کار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اواروں کے کرنا دھرتا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے، جب تک وہ ان کے درِ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی

اور دنیا بزاری اور ہر وقت "بخود" رہنے کی خواہش میں اضافہ کیا۔ اور وہ بالکل آوارہ ہو گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ کبھی وہ ننگ ہٹنگ ایک میلی کچیلی چادر اڑھے، اور کبھی چیخڑوں میں ملبوس، بال بھرائے تنگے پاؤں — منہ میں بیڑی یا سگریٹ لیے سڑکوں پر پھرتا رہتا اور رات کو نشے میں ڈھلتا، مدہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کسی دوکان کے خٹڑے یا تخت کے اوپر یا نیچے پڑ رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہو گئی کہ کہیں کوئی اچھے وقتوں کا دوست مل جاتا، تو اس سے ایک چوٹی طلب کرتا۔ اس کی یہ چوٹی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً جیب سے چوٹی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پہنچے، اور علیک سلیک کے بعد مصافحہ کرنے وقت، چوٹی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہو جاتا۔ یوں تمام تک جو دس بیس روپے جمع ہو جاتے، وہ اس دن کے چرس اور ماریفا کے کام آتے۔ فاعتر وایا ولی الالبصار۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا علاج کبھی چرس اور ماریفا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بہت حد تک نجات مل گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور یہ آخر تک دوسرے تیسرے جاری رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں آجبا وہ کسی سے چوٹی نہیں مانگیگا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی، اور دوستوں نے لے جا کر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزدانی جالندھری نے قطعہ تاریخ وفات کہی :

ساغر نے رختِ زیست جہاں سے اٹھایا افسردہ اس کے غم میں ہیں بارانِ انجمن
وہ شہر پارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا نظمیں سنجیں جس کی منظرِ معراجِ فکر و فن

ففتوں میں جس کی جذبہ حب رسول تھا غزلوں میں جس کی حسن و جوانی کا بانگین
یرذانی حزیں نے لب جام رکھ کے ہاتھ تاریخِ رحلت اس کی کہی "ساغر سخن"

(۱۹۷۱-۱۹۷۲ء)

(۳)

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنفِ سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ خود
تو اسے کیا چھپواتا، ناشرین نے اپنے نفع کی خاطر اسے چھپا لیا، اور اسے معاوضے
میں ایک حبیہ تک نہ دیا۔ چھ مجموعے اس کی زندگی میں لاہور سے چھپے، غم بہار
نہ ہر آرزو (۱۹۷۲ء) لوحِ جنون (۱۹۷۱ء) اور سبز گنبد اور شبِ آہی (۱۹۷۲ء)
یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے، تو ایک اور مجموعے کا مواد آسانی سے ہوتا
ہے۔ ساغر کا کلام بہت جاندار ہے اور زندہ رہنے کا مستحق۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کر دوں، جس سے مشہور
یونانی فلسفی دیوجانس کلیبی کی روایت تازہ ہوتی ہے:

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا۔ جرنیل محمد ایوب (ف: اپریل
۱۹۷۲ء) برسرِ اقتدار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان، جن کی
باہمی چپقلش اور رستہ کشی سے عوام تنگ آچکے تھے، حرفِ غلط کی طرح فراموش
کر دیے گئے۔ لوگ اس تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا
اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا:

کیا ہے صبر جو ہم نے، ہمیں ایوب ملا

یہ نظم جرنیل محمد ایوب کی نظر سے بھی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ
لاہور آئے، تو اسٹھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں
جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور خفیہ پولیس اور نوکرتا ہی کا
پورا عملہ حرکت میں آگیا اور ساغر کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن صبح سے شام تک
کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کوئی سٹھور ٹھکانا تو تھا
نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لائے۔ پوچھ گچھ کرتے کرتے ہر شام پولیس نے اسے

ایک پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا؛ وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں تو امیر زیادہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی باجیہ کھل گئیں کہ شکر ہے ظلم سبانی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ انھوں نے قریب جا کر ساغر سے کہا کہ آپ حضور صدر مملکت نے یاد فرمایا ہے۔ ساغر نے کہا: بابا، ہم فقروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بیچارہ پریشان کرے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کر کے تو لے نہیں جاسکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اور اسے کوئی ایسی ہدایت بھی نہیں ملی تھی، جرنیل صاحب تو محض اس سے ملنے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ ”پگلا شاعر“ یہ عزت افزائی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے زچ ہو کر اس سے کہا: ارے صاحب، مجھے گورنر ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دینگے، دوسو، چار سو، فقروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے جب وہ اس پر بھی نہ ٹلا تو ساغر نے گلوری کالے میں دبائی اور زمین پر پڑی سگرٹ کی خالی ڈیا اٹھا کر کے اُسے کھولا۔ جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو ارد گرد خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ کاغذ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا: یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائینگے۔ اور اپنی راہ چلا گیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو تیر سے صحبت نہیں رہی

ایک نغمہ، ایک غنچہ، ایک تارا، ایک جام اے غمِ دوران، غمِ دوران! تجھے میرا سلام

ہم بنائینگے یہاں، ساغرِ انبیٰ تصویرِ شوق
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام

گیت اس عہدِ پتکلف میں
بربط و جنگ و نے کو ترسے ہیں

ساقیلا ترے بادہ خانے میں
نام ساغر ہے، نے کو ترسے ہیں

چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
نراقاب اٹھاؤ، بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہونے ہیں خورشیدِ آسینوں میں
اسفیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمھاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے

خدا ز عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بنام زہرہ جبینانِ خطہ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ساغر کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہاں خراب ہیں

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ہم الٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں

یوں چمکتے ہیں شاخ پر غنچے
جیسے ان کے سلام آتے ہیں

رہبروں کے صنیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیڑا ہے

معبودوں کے چراغ گل کر دو
قلبِ انسان میں اندھیرا ہے

میں بھی جنت سے نکالا ہوا اک بت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق! تجھے کیسے ستم آتے ہیں!

ہاں ہیں نے لہو اپنا گلستاں کو دیلا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

صبح و بچھا، شکوے تھے ٹوٹے ہوئے
گل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی

اے ستاروں کے چاہنے والے
آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں

رونی جشنِ رنگ و بو کے لیے
زخم حاضر ہیں، داغ حاضر ہیں

تشنگی تشنگی، اسے توبہ !
 اے خداوندِ کوثر و نسیم !
 کچھ نہیں مدعا فیروں کا
 تیرے قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
 کون ہے آشنا فیروں کا
 دروہے لا ودا فیروں کا
 اپنی تنہا بیویں پہ ہنستے ہیں
 ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
 ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
 ہر شناور کو نہیں ملتا، تلاطم سے خسراج
 ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں
 ہر سبھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
 ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں
 ہاے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر !
 ہاے یہ عالم کہ تو دل سے جبرا ہوتا نہیں
 زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقفِ منزل !
 زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں
 آوارگی بزرگ تماشا بُری نہیں
 فراقِ نظر ملے، توبہ دنیا بُری نہیں
 کہتے ہیں تیری زلف پریشاں کو زندگی
 اے دوستِ زندگی کی تماشا بُری نہیں
 ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکر میں
 اتنی حدیثِ ساغر و بادہ بُری نہیں
 یاد رکھنا ہماری تربت کو
 قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

جمالی، طفیل احمد

ان کا خاندان دراصل الہ آباد کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، جہاں اس زمانے میں ان کے والد محمد اسحاق صاحب مقامی جیل خانے کے مہتمم تھے۔ وہ وہاں بہت لمبا عرصہ تعینات رہے تھے۔ چنانچہ جمالی کی ابتدائی تعلیم بنارس ہی میں ہوئی۔ بی۔ اے کا امتحان بعد کو ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دلی کی راہ لی۔ سیاست اور مضمون نگاری سے انھیں طالب علم کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں دلی میں انھوں نے مختلف اخباروں میں جزوقتی کام شروع کیا۔ پھر مستقل طور پر ”منشور“ کے عملے سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں چندے روز نامہ ”جنگ“ میں کام کیا۔ جب مشہور کانگریسی اور کمیونسٹ لیڈر میاں افتخار الدین (ف) جون ۱۹۴۲ء) نے اردو روزنامہ ”امروز“ جاری کیا، تو اس کا ایک ایڈیشن کراچی سے بھی چھپنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی چراغ حسن حسرت (ف: جون ۱۹۵۵ء) تھے۔ انھوں نے جمالی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انھیں امروز کے اسٹاف میں لے لیا۔ جمالی اس میں روزانہ ”پہلا درویش“ کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ اس کے ہفتہ وار ایڈیشن کے لیے

”گر تو بُرا نہ مانے“ کے عنوان سے ملک کی معاشری سیاسی سماجی ادبی سرگرمیوں پر طنز یہ انداز میں تنقید کرتے رہے۔ یہ دونوں کالم (خاص کر موخر الذکر) بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۷۰ء کراچی ایڈیشن بند ہو جانے کے بعد وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد فلموں کے مکالمے اور گانے لکھے۔ وہ کراچی کے مشہور فلمی رسالے ”نگار“ (ہفتہ وار) کے مستقل فلمی معاون تھے۔ اس میں وہ مختلف ناموں سے ہر ہفتے کئی کئی مضمون لکھتے رہے۔ یہ تعلق تقریباً دو برس تک قائم رہا۔

مجید لاہوری (ف: جون ۱۹۵۷ء) اور ان کا ہفتہ وار مزاحیہ اخبار ”نمکدان“ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ”نگار“ سے علاحدہ ہونے کے بعد جمالی نے ”نمکدان“ اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ دو برس تک اس کے مرتب رہے۔ زیادہ حصہ اس کا بھی ان کے قلم سے ہوتا تھا۔

۱۹۶۳ء میں وہ روزنامہ ”انجام“ (کراچی) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے روس کا دورہ کیا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۶۵ء میں وہ ایک سرکاری ادارے ”نیشنل ان وائسٹ منٹ ٹرسٹ“ کے افسر تعلقات عامہ نامزد ہو گئے، لیکن یہاں سال بھر بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ حکومت چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ ریڈیو پکنگ کے رسالے ”تصویر چین“ میں مترجم ہو کر چلے گئے۔ چین سے ۱۹۶۹ء میں واپس آئے۔

وہ پاکستان راسٹرز گلڈ کے بانیوں میں تھے۔ ۱۹۶۲ء - ۱۹۶۴ء تک دو سال اس کے سکٹر رہے اور کچھ مدت اس کے رسالے ”ہم قلم“ کی ادارت بھی کی۔ بعد کو اس سے سبھی تعلقات منقطع کرنا پڑے، اور انھیں بس اوقات کے لیے ریڈیو اور فلمی رسالوں کا سہارا لینا پڑا۔

۱۹۷۰ء میں کراچی سے فیض احمد فیض نے ایک ہفتہ وار ”بیل و نہار“ شروع کیا

تھا۔ جمالی اس میں اپنا کالم "گر تو بُرا نہ مانے" لکھنے لگے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جمالی نے اپنا ذاتی پرچہ "انقلاب" (ہفتہ وار) جاری کیا۔ لیکن اس نے بھی پانچ شماروں کے بعد دم توڑ دیا۔

انجین اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی میں بیشکلف لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس میں گفتگو اور تقریر وہ بڑی روانی سے کرتے تھے۔ وہ انجمن صحافیانِ پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

انہی صلاحیتوں کا مالک اور کامیاب غزلگو اور طنز نگار ہونے کے باوجود، افسوس کہ ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا۔ انجمن آرا اور انجمن ساز قسم کے انسان تھے۔ لاابالی پن گویا ان کے خمیر میں تھا۔ ہر وقت دوستوں کے حلقے میں خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ اسی لیے عمر بھر پریشان رہے اور کوئی دیر پا کام نہ کر سکے۔ اور تو اور اپنا کلام تک جمع نہیں کیا۔ حافظہ بہت اچھا تھا، اس لیے جو کچھ کہا، سب یاد تھا، ضرورت پڑے پر وہ لمبی لمبی نظمیں (طنزیہ اور مزاحیہ) اور غزلیں سنا دیتے تھے۔

آخری عمر میں انھوں نے صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور بسر اوقات کے لیے ایک سیمنٹ ایجنسی چلانے لگے تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء ہفتے کے روز جیدرآباد (سندھ) گئے۔ اگلے دن شام کو کراچی واپسی ہوئی۔ رات سوتے میں شدید کمر درد کی شکایت کی۔ صبح (۱۲ اگست) دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا، لیکن رستے ہی میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد سخی حسن دربار قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

شادی خاصی دیر سے ۱۹۷۲ء میں کی تھی۔ دو کمسن لڑکیاں ان کے سوگواروں میں ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ آج تک نہیں چھپا۔ اپنی بے پروائی اور لاابالیانہ پن

کی بدولت کبھی کوئی باقاعدہ بیاض تک نہیں رکھی۔ مندرجہ ذیل تین غریبہ، مختلف رسائل سے جمع کی گئی ہیں !

کسی حبیب، نہ کسی نازنین کی بات کرو
 ہو سے بھیگی ہوئی آستیں کی بات کرو
 گماں ہے موت، یقین موت کا جوابِ صواب
 گماں سے ہاتھ اٹھاؤ، یقین کی بات کرو
 مقامِ آہ و فغاں سے گزر چکی ہے حیات
 نگاہِ گرم و دمِ آتشیں کی بات کرو
 زمیں ہے پیاسی اسے خونِ دل کے پھینٹے دو
 پھر اس کے بعد مے و انگبین کی بات کرو
 مہ و ستارہ کی محفل بڑی حبیب ہے، مگر
 زمین والو! کچھ اپنی زمیں کی بات کرو
 سیاہی شب، بحرِ ارا کی داستاں چھوڑو
 سحرِ قریب ہے مہرِ مہیب کی بات کرو
 شگفتِ گل کے فسانے تو سن چکے ہیں بہت
 شکستِ خاطر اندوگاہیں کی بات کرو

باغیاں کو مائلِ شر دیکھ کر چپ ہو گئے
 اس چمن میں ہم ہی کیا، سب دیو و چپ ہو گئے
 گر می محفلِ جویوں باقی رہی، تو کیا رہی
 اہلِ دل چپ ہو گئے، اہلِ نظر چپ ہو گئے
 رات اس محفل میں کس شوریدہ سر کا ذکر تھا
 سازِ ٹوٹے، راگِ بہکے، نغمہ گر چپ ہو گئے

اک شبستاں نور کو ترسا کیا، ترپا کیا
 سوے یزداں دیکھ کر شمس و قمر چپ ہو گئے
 کارواں لٹنے کا غم بھی رفتہ رفتہ دھل گیا
 رگنرز سپر سو گئی، اہل سفر چپ ہو گئے
 کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم، مگر
 رنج دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے
 اپنے دل کی دھڑکنیں ہم بھی سنانے آئے تھے
 قلبِ عالم کو دھڑکتے دیکھ کر چپ ہو گئے

داستانِ غم میں لفظِ آسماں رہنے دیا
 ایک نکتہ سخا کہ محتاجِ بیاں رہنے دیا
 ان کو دیکھا، پھر بھی نظروں سے نہاں رہنے دیا
 اپنی آنکھوں پر حجابِ گلستاں رہنے دیا
 گل کو چوہا، چاند کو دیوانہ دار آواز دی
 ایک پردہ ان کے اپنے درمیاں رہنے دیا
 اس جہاں سے سرکشی کی، اس جہاں سے خود سری
 لیکن اک نازک سا سنگِ آستاں رہنے دیا
 اپنی پلکوں پر چین کے سارے آنسو لے لیے
 گل کو خنداں، بلبلوں کو نغمہ خواں رہنے دیا
 کیا بھٹکتے چشمہ حیواں کی خاطر در بدر
 اپنے پاس اک غم تھا، اس کو جاوداں رہنے دیا
 اے جمالی! بسکہ اک گلشن سے نسبت تھی ہمیں
 اپنے نغموں میں بھی اندازِ فغاں رہنے دیا

ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ

ان کا اصلی نام سوہن لال تھا، لیکن مشہور جگن ناتھ کے نام سے ہوئے۔ وہ پونچھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ کو پیدا ہوئے۔ پونچھ اس زمانے میں ریاست جموں و کشمیر کی ذیلی باجگزار ریاست تھی۔ ان کے والد بابو بھیم سین کو درزشی کھیلوں، خاص کر پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی، اسی باعث وہ راجہ صاحب پونچھ کے بڑے چیتے اور منہ چڑھے تھے اور اس کے باوجود کہ سرکاری طور پر محض ریاست کے محکمہ حسابات میں ملازم تھے، راجہ صاحب موصوف کی نجی محفلوں میں بھی برابر شریک رہتے تھے۔ شاید حکمران خاندان سے دور نزدیک کی کچھ رشتے داری بھی ہو۔ غرض ٹھاکر پونچھی بھی بچپن سے محل میں آنے لگے اور ان کی تربیت اچھے مرثہ الحال طبقے کے ڈھنگ پر ہوئی۔ پھر جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو اول انھیں مقامی دکتوریہ جوبلی اسکول میں اور بعد کو تکمیل کے لیے پرنس آف دلیز کالج (حال گاندھی میموریل کالج) جموں میں بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے بی اے کی سند لی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول سپلائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جولانی کے لیے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلرک کی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے، اور سب لوگ انھیں جتھہ دار کے نام سے پکارتے تھے۔ اس سے ان کے مزاج کے رجحان کا پتا چلتا ہے۔ وہ دائمی علمی اور ادبی صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ چنانچہ جب

سول سپلائی کے محکمہ سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو ۱۹۴۸ء میں دلی چلے آئے۔ آدمی دیہیوں اور شکل و صورت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشوں نے بھی کام کیا ہوگا، بغرض انھیں یہاں جلد ہی اکل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیوز سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

دلی اس زمانے میں پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے سی سی پڑی تھی یہ لوگ جو بھوکے ننگے جان بچا کر یہاں آئے تھے، اور جن کے پاس سر چھپانے کے لیے آسمان کی چھت کے سوا کچھ کانا نہیں تھا، ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلبگار تھے۔ ٹھہا کر پوچھنے لگے کچھ اور فنکاروں کے تعاون سے ڈرامے کیے اور پردہ گرام بنائے، جن کی آمدنی انھوں نے شرمناک سی ریلیف فنڈ میں پیش کر دی۔ اس کے لیے کچھ ڈرامے خود بھی لکھے تھے۔

دلی میں وہ دسمبر ۱۹۶۱ء تک رہے۔ اس کے بعد اسی عہدے پر جموں ریڈیو اسٹیشن میں تبادلہ ہو گیا۔ انھوں نے خاص طور پر ڈوگری علم و ادب اور کلیچے کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ وہ ریڈیو اکاڈمی کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی افسانہ نویس سے شروع کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً "خانہ بدوش" تھا جو ۵۰-۱۹۵۱ء میں "ایشیا" (ہفتہ وار) بمبئی میں چھپا۔ ۲۴ برس بعد اپنی موت تک انھوں نے کوئی دو درجن ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع کیے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا ملک کی دوسری زبانوں میں بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کے چند ناولوں کے نام یہ ہیں: ڈیڈی، وادیاں اور دیرانے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب پتھر روتے ہیں، یہ رشتے بیدار، پت جھڑکے بھڑکے، بھنڈو وغیرہ۔ زندگی کی دوڑ، چاروں کے چاند، آدھے چاند کی رات، افسانوں کے مجموعے ہیں۔

وہ ڈوگری میں بھی بلا تکلف بکھتے تھے۔ ان کی تحریریں ہماری زندگی اور عوام کے مسائل کا اچھا مرقع ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ "اب میں وہاں

نہیں رہتا: اسے انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر یہ لفظ لکھا:

”اپنا پروردگار

پر نام

”سلام“

”خدا حافظ“

”سب کچھ دور ہے۔ سب کچھ پاس ہے، صرف احساس کی بات ہے“

یہ آخری لفظ لکھ کر وہ سر پہر کو میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لیے گئے۔
 ٹرک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک ٹیز آتی ہوئی جیپ ان سے ٹکرائی۔ دماغ کو ضرب شدید آئی،
 جس سے بیہوش ہو گئے۔ فوراً مٹری ہمارا جاگلاب سنگھ اسپتال پہنچا یا گیا، جہاں اسی
 بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست (۱۹۷۴ء) صبح طائر روح تفس غصری سے پروا ذکر
 گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انھوں نے ”کہانی ختم“ قصہ ختم“ کے الفاظ
 کو اپنا تکیہ کلام بنالیا تھا۔ اس وقت انھیں کیا معلوم ہوگا کہ واقعی اتنی جلد ان کی جیون
 کہانی یا قصہ حیات ایسے المناک طریقے پر ختم ہونے والا ہے۔

۱۹۴۶ء میں پونچھ کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی، لیکن بیوی سے نہ بڑھ سکی اور کوئی
 ڈیڑھ دو سال میں علیحدگی ہو گئی۔ لاولد فوت ہوئے۔ وہ کسی کے دوست، حمید اور
 غمخوار تھے۔ ان کے خاڑے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو
 ہجوم تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔

بہزاد لکھنوی، سردار احمد خان

۱۹۰۰ء میں اپنے خاندانی مکان، امین آباد پارک، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ خاندان مذہبی خیالات کا اوردہ بھی متوسط الحال مہتمم کا تھا، اس لیے تعلیم کے پہلو سے تشریف بخش انتظام نہ ہو سکا۔ پھر بھی شتم پشتم مڈل کے درجوں تک اُردو، فارسی، عربی اور کچھ انگریزی حاصل کر لی۔ جب معاش کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ وہ مدتوں، ٹی، ٹی، ای، جلیتی گاڑی میں ٹکٹ معاینہ کرنے والے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے خاندان کا بریلی کی درگاہ نیاز سے پرانا تعلق تھا، یہ بھی وہیں مرید تھے۔ اس لیے نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ بچپن سے قوام کے تیلے اور جسم کے کمزور تھے ہی، متواتر سفروں نے ایسی سہی کسر پوری کر دی اور بیمار رہنے لگے۔ صحت سقیم، فرائض منصبی میں متواتر لمبے سفر لازم، جن میں بعض اوقات راتوں کو جاگنا پڑتا، اس پر مذہبی ریاضت۔ غرض صحت نے بالکل جواب دے دیا اور اختلاجِ قلب کے دورے پرنے لگے۔ گھنٹوں پہوش پڑے رہتے، اسے یار لوگوں نے حالتِ جذب سے تعبیر کیا۔ جب صحت کچھ بہتر ہوئی، تو اب نئی اور نسبتہً سکون کی ملازمت کی تلاش میں دلی آ گئے۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا ریڈیو کے اصحاب مجاز بڑے ہمدرد مہتمم کے لوگ تھے، ان کی غایت سے نوکری مل گئی اور یہ مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ دلی میں وہ تین چار برس رہے۔ یہی زمانہ بچے جب میں نے انہیں دیکھا۔

اختلاجِ قلب کے مرض سے انہیں افاقہ نہ ہو گیا، لیکن اس کے بعد سے وہ مستقل موت کی

اچھی خاصی موتی دوسری رسی گھلے میں ڈالے رہتے۔ جب کلام پڑھتے پڑھتے جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچنے لگتے تھے۔ چونکہ وہ دوسری تھقی اس لیے نیچے اور چلتی رہتی اور اس سے گلا گھونٹے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں اس دن طبیہ کالج (قدوباغ) دہلی کے کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لیے ایجنس پر آئے تھے۔ میں نواب سائل مرحوم (ف: ۱۹۲۵ء) کے قریب بیٹھا تھا۔ برابر میں کسی نے کہا: "اے یہ گلے میں رسی کیوں ڈالے ہوئے ہے اور اسے کھینچ کیوں رہا ہے؟" اس پر سائل صاحب بولے: "بھائی، یہ دیوانہ ہے، لیکن بکا و خوش ہشیار۔ اگر کھینچنے کو رسی نہیں ہو، تو یہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیگا۔"

بہزاد اگرچہ یہاں ہر طرح خوش تھے، لیکن ۱۹۲۰ء میں وہ ریڈیو کی نوکری ترک کر کے پچول فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویس بن کر چلے گئے۔ لاہور میں وہ تین برس رہے تھے۔ وہاں کا معاہدہ ختم ہوا تو وہ دوبارہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آگئے، اب کے ان کا لکھنؤ اسٹیشن میں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر تقرر ہوا۔ دو سال بعد، ۱۹۲۵ء میں انھیں راج کمل کلا مندر بھٹی نے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے پر ملازم رکھ لیا۔ وہ ۱۹۵۱ء تک بھٹی میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ۴۰-۵۰ فلموں کے لیے گیت لکھے ہونگے۔ اسی سال پاکستان چلے گئے، جہاں جمعہ کے دن ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قریب مغرب ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ سخی حسن درگاہ کے قبرستان (کراچی) کی چار دیواری کے باہر اس لحاظ خاص میں دفن ہوئے، جہاں ان کے سلسلے کے لوگوں نے درگاہ تعمیر کی ہے۔

بہزاد سب اصناف سخن پر قادر تھے۔ غزل، گیت، نظم کا دائرہ خیرہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن ان کی خصوصی شہرت نعت نگار کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیف اور درد ہے۔ لحن سے پڑھتے بھی خوب تھے۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے نغمہ نور، موج طور اور چراغ طور بہت مقبول ہوئے۔

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ بعض سالوں

میں شائع شدہ چند غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں، کلام میں بھی تصون کا رنگ غالب ہے، جوان کی زندگی کا مابہ الامتیاز تھا:

اک عجیب عالم ہے حسن کی یہ دنیا بھی
راہبر سے کیا پوچھوں راہزن سے کیوں کھلو
کیوں مسرتیں دے دیں، لے لگا ہے پردا!
منزلِ نظر وہ ہے، محفلِ دگر وہ ہے
ہے یہی درِ جاناں، کعبہ نگاہِ دجاں

تسے بغیر مری زندگی کی ویرانی
دلی ہوئی مرے سینے میں غم کی جنگاری
عجیب رنگ سے شیرازہ بند کی لیلیں
غموں نے گھیر لیا ہے چار جانب سے

مجھے خبر ہے مرے سوزِ عشق کی، پھر بھی
بتا تا کہ تری زلف کیوں سنو رہی ہے

تسے زلفِ درخ کا یہ رنگیں نظام
مبارک، مبارک، اٹھی خود نقاب!
میں کیوں راہبر! تجھ کو تکلیف دوں
وہ اٹھی، وہ اٹھی کسی کی نظر
نہ اپنی خبر ہے، نہ دل کی خبر

ہے، بخود سا بہر ادِ مضطر، مگر
ہے اس کے لبوں پر تمھارا ہی نام

یہ تو ہی بتائے زاہد! ہے ریا کہ بے ریا
تسے آستان کے صدفے کوئی حد بھی کیف کی ہے
میں جہاں سے منہ پھرا کر تے پاس آ رہا ہوں
مرا جذبہ ندامت، تری شانِ پارسی
کہیں مست ہونے جائے، مرادِ دقِ جہہ سانی
کوئی اور کیا بھر گیا مرا کا سہ گدائی

مری الجھنوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو

بڑی منزلوں سے گزری ہے جنوں کی نارسائی

مری زندگی ہے سستی، مری زندگی کا حاصل

نہ جنوں نہ ہوشمندی، نہ دفا، نہ بیوفائی

مری بچو دی تصدق، مری مستیاں بچاؤ

وہ ادھر ہی آ رہے ہیں، بکمالِ درباری

تری رہ گزر کے پھرے، ترے آستان کے سجد

یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسائی

خبر نہ تھی تیری جستجو میں، کشاکش رہی ملیگی

قدم قدم پر جبیں جھکیگی، قدم قدم آگئی ملیگی

تمہیں مبارک مرا ٹرپنا، مجھے مبارک تمہارا جلو

یہ دونوں عالم رہیں سلامت، جہاں کو آسوی ملیگی

نہ ڈھونڈم کو نگاہِ عالم، جہاں پہ میں ہوں جہاں وہ چو

جہاں بھی کھویا ہوا ملیگا، فضا بھی کھوئی ہوئی ملیگی

ابھی نہ چھڑو، ابھی نہ چھڑو، ابھی تو ذوقِ طلب میں لم ہو

یہ راز کیوں مجھ پہ کھولتے ہو کہ اور مشکل ابھی ملیگی

خودی کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے من بجا رہا ہوں

سمجھ رہا ہوں یقین میں بھنس کر، سکون کی زندگی ملیگی

ہمیں تو ہر ذرہ میکہ ہے کہ ہم تو ہیں تیرے رند، ساقی!

مگر کہاں مستیاں ملیں گی، مگر کہاں بچو دی ملیگی!

گماں کے ہاتھوں خرابِ خستہ، کدھر یہ دیوانے جا رہیں

کہیں نہ کعبہ نہ بتکدہ ہے، ملی تو ان کی گلی ملیگی

محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو مرزا پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے جو بچوں کو نجی تعلیم دینے کے لیے اس دور میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فرزند علی صرف پانچ برس کے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے بعض شاگردوں سے گھر ہی پر حاصل کی؛ اور اس کے بعد۔ عمر سولہ سال ۱۹۱۲ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول (حال بابوالا جیسوال انٹر کالج) سے دسویں درجے کا امتحان اول ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں خاصی لیاقت کے مالک ہو گئے۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے رستے میں حائل تھیں، اس لیے انھوں نے بسر و وقت کے لیے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً چند مرزا پور کلکٹریٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی شادی الہ آباد میں ہو گئی اور یہ اگلے برس وہاں چلے گئے۔ یہاں کوئی سال بھر ڈسٹرکٹ بورڈ میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا۔ بعد کو جب حالات سازگار ہو گئے، تو ۱۹۲۸ء میں وہیں محلہ سبھی پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا۔ ملازمت اور اس کے بعد بھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے۔

۱۹۳۹ء میں ان کا دفتر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا، تو یہ بھی اس کے

ساتھ وہاں بھیج دیے گئے۔ نہ معلوم کیوں، وہاں کی آب و ہوا ان کے واسے نہ آئی اور اکثر بیمار رہنے لگے، خاص طور پر آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی اور بینائی بتدریج کمزور ہونے لگی، اس پر ان کا الہ آباد کے ایک متعلقہ دفتر میں تبادلہ ہو گیا، لیکن اس سے بھی چنداں فائدہ نہ ہوا، رفتہ رفتہ بصارت بالکل جاتی رہی۔ آخر اسی باعث اسٹینس قبل از وقت ۱۹۲۷ء میں ریٹائر ہونا پڑا۔

ان کا الہ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا تھا۔ ان کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے (محمد علی مضطر، غضنفر علی غضنفر، اظہر علی، حیدر علی صفدر علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہان، انیس جہان، فردوس جہاں)۔ بڑی بیٹی قیصر جہان کا ان کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندہ سلامت موجود ہیں۔

اسٹینس نے ۱۹۲۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخن گوئی میں پروفیسر ضامن علی ضامن صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے برادرِ خور و سید حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا۔ پھر سید حسن مرتضیٰ شفیق عماد پوری تلمیذ امیر بینائی سے رجوع کیا۔ شفیق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ افسوس کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن ہفتے کو بوقتِ صبح اٹھا، اور انھیں ہمت گنج کی کربلا میں اپنے خاندان کے بیشتر دوسرے لوگوں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

عمر بھر کی مشق و مزا دولت اور اساتذہ کی صحبت کا اثر تھا کہ ان کا کلام زبان اور فن کے پہلو سے بے عیب ہو گیا، اور اسٹینس نے خود استاد

کا درجہ حاصل کر لیا۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔
تمونے کے چند شعر درج دیل ہیں،

میں اسی شبہ میں گمراہ ہوا جاتا ہوں
بی وفا کہتی ہے دنیا جسے، وہ تم تو نہیں!
بدگماں کیوں نظر آتی ہیں تمہاری نظریں
خامشی میری بہ اندازِ تکلم تو نہیں!
اے تمناؤں کے خالق! خلشِ غم کے خدا!
عشق ہی حسن کا معصوم تبسم تو نہیں!

یہ مانا چھن گیا آنکھوں کا نور اے محشر! تو کیا جو دل میں تھی میری وہ روشنی بھی گم؟
خطا معاف، ہم اس زندگی سے باز آئے نفسِ نفس کا ہمارے شمار ہوتا ہے
تو بہارِ حسنِ فطرت، میں جموں عشقِ رسوا
نری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

یہ زمانے میں نہیں دم کہ مٹا دے مجھ کو محشر! میں زمانے سے نہیں ہوں، مگر دم سے ہے زمانہ
عشق بہارِ بیخزاں، عشق سرورِ جاوداں عشق کا غم نشاطِ جاں، عشق سے دل جلد لکھ
مرنے کا ٹھکانہ مل تو گیا، جیسے کا سہارا ہو تو گیا
امید کی دنیا بس تو گئی، کچھ ان کا اشارہ ہو تو گیا
اے دردِ فراق! اے دشمنِ جان! اے زندگی غم کے ساماں!
تھے قلب و جگر جس سے لرزاں، صدمہ وہ گوارا ہو تو گیا
کلیوں کا تبسم غائب ہے، پھولوں کے ہیں چہرے پر مردہ
لیکن ہم اس پر پھولے ہیں، گلزارِ ہمارا ہو تو گیا

خموش رات میں، جب کائنات ہوتی ہے
ترے خیال سے تا صبح بات ہوتی ہے

تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والی ٹونک)

انگریزی زمانے کے راجپوتانے میں ۲۲ ریاستیں تھیں؛ اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۴ء) نے انگریزوں کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد ایک عہد نامے کی رو سے نومبر ۱۸۱۷ء میں رکھی تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور عہدہ امتیاز رہی۔ حضرت سید احمد بریلوی کی مہم کی ناکامی کے بعد ان کے یقینہ السیف قافلے کے بیشتر مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی، محلہ ”قافلہ“ انھیں اصحاب کا بسایا ہوا ہے۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان (ف ۱۸۶۲ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔

نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۃ الدہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان صولت جنگ کے بیٹے تھے۔ اور بظاہر ان کے والی ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن مقدر کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم خان کے انتقال (۲۳ جون ۱۹۳۱ء) پر ان کے بیٹے سعید الدولہ نواب سعادت علی خان سعیدان کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی تقریباً پندرہ برس کی جہان بینی کے بعد جمعہ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو راکھراے عالم جاودانی ہوئے۔ چونکہ ان کے کوئی فرد نہ نرینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے علاقے سجانی ممتاز الدولہ فاروق علی خان گڈی پر بیٹھے۔ لیکن اس پر مشکل

سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ ان کا اچانک دلی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بھی کوئی
 نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اب ان کے برادر خورشید محمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں
 میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پائے۔ جب تک حکومت ہند کی
 طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہو گئی، تاریخ ادب اردو کے مصنف جناب
 رام بابو سکسینہ (ف: ۱۹۵۷ء) جو یوپی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے، ریاست
 کے منتظم قرار پائے۔ بعد کو حکومت ہند نے ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل
 خان کی تخت نشینی کی منظوری دے دی، تو سکسینہ صاحب ہی وزیر اعلیٰ
 بنا دیئے گئے تھے۔ انھوں نے عزیز الدولہ امیر الملک کا لقب اختیار کیا تھا۔
 لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومت ہند چاہتی تھی کہ ویسی ریاستیں بھی
 ملک کے نظم و نسق میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ اس دعوت پر لیبیک کہتے ہوئے
 نواب محمد اسماعیل خان بہادر نے بھی ٹونک کو مارچ ۱۹۴۸ء میں راجستھان
 سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ان کے لیے ٹونک کی رعایا کی محبت اور احترام میں
 کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا ملجا و ماوا بنے رہے۔
 جمعرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو بعد ظہر بجارضا کینسر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔
 تجہیز و تکفین اگلے دن صبح گیارہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو،
 مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلباری ہو رہی تھی اور کوئی
 آنکھ ایسی نہیں تھی جو شکر بار نہ ہو، موتی باغ (شاہی قبرستان) کے قطعہ خاص
 میں اپنے پردادا نواب وزیر الدولہ کے سرمانے سپرد خاک ہوئے۔
 ان کے بھی اولاد نہیں تھی۔ اہل خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے علائی
 بھائی نواب معصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دیا۔
 نواب محمد اسماعیل علی خان نے ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد علم و فضل اور
 شعر و سخن کی فضا دیکھی۔ ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے، غلیل
 شخص تھا۔ وہ مضطر اور پھر بسمل سے مشورہ سن کر تے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل خان کی تعلیم کا معقول نجی انتظام ہوا تھا، انھوں نے مختلف علوم متعدد اساتذہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے میو کا لج، اجیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہر تعلیم تالیق کی نگرانی میں چند برس رہے۔ ٹونک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیر آبادی، سید محمد افتخار حسین خان مضطر خیر آبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹونک کو حریف دہلی و لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انھوں نے تاج تخلص اختصاص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انھوں نے مشورۂ سخن مولانا عبدالقادر خنداں نگینوی ثم اجیری سے کیا، جو عربی، فارسی کے عالم اور اردو کے صاحب فن کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا معنی اجیری سے اصلاح لی تھی۔ وہ ۱۹۲۷ء تک اجیر ہی میں رہے۔ آزادی ملک کے بعد جب وہاں کی سکونت محذوش ہو گئی، تو ٹونک چلے گئے۔ شروع میں بہت دنوں تک نواب صاحب کے کٹنا بجانے کے ہنتم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدردان تھے۔

تاج مرحوم غزل سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کا دیوان (لمعات تاج) مرتب شدہ خنداں صاحب کے پاس موجود ہے، جس میں سے چند شعرا انتخاب کر کے آخر میں دیے جا رہے ہیں۔ انھیں حضرت رسالت مآب کی ذات ستودہ صفات سے جو محبت اور ارادت تھی، اس کا اظہار اکثر نعت کی

شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پدر بزرگوار حضرت خلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفل میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزاروں روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا کرتے تھے۔ روزانہ بلا امتیاز مذہب و ملت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محل نذر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کی محفلوں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کتاچہ ”ٹونک کے جشن میلاد النبی“ خاصے کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاج مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی ”تاجدارِ مدینہ“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ٹونک ۶۷ ۶۸) اس کے شروع میں انھوں نے وقیع اور جامع مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔

انھوں نے اپنے محل ”نذر باغ“ میں پندرہ روزہ مشاعرے کا التزام کیا تھا۔ یہ مشاعرے طرحی ہوتے، اور مصرع خود نواب صاحب مرحوم تجویز کرتے تھے۔ ٹونک کے ممتاز شعرا کے وظائف مقرر تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر دعوت پر بلائے جاتے اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ان کی سرپرستی میں ”تاج اکیڈمی“ قائم ہوئی تھی، جس کا مقصد ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کی ترتیب اور ریاست کے جلیل القدر شعراء ادبا کی تخلیقات کا تعارف تھا۔ یہ اکیڈمی آج بھی موجود ہے، غرض ان کی وفات سے ایک صاحب علم اور قدردانِ شعر و ادب شخص ہم سے جدا ہو گیا۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

تضمین

ترے اخلاق سے قائم ہوا دنیا کا نظام ایک ہی صف میں کھڑے کر دے آقا و غلام

تلخیِ بخت کے شاکی ہوئے سب شیریں کلام بحرِ الطاف و عنایات، محیطِ اکرام!
 تجھ سے سرسبز و تر و تازہ ریاضِ اسلام دشتِ پُر خارِ جہاں، بن گیا گلزارِ تمام
 تخیلِ بہتانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
 زان شدہ شہرہٴ آفاق بہ شیریں رطبی

تضمین

جگر تھامے ہوئے کوئی، کوئی مضطرب، کوئی بیدم
 کسی کے لب پہ آہیں، کوئی محوِ گریہ پیہم
 غرض میں کیا کہوں پیشِ نظر تھا کو نساء عالم
 ”نہی دامن چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم“
 بہر شورِ قصصِ لیل بود شب جائے کہ من بودم“

جمال و حسنِ پر جس کی فدا جنت کے نظارے سے
 جو دیکھے اک نظر، قدموں پہ اس کے جان و دل وارے
 مجسمِ نو بہارے، گلزارے، کبک رفتارے
 ”پری پیکر نگارے، سرو قدِ لالہ رخسارے“
 سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم“

عجب اک کشمکش میں مبتلا تھی، تاجِ امیری جاں
 زمین و آسماں حیراں، درو دیوار تھے لرزاں
 مجھے لینا تھے خلوت میں کسی سے آج کچھ پیاں
 ”رقیبیاں گوشِ بر آواز، اور ناز، من ترساں“
 سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم“

مجالِ دم زدن ہے اور نہ یارے بیاں، خسرو!
 بیاں کیسے کروں، کیسے کھلے میری زباں، خسرو!

یہ شانِ تاجدارِ تاجدارانِ جہاں، خسرو!
”خدا خود میرِ مجلس بود اندر لعلِ کاں، خسرو!

محمد شمعِ محفل بود شبِ جاے کہ من بودم“

اب غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

پھر ہرے ہونے لگے زخمِ جگر، اے ہمیشیں! ان کے ہونٹوں پر مٹی بے اختیار آنے لگی
آج ہی ہم نے کیا تھا عزمِ ترکِ میکشی میکشے پر آج ہی کالی گھٹا چھانے لگی
گاہِ آدابِ محبت کی قسم کھاتا ہوں میں گاہِ آدابِ محبت سے گذر جاتا ہوں میں
تاجِ میری شاعری کیا، بر سرِ محفل کبھی شعر کے پردے میں دردِ دل سنا جاتا ہوں میں

ہیں قائم بے ستوں لاکھوں ٹواہت اور تیارے
کشتی کا عشق کی، ادنیٰ سایہ فیضان ہے شاید
گریباں چاک آنکھیں سرخ، چہرہ خاک آلودہ
یہی، اے تاج! اربابِ جنوں کی شان ہے شاید

دل پہ اب اختیار ہے میرا اب بھینس انتظار ہے میرا
ان کے آنے کا کچھ یقین سا ہے آج دل بقیہ رہا ہے میرا
جگر میں سوز، دل میں درد، آغشتہ بخوں آنسو

فراہم ہو گئے سامانِ تکمیلِ محبت کے

گذری ہیں میری عشق میں راتیں ہزارہا طے میں نے کی ہیں عشق کی راہیں ہزارہا
اتنا ہی لکھ دیا کہ سراپا ہوں شوقِ دید لکھنے کے واسطے تو ہیں باتیں ہزارہا
تو اس کے التفات سے غافل نہ رہ سبھی اے تاج! حسن کی ہیں ادائیں ہزارہا

یہ خالی اہلِ دل سے تاج! وہ فریادِ مجنوں سے

یہ سب آبادیاں جھوٹی، یہ سب ویرانے جھوٹے ہیں

ہوشِ مستی، نہ تابِ نظارہ اب کی کیسی بہار آئی ہے

رہِ عشق میں شوقِ ہوسِ مسافر تو دشواریاں سب ہوں آسائیاں

پوچھتے رہتے ہیں، مرے حالات میں سناتا ہوں، تو بگڑتے ہیں
 جس کو ہونزل ف پریشاں سے کسی کی نسبت
 اس کا جتنا کبھی پریشان ہو حال، اچھا ہے
 تاج! بے عشق کی دنیا کا نرالا دستور
 حال جس کا ہو بُرا، اس کا مال اچھا ہے
 یہ گلستاں تھے جہاں اب ہیں ڈھیر خاروں کے
 یہاں اترتے تھے سوکارواں بہاروں کے
 جنہیں ڈبو یا سٹھا طوفاں نے، وہ انجھر کے بیٹے
 نہ انجھرے ڈوبنے والے کبھی کناروں کے

دل بہت بیقرار ہے میرا
 دل پہ کیا اختیار ہے میرا

ثمر چھپروی، عبدالحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں ایک۔ طرف عربی علوم اور اسلامیت کی روایت تھی، تو دوسری طرف شاعری اور دکالت کا پیشہ۔ ان کے والد مولوی عبدالماجد چھپرہ کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے؛ ذہرت تخلص تھا۔ انھیں تاریخ نوی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعہ کلام ”بیان الغرائب“ کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے والد (یعنی ثمر کے دادا) مولوی بخشش علی عربی اور فارسی کے عالم، دینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انھیں بھی تاریخ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں ثمر (عبدالحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۳ء کو چھپرہ (محلہ دھیانوال) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ سہائی بہن تھے۔ دو سہائی ان سے بڑے تھے، چار چھوٹے؛ بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے سہائی عبدالحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں، بالخصوص خلافت تحریک کے باعث یکسوئی نصیب نہ ہو سکی، آخر ان کے والد کے مشورے سے انھیں انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں چھپرہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے فارغ

ہو کر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کر کے بالآخر ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل، بی) بھی پاس کر لیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت کے اقتضا سے شروع میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور پرسا ہائی اسکول، سارن (بہار) میں ملازم ہو گئے۔ لیکن سخی حالات کی مجبوری کے باعث یہاں زیادہ دن تک نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ آدمی محنتی تھے اور اخلاص و ایمانداری سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی پرتی گئی۔ پہلے ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے اور اخیر میں اوتھو کمشنر۔ اسی عہد سے ۱۹۴۱ء میں سبکدوش ہو کر پھلواری شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کے لیے اسپتال چلے گئے۔ مہینا بھر بعد ۲ نومبر (۱۹۴۴ء) کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں، چاہیں، تو مکان پر واپس جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام پھلواری شریف پہنچے۔ دوست احباب، رشتہ دار سب خوش و خرم تھے، ہنس مہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ درگاہِ مخدوم منہاج الدین رستی میں سپردِ خاک ہوئے۔

ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر شروع سے ورع و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ پابندِ صلوٰۃ و صوم اور عاملِ اوراد و وظائف رہے۔ ان کی نیکی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے اتفاق رائے سے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے اسفہیں امام بنا دیا۔

ان کی شادی کوٹلور (آرہ) میں داروغہ عبدالجلیل کی صاحبزادی (نسیم خانم) سے ہوئی۔

سے ہوئی تھی۔ ان کے لہجے سے چار بچے ہوتے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں۔ ماشاء اللہ سب موجود ہیں۔

حسین زمانے میں لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک "بزم سخن" تھی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آٹھ نو برس کی عمر تھی، یہ بھی ان مشاعروں میں جاتے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعر لے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفتن ان کی شعر گوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپرہ اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے۔ اور اصلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق سید ابراہیم ندوی نجم سابق سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ کے پاس بھیجے گئے۔ اس کا اعتراف ایک شعر میں بھی کیا ہے:

شاعری آتی نہ تھی دراصل مجھ کو، لے کر!
صحبتِ نجم سخنور نے سخنِ داں کر دیا

چندے بعد نجم نے انہیں اپنے استاد حضرت تمنا عاوی مجیبی (ف: نومبر ۱۹۷۷ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیماب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے؛ آخر تک انہیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو بکثرت ہیں سخنور، لیکن
سیماب کو استادِ یگانہ دیکھا

انہیں شر سے بھی دلچسپی تھی۔ کس زمانے میں شہرِ نور فرانسسی ناول نویس اور مصنف ہیوگو کے ناول کا ترجمہ "بد نصیب" کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظائیں انگریزی میں بھی لکھی تھیں، جو انگریزی ماہنامے "ٹریٹر چپٹ" میں شائع ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت سختہ اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پائی تھی، اسی کی

جھلک ان کے کلام میں بھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

سب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے
یہ گر در راہ میری رازداں معلوم ہوتی ہے
سو فی پڑی ہے عیش کی منزل ترے بغیر
پیمانہ بن کے ٹوٹ گیا دل تم سے بغیر
مقصد ہوائے سعی کا حاصل تم سے بغیر
منزل پہ بھی ہے حشر منزل تم سے بغیر

بسم نگر نغمہ کار، کیا کہنا ! بدل دیا ہے رخ روزگار، کیا کہنا !
مال یک نگہ حسن یار، کیا کہنا ! بنا ہے خرمین دل پر شرار، کیا کہنا !
فریب وعدہ حسن یار، کیا کہنا ! پھر اس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا !
جہاں یار نے تجدید عشق کا پیمان
بیک نگاہ کیا استوار، کیا کہنا !

خامشی میں بھی کوئی کرتا ہے، کیا سرگوشیاں
سُن رہا ہوں آپ اپنی داستانِ دل کے قریب
نشاط انگیز حب انسان کی تقدیر ہوتی ہے
تو خود بیٹھے بچٹائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

بب دل ہی نہیں پاک، تو کیا سمجھو گے ! ہے عقل نہیں خاک، تو کیا سمجھو گے !
دنیا کے ہوں یا عالم بالا کے رموز پیدا نہیں ادراک، تو کیا سمجھو گے !
دشوار ہے انسان کا انسان ہونا ہاں سہل نہیں، صاحبِ عرفاں ہونا
پھر بھی، غم ! انسان جو آزمادہ ہو مشکل نہیں، مشکل کا بھی آساں ہونا
داناہِ قدرت کسی کو معلوم نہیں اصل فطرت کسی کو معلوم نہیں
تدبیرِ بر اعلا وہ ہے سب کو غمراہ اپنی قسمت کسی کو معلوم نہیں

انور کامٹوسی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں رو بہ زوال ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کئی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاش معاش میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یوپی کے دیہات کے پارچہ باف بھی تھے جو عرف عام میں انصاری کہلاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نواہی (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے ناگپور سے ۱۶ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں جا بسا، جو اس زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ مولوی کے چار بیٹے ہوئے جن میں سے دو نے خاصا نام پایا۔ بڑے مولوی مولوی لعل محمد، عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سید غلام کبیریا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور خود بھی صاحب اجازت تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے یہی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خاندان نواہی سے کسی ایسا شخص آئے تو میری عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ اس طرح ان کا سال ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حافظ حاجی صفی اللہ کے حوالے

کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآنِ ناظرہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد منشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو درپیش بنا دیا۔

یوپی کے اکثر گھرانوں کے کامٹی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا غور اور شعر و ادب کا خصوصاً اچھا خاصا چرچا سٹھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور عشرہ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجالسوں میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انھوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کا مٹوی (ف: ص ۱۹۲) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحبِ فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعہ کلام "ارمغانِ جاوید" کے تاریخی نام (۱۳۱۲ھ) سے شائع ہوا تھا۔ سعید نے ابتدا میں چندے منشی غوث محمد سے اصلاح لی؛ بعد کو حاجی تھمل حسین تھمل جلالپوری (ف: ص ۱۹۲) سے مشورہ کرنے لگے۔ تھمل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے نامح سے جا ملتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استاد کی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامٹی کلب نے ان کے کلام کا انتخاب "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز اور معیار ہے اس کے پیشِ نظر، یہ اس لائق ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ اپنے گھر کے ماحول اور تعلیم کے زیر اثر ساری عمر صوم و صلوة کے پابند ہے۔

۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک ایام رمضان میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض منتقی، پرہیزگار، پابندِ وضع بزرگ تھے۔ وہ اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ دن کے گیارہ بجے مرض کا شدید حملہ ہوا، جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب کے قریب مسلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم عزیز قدوسی کامٹی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا:

اٹھ گئے، بزمِ جہاں سے افسوس ناز تھا اہلِ سخن کو، جن پر
از سر آہ، کہا دل نے، عزیز! حیف جاتے رہے حاقظِ نور

(۱۹۷۷ء = ۱۹۷۷ء)

(۱ +)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔
انور مرحوم بیمار گونہیں تھے، لیکن جو بھی کہا، خوب کہا۔ تعجب ہوتا ہے کہ
کامٹی کے غیر شاعرانہ ماحول میں وہ اتنے کامیاب شاعر کیونکر ہو گئے،
واقعہ یہ خدانے بخشندہ کی دین ہے۔ تجلیاتِ نور سے چند شعر ملاحظہ
ہوں:

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ جایا نہ جائیگا
دیوانگی شوق کا عالم جو ہے، یہی
انور سے ان کے سامنے جایا نہ جائیگا

شبِ غم، شام سے گھبرا رہا ہوں
کفن کیا باندھ لوں میں سر سے، انور!
الہی! خیر کیا انجام ہوگا!
سنا ہے، آج قبلِ عام ہوگا!

آیا وہ، اور دل کو بیا، لے کے چل دیا
کھا کر بھی سو فریبِ محبت ہوں مطمئن
ہم سوچتے ہی رہ گئے، یہ ماجرا ہے کیا!
یہ سحر کاری بتِ رنگیں ادا ہے کیا!

اس کو تری محفل میں، تری دیکھے کام کون آیا، گیا کون، یہ انور کو خیر کیا!
 عبت گھبرا رہے ہو، قصہ غم کی درازی سے
 جہاں تک سن سکو گے تم، وہیں تک یہیاں اپنا
 تم مہربان تھے، تو زمانہ تھا مہربان — تم مہربان نہیں، تو کوئی مہربان نہیں
 آئی بھی بہار انور! رخت بھی ہوئی کب کی
 اب تک گریباں سے الجھا ہوا سودائی
 دو دن کی زندگی بھی بڑی چیز ہے، مگر جینا ہی جب نہ آئے، تو پھر کیا کرے کوئی!
 گتھیاں سلجھائیں سب نے، کچھ بنا لیکن نہ کام
 راز تھی پہلے بھی دنیا، اور اب بھی راز ہے
 وہی میں ہوں، جو تھا نا کام شرحِ آرزو اک دن
 وہی میں ہوں، جسے کہتا تھا ہر اک بیڑاں پہلے
 یہ سوچتے ہی سوچتے، انور گزر گئے اس زندگی میں کیجیے کیا، کیا نہ کیجیے
 ہر درد کی، ہر غم کی دوا میرے لیے ہے کیا نام تیرا نام خدا میرے لیے ہے
 تھوڑی سی پیش رفت بھی الفت میں ہے بہت
 دل سے ملے نہ دل، تو نظر سے نظر ملے

شاہ معین الدین احمد ندوی

یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں ایک مہتمم خیر قبیلہ رُدولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہیں میں صابر یہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحق (ف: ۱۳۶۸ھ) بھی تھے۔ جن کے نام سے اہل دل کے سینے روشن اور ان کی محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ رُدولی میں ان کا مزار مرجع الناس ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی انہیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نسباً فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں رُدولی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی زمینداری تھی۔ ان کے والد شاہ حسنا ت احمد مرحوم مجذوب صفت بزرگ تھے۔ اسی لیے شاہ معین الدین اپنے نانا کی کفالت میں آ گئے۔ نانا شاہ شرف الدین تعلیم یافتہ اور قادر دان علم ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں۔ لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انہوں نے دستور زمانہ کے مطابق اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں تحصیل کی اور انیس کے بعد تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ اس عہد میں یہاں دارالعلوم میں ہر مضمون کا استاد اپنے

فن کا ماہر، تقریر و تحریر کے میدان کا شہسوار، طلبہ کا دلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالب علم نے اسی علمی ماحول سے اور اپنے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالرحمن نگرانی (ف: مارچ ۲۶ ۱۹۰۶ء) دارالعلوم میں تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگرانی۔ علم و فضل کا شعلہ جوالہ! افسوس کہ یہ آگینہ جلد ہی تندہی صہبیا سے پگھل کر عرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے اذہل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ نگرانی مرحوم نے ان میں جوہر قابل دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں ان کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر انھیں اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) ناظم دارالمصنفین کے پاس بوالے گئے۔ کیا شبہ گھڑی آتی ہے جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن سے قائم ہوا، وہ پچاس سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انھیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے ماہرے پر) نیت مقرر کر دیا۔ آہستہ آہستہ انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبوی کی تالیف کے بعد صحابہ کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتداء رانی و جلدیں ("خلفائے راشدین" اور "مہاجرین" حصہ اول) مولانا حاجی معین الدین ندوی (ف: ۱۹۴۱ء) نے مرتب کی تھیں۔ اب انھیں کے ہمام شاہ معین الدین احمد جو ان کے ہاتھ لگے، تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے اسے فال نیک خیاں کیا اور اس سلسلے کی تکمیل ان کے سپرد کر دی۔ شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں "مہاجرین" (جلد دوم) لکھی؛ پھر "ابحین" لکھی؛ پھر صحابہ غیر مہاجر و انصار کی سیرت لکھی۔ اسی زمانے میں وسعت مطالعہ سے انھیں تاریخ اسلام لکھنے کا خیاں پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے آغانے خلافت بنو عباس کے اختتام تک چار جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل کیا۔ یہ

کتاب بہت مقبول ہوئی۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: "اسلام اور عربی تمدن" (عربی سے ترجمہ) عرب کی موجودہ حکومتیں، "دینِ رحمت"، حیاتِ سلیمان (مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی سوانح عمری)، "ادبی نقوش" (مجموعہ مضامین)۔ انھوں نے ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "اقبال کی شاعری" کے موضوع پر توسیعی خطبات بھی دیے تھے؛ یہ شاید سنہ زکاتانی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

معارف کے شذرات وہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بھوپال چلے جانے کے بعد ہی سے مستقل لکھنے لگے تھے۔ ان کی تحریر کی سلاست اور متانت، پختگی اور اصابت رائے کے سب قائل تھے۔ سخت سے سخت بات بھی ایسی نرمی اور سادگی سے کہ جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

وہ تمام تصنیفی کاموں میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا ندوی مرحوم بعض مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انھیں آیام میں نواب محمد حمید الدخان والی بھوپال (ف: فروری ۱۹۶۰ء) نے انھیں اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا سید سلیمان کو عظم گڑھ چھوڑ کر بھوپال جانا پڑا۔ وہ وہاں فضائے اعلیٰ کے منصب پر نیز دینی اور مذہبی امور کے منصرم بن کر گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہ صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کا نظم و نسق اور معارف کی ادارت کی ذمہ داری جس خوش اسلوبی سے سرانجام دی، اس پر استاد نے خوشنودی کی سند دی، اور تحبیب کا اظہار کیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب مستقل طور پر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، تو اب اس تاریخی ادارے کا سارا باران

کے اور ان کے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمن کے کندھوں پر آ پڑا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہوئے۔ اسی کا شاندار نتیجہ دارالمصنفین کا جشن زرین تھا، جو فروری ۱۹۶۴ء میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف: ۱۹۶۹ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور جس میں ملک بھر کے علماء اور اہل علم نے شرکت کی تھی۔

سیر چشمی، اقربا پروری، استغنا، توکل ان کے کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔

۱۹۶۴ء میں مشاہرہ محض ۲۵ روپے مقرر ہوا، تو وہ اسی میں خوش تھے۔ آخر

میں بڑھتے بڑھتے یہ ۴۰۰ سو تک پہنچا، تو بھی انھوں نے کسی طمطراق اور

نمایش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اثنا میں بڑے بڑے مشاہرے پر باہر سے بلاؤ

آئے۔ مدرسہ عالیہ، کلکتہ نے بلایا، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اپنے یہاں

آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس مردِ خدا نے ایک درگیر و محکم گیر کے اصول پر

عمل کرتے ہوئے اپنے استاد اور دادا استاد کی یادگار کو سینے سے لگائے

لکھا، اور سب کو جواب دے دیا۔ ہر مہینے اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے اعزہ

اور دو سرے مستحق اصحاب کے لیے الگ کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں صدر جمہوریہ

ہند کی طرف سے عربی کی سند اعزاز ملی جس کے ساتھ تین ہزار سالانہ کا وظیفہ

بھی ملتا ہے، تو اس کا بیشتر حصہ بھی اسی طرح تقسیم ہوتا رہا۔ ان کے والد بیت

زرعی زمین چھوڑ کرے تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنے حصے کی زمین چھوڑے

سجائی شاہ امام احمد کو مہربہ کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور تمہارے

پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ استغنا کا یہ رنگ اور

گہرا ہو گیا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (سہارنپور) امیر تبلیغی

جماعت سے بیعت تھے اور اس جماعت کا جو رنگ ہے، اسے جاننے والے

جانتے ہیں۔ دو مرتبہ (۱۹۶۶ء و ۱۹۷۳ء) حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب

ہوئی۔

ان کی پہلی شادی رُودلی کی مشہور شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد کی چھٹی صاحبزادی عشرت النساء بیگم سے (جو کسی زمانے میں بھوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے) عفو ان شباب میں ہو گئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء (۲۵ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ) کو انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ چندے بعد دوسری شادی شیخ منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی وحی النساء سے ہوئی۔ لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ ان کا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تامل کا جوا کھلے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر یہی ۳۵ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن اس قدر کے بندے نے کسی کی ایک نہ سنی، اور پھر نکاح نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے۔ انہیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ لڑکا شاہ و در احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے، اور لڑکی دادھیالی نام، خوشیہ، ناسخیاالی، ثمر فاطمہ) اپنے گھر بار والی رُودلی میں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوان صالح چودھری اویس احمد سے کر دی تھی۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں کبھی کبھی تنفس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دارالمصنفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ آخری وقت بہت ہی دبے پالٹو آیا۔ جمعہ کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو حسب عادت تمام معمولات سے فارغ ہونے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ جاگے، تو عصر کی نماز کے لیے وضو کا پانی طلب کیا۔ کمر سی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے، اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انہوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہ صاحب اپنے رفیقِ اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

ان کی وصیت کے مطابق میت اگلے دن ان کے وطن راولی گئی اور وہاں
چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خواہنگاہ نصیب ہوئی۔
آسماں تربت پر تیری عنبر افشانی کرے۔

شیر محمد اختر گجراتی

میرے ہم عمر اور دوست اور ہم وطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے، اگرچہ ۱۹۰۷ء میں پیدا لاہور میں ہوئے جہاں ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً اور رہتے تھے، اور سرگنکارام مرحوم (ف: جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ شیر محمد نے دسویں درجہ تک کی تعلیم زمینداروہائی اسکول (موجودہ زمیندار کالج)، گجرات میں پائی۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے تربیت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی، بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری کب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کرنے پر کسی نہ کسی طرح کاٹے؛ بالآخر ۱۹۳۶ء میں استعفیٰ دے دیا، اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

وہ عقیدے کے لحاظ سے جماعت احمدیہ کی لاہوری شاخ سے متعلق تھے۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ اس انجمن کے دونوں پرچوں، ہفتہ وار ”پیغام صلح“ (اردو) اور ہفتہ وار ”لائٹ“ (انگریزی) میں کام کرتے رہے۔ یہاں سے نکل کر کچھ دن تک ماہنامہ ”تہذیب نسوان“ کے ادارہ تحریر سے بھی رسمی طور پر وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین بچوں کی نفسیات پر قلمبند کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا تھا۔

انھوں نے نفسیات کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا۔ لاہور میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ اردو میں اس مضمون کی نصابی کتابیں ہی کتنی ہیں! چنانچہ یہ کمی پورا کرنے کو انھوں نے اسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے، جنہیں وہ نصاب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے، اور ان کے احباب کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا۔ نظم و ثردونوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا حسن اللہ خان تاجور سنجیب آبادی کا ماہنامہ ”شاہکار“ بڑے ٹھسے سے نکلتا تھا۔ آخر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور ابھرتے ہوئے ادیبوں کی جو سلسلہ افزائی کرنے اور انھیں آگے بڑھانے میں بڑی مشاعرہ محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے آخر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں ”شاہکار“ کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ مولانا تاجور کا جب جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا، تو اس کے بعد آخر پنجاب کے مشہور ماہنامے ”ہمایون“ کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا مطالعہ نفسیات بدستور جاری رہا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے: (۱) ”نفسیات“ اور (۲) ”نفسیاتی جائزے“ یہ دونوں پرچے مدتوں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ اب ان کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار ”قندیل“ (لاہور) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر ہفتے ”میں دیکھتا چلا گیا“ کے عنوان سے ایک کالم ”تماشائی“ کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں لاہور

اور صوبے کی ہفتے بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر ہلکے سچلے انداز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالغنی مرحوم تک ان کی زبان کے معترف اور مداح تھے۔

وہ حلقہ اربابِ ذوق اور راسخ نگار کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص طور پر مستندی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حلقے میں حاضری دینے والے ادیبوں کا کلام نظم و نثر انھیں بآسانی "قذیل" میں اشاعت کے مل جاتا۔ یوں اس عہد کے بیشتر قابل ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات قذیل میں چھپتی رہیں اور پرچے کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہو گیا۔ وہ اپنے مستقل کالم (میں دیکھتا چلا گیا) کے علاوہ بھی اضافے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ فالج کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تک نقل و حرکت سے معذور رہے۔ بارے، باقاعدہ علاج سے کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، لیکن اس سے کمزوری اتنی ہو گئی کہ پھر انھیں کامل عیشت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ان پر پھر فالج گرا۔ اب کے علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ وہ وہیں بعد میں اسپتال میں ۲۰ دسمبر ۱۹۷۴ء علی الصبح رہ کر عالمِ جاودانی ہو گئے۔ جنازہ اسی دن اٹھا اور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔ *وَاللّٰهُ اَعْلَمُ*۔ بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اب سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فہمی اور بذلہ سنجی، سیرشپی اور وسنداری کے لیے مشہور تھے۔ جن ایام میں "قذیل" کے مدیر تھے، کسی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ پروفیسر محمد سرور (جامعی) جنھوں نے

مولانا عبید اللہ سندھی پر خاصا کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حمید نظامی مرحوم کے ”نوائے وقت“ کے جواب میں اپنا روزنامہ ”آفاق“ جاری کیا تھا۔ اسخوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب نے خیال کیا کہ اختر میرا بھانجا ہے اور تنخواہ سبھی معقول، سبھلا اسے قبول کرنے میں کیا عذر ہوگا! لیکن اسخیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضع داری بنا ہی اور ”من لستم خائے قناعت پیا سے خویش“ کہتے ہوئے قندیل میں جھے رہے۔

ایک اور بات! اختر ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے تو نام کے ساتھ یہ تخلص کیوں لگا رکھا ہے؟ کہنے لگے: ”اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ سید اقبیا علی تاج قسم کی چیز ہے، اسخوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شیر محمد قسم کے نام کچھ فوجی اور جنگجو حضرات ہی کو زیب دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا۔“

اسخوں نے کوئی پچاس کے قریب کتا ہیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں، تراجم ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخ اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے بھی وہ بلند تر انسان تھے۔ با اصول، مرتجان مرنج، دوستوں کے ہمدرد اور کنبہ پرور۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سکوک کرے! آمین!

چغتائی، عبدالرحمن (خان بہادر)

کون ہے جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ یا تاج محل، آگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں نے تیار کیے تھے، ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے۔ عہد شاہجہانی کے مورخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور نادر العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب ”کوچہ استاد حامد“ آج بھی ان کی یاد تازہ کرنے کو موجود ہے۔ فن عمارت اس خاندان میں نسلاً بعد نسل قائم رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا صدر الدین چغتہ آئی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے بیٹے میاں رحیم بخش تھے اور میاں رحیم بخش کے میاں کریم بخش چغتہ۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔ میاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۶۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔

میاں کریم بخش چغتہ کے تین بیٹے: عبدالرحمن، عبداللہ اور عبدالرحیم ہوئے۔ یہی عبدالرحمن، ہمارے مشہور مصور اور فنکار عبدالرحمن چغتائی ہیں، جن کا ۱ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانح اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔ انھوں نے سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے تاج محل کے موضوع پر اپنے مقالے سے ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے

چھوٹے ہیں۔ انھوں سے سار کی عمر بڑے سبھائی عبدالرحمن چغتائی کی معیت ۱۹۱۱ء خدمت میں گزار دی۔

عبدالرحمن چغتائی لاہور میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی لیسیم الہ آباد میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے قرآنِ ناظرہ ختم کیا۔ بعض سورتیں جو انھیں آخر تک حفظ نہیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی مکتبی تعلیم کے ساتھ ہی ان کے والد نے انھیں اپنے بہنوئی میاں میران بخش نقاش (بن بابا عمر الدین نقاش) سے نقاشی اور مصوری کے اسباق لینے کی ہدایت کی تھی۔ میاں میران بخش نقاش اپنے فن کے ماہر اور اس حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمتِ فن کے اعتراف میں انھیں مسجد وزیرخان (لاہور) میں حجرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں یہ حجرے مصوروں، نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے طور پر دیے جاتے تھے۔ بابا میران بخش نے بعمر ۱۱۵ سال ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور کے قبرستان بی بی پارک دامن میں دفن ہوئے۔ عبدالرحمن چغتائی میو اسکول جانے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔

مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا۔ چھٹے درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پتنگ بازی اور آوارہ گردی کرنے کے بعد انھوں نے پھر اسی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیوٹ طور پر مڈل (آٹھویں درجے) کا امتحان پاس کیا۔

خاندانی روایت کے پیشِ نظر، فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ مڈل اسکول امتحان کے بعد انھوں نے خود بخود میو اسکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرائنگ، نقاشا سازی (ڈرافٹ مینی)، لوہاری اور لکڑی کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ عبدالرحمن چغتائی آخری درجے کے امتحان (۱۹۱۴ء) میں صوبے بھر میں اول آئے تھے۔

میو اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اولاً اسخوں نے کرچین ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے، اور استعفیٰ داخل کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادر علمی (میو اسکول) نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ اسکول میں نوٹولیتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا، جس کے انچارج چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۲ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد عمر بھر کہیں ملازمت نہیں کی۔

یہ میاں میران بخش نقاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ اسخوں نے عفتوان شباب میں مصوری شروع کر دی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آب رنگی تصاویر کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن ابھی تک ان کی مصوری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کے عام کرنے میں پروفیسر (ڈاکٹر) محمد دین تاثیر (ف: نومبر ۱۹۵۸ء) اور ماہنامہ نیرنگ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور اسخوں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اثراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب (نیاز مندان لاہور) سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ تعاون بڑھانے کا وعدہ کیا۔ نیرنگ خیال وسط ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی پہلے سے مصوری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے۔ تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی

نویسوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تاثیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا، تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کما حقہ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے ان کے مابہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اصول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میران بخش سے ضرور استفادہ کیا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیا کے تصویر و فن کے خزانے میں جو بیش بہا اضافہ کیا، وہ سراسر ان کا ذاتی کارنامہ اور ان کے اپنے زور بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ، اور معاصر مصوروں اور فنکاروں اور نقادوں سے بالمشافہ تبادلہ خیال نہیں کرتا، میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفیض کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقات میں سبھی راہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے مہتمموں سے ملے نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر منظر غائر دیکھے، جو اکثر مصور اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیر علم و فن اور مقتدر مصوروں سے بھی ملے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور سختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور رچاؤ میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے فن میں تانے کی پلیٹ پر لوہے کے تمام سے تصویر بنانے (یعنی ایچنگ: Etching) کا اضافہ کیا۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر مبذول رہی تھی۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ و خم سے جیتی جاگتی تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کارِ ان کی ڈرائنگ کے فن پر غیر معمولی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ یہی کام انھوں نے ایچنگ سے لیا۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی ہندوستانی مصور نے فن کی اس شاخ کا ایسا بھرپور نمونہ پیش نہیں کیا تھا، اس کا سہرا صحیح معنوں میں چغتائی کے سر ہے۔

اب ان کا سجا طور پر ہندوستان کے صفِ اول کے مصوروں اور فنکاروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف ”خان بہادر“ کے خطاب سے کیا۔ یہاں غالباً ایک بات کا ذکر بھل نہیں ہوگا۔ انگریزی عہد میں یہ خطاب بالکل سیاسی نوعیت کے تھے۔ اور بالعموم حکومت کے چیلے چانٹوں اور جی حضور یوں تک محدود ”خان صاحب“ البتہ ایک آدھ مرتبہ غیر سیاسی اور علمی و ادبی افراد کے حصے میں بھی آچکا ہے۔ لیکن چغتائی کو یہ خطاب محض اپنی فنی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ملا۔ ان سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا، ان میں علامہ اقبال اور رامدھن ناتھ ٹیگور کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں ”ہلال امتیاز“ کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۴۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہنرک لیکے پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لہذا اگلے دن جب مصوف علامہ اقبال کا مزار دیکھنے گئے،

توان کی خواہش کے مطابق وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر لیگل، چغتائی کے فن کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر اپنے وزیر والٹر شیل کو (جو بعد کو صدر مغربی جرمنی بنے) چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا، جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا۔

ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں مرتع چغتائی، ”منہ شہود پر آئی، جس میں غالب کے کلام کو تصویروں کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ اس کا مقدمہ علامہ اقبال نے لکھا تھا۔ اس میں ۲۲ رنگین اور ۵۵ سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ جس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جوسترہ روپے میں بکا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں لطیفہ یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حال آنکہ یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے مکان (واقعہ کوچہ چاک سواریاں، لاہور) میں خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیار طباعت اور تجلید وغیرہ سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی ان کے دستِ راست اور ہر طرح مدد و معاون رہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے بھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ عبدالرحمن چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سواے اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد تصاویر پر چوکھٹے لگوانا، اسٹیمپ نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا، کتابوں کا شائع کرنا، ان کی تقسیم اور کاسی کی نگرانی۔ غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انھیں کے ہاتھوں

سرا انجام ہوتے تھے۔

”مرقع چغتائی“ کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر ابر حیدری نے نظام پبلش (حیدرآباد ہاوس) نئی دہلی میں لگانے کے لیے لے لی تھیں۔ لیکن جب شہزادی دردانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی بڑی بہو اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی سگم) نے اسخیں دیکھا، تو فرمایا کہ تصاویر نئی دہلی نہ بھیجی جائیں، میں اسخیں اپنے محل میں دگناؤںگی۔ خدا معلوم، اب وہ کہاں ہیں!

نقش چغتائی، ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے کچھ اور اشعار کو مصور کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے نکلی، بکرم کی لچکدار جلد اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزیین اور دو رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۱۹ تصویریں ہیں، جن میں سے صرف ایک رنگین ہے، بقیہ سب سادہ، سپید و سیاہ ہیں۔

اسی ”نقش چغتائی“ کا دوسرا ایڈیشن (نقش ثانی) غالباً ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے، تصویروں میں بھی تفاوت ہے اور ان کی تعداد میں بھی۔ اس میں چھ رنگین تصویریں ہیں اور سولہ سادہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا موبوہو چر بہ تیسری مرتبہ ۱۹۴۵ء میں چھپا۔

اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ تصاویر چغتائی: ۱۹۳۴ء

۲۔ ہندی تصاویر چغتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے

دہلی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا)۔

۳۔ عمل چغتائی: ۱۹۴۸ء

۴۔ تیمور کا گھرانہ: ۱۹۷۲ء

عمل چغتائی میں کلام اقبال کو مصور کیا ہے جس طرح پہلی دو کتابیں مصور کلام غالب ہے۔ کلام اقبال کو مصور کرنے کی خواہش خود علامہ اقبال نے ”مربع چغتائی کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چغتائی نے ۱۹۶۱ء میں اس پر کام شروع کیا تھا؛ اس کی تکمیل کہیں ۲۵ برس بعد ہوتی۔ یہ بڑے سائز (۱۵ x ۱۲) کے ۲۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۲۴ چار رنگی تصاویر ہیں اور ۲۲ ایک رنگی؛ شروع میں جسٹس سر عبدالرحمن کا دیباچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور ہر طرح سے اقبال اور چغتائی دونوں کے نمایان شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر میراثین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتداء میں اس کا ۲۷۵ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجراء سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومت پاکستان نے اس خدمت کے اعتراف میں چغتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں :

۱۔ ”عمیر خیام (مصور)“ : اس پر انھوں نے ۳۰-۴۰ برس کام کیا تھا۔ کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی ۶۰-۷۰ تصویریں ہیں۔ تمام تصویروں کی لوحیں اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے؛ اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلا و آگیا۔ خدا معلوم، اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہوگا ! چغتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس فرض کی ادائی ہے جو مغرب، عمیر خیام کی قدر و منزلت کر کے اور اس کے متعدد مصور ایڈیشن شائع کر کے ہم اہل مشرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

۲۔ ”چغتائی آرٹ“ : یہ کتاب تقسیم ملک سے قبل زیر طباعت تھی کہ فلسطی کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عمل چغتائی کی تکمیل میں

لگ گئے اور اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔
 ۳۔ کارِ چغتائی : یہ دراصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی ”مرفعِ چغتائی“ اور ”نقشِ چغتائی“ کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار کو مصور کیا تھا، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰۔۴۰ نئی تصویریں ہیں۔
 یہ کتاب بھی تقسیم ملک کے وقت زیرِ طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں۔ ”عملِ چغتائی“ میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحے کے اشارات ہیں یہ سب مرحوم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ ماڈرن آرٹ میں چغتائی کا حصہ (انگریزی)

۵۔ چغتائی اور اس کے نقاد ()

۶۔ نعمۃ لذت ()

۷۔ چغتائی کی عریاں تصویریں (NUDES) ()

وہ اردو میں افسانہ بھی لکھتے تھے اور فنی موضوعات پر مضامین بھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے ”کاجل“ اور ”لگان“ شائع ہوئے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے ایک اور مجموعہ ”ستاؤن“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس میں تین طویل افسانے ہیں : (۱) ستاؤن (۲) ہانجن : (۳) لندن سے ایک خط۔ ستاؤن میں دوسری جنگِ عظیم کے اس زمانے کی داستان ہے، جب حسنِ اتفاق سے اردو کے بعض مشہور ادیب (تاثر، مجید ملک، پطرس بخاری وغیرہ) دلی میں جمع ہو گئے تھے۔ ہانجن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء کے موسمِ گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ تیسرا افسانہ ظاہر ہے کہ سفرِ لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔

انھوں نے اپنے شوق سے مختلف ممالک کے مشہور مصوروں کی تخلیقات کا اچھا

خاصاً ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت تھیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان کی سرپرستی میں ”چغتائی عجائب گھر“ قائم کر دیا گیا ہے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی یہی جاتے تھے؛ اس طرح ان کی وصیت بھی پوری ہو گئی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دھن میں رہتے، گھر سے بھی کم نکلے تھے۔ کسی قسم کی علت نہیں تھی؛ نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ شراب، حال آں کہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگریٹ پیتے تھے اور ان میں سے کئی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رہیے تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل و صورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں جو انی میں کھیل کود کا شوق بھی رہا، بلکہ شروع میں تو اسی کت کے مارے چندے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ بندوق کا نشانہ مچھلی کا شکار۔ ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیزی اور قوت سے پھینکتے تھے کہ وکٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی تیراک بھی اچھے تھے۔

بزرگ جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں امانٹا اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان بیانی صاحب میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے اعزہ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انھیں بیانی صاحب میں امانتاً دفنایا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ ”چغتائی عجائب گھر“ ہی میں ان کا مدفن بھی بنے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی (وزیر النساء بیگم) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی

اولاد نہیں ہوئی، ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔ دوسرا نکاح انھوں نے
 ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء کو کیا تھا۔ یہ بیگم (کشتور باٹو) امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے
 ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی (مسرت) نے فلاسفی میں ایم اے
 کیا اور پنجاب بھر میں اول رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان
 سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمن چغتائی (ولادت: ۲ اگست ۱۹۶۹ء) ہے
 عارف میاں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی
 میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قصبہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے۔ تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک کھتری قوم کی کھتہ برادری کا یہاں کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی برادری کے ایک سکھ گھرانے کے ایک فرد ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات (میا نوالی، جہلم وغیرہ) میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو یہاں ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء کو ان کے گھر دوسرا لڑکا (اور چوتھا بچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست ہوا اور اس نے تاریخ صحافتِ اُردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

دیوان سنگھ مفتون صرف ۴۰ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیبا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جاداد بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے موافق رہتے، تو ان کے پسماندگان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے ایک صدی قبل کے سماج میں) بیوہ کی حالت بہت

زندہ تھی۔ رشتے دار اور عزیز قریب اس غریب کے اور اس کے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت کرنا تو درکنار، اس تاک میں رہتے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے بھی ہتیا لیں۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کم از کم سنگھ دس برس کے تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف ۱۴ دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیوہ بالکل بے بار و مددگار رہ گئی تھیں۔ اراضی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جاداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر میں جو اندوختہ تھا، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دو لڑکیوں اور بڑے بیٹے کی شادی کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے، تو اثاثہ البیت تک فروخت کرنے کی نوبت آ گئی۔ قصہ کوتاہ، جب دیوان سنگھ کی دس بارہ برس کی عمر ہوتی ہے تو افلاس اور ادبار نے گھر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

ایسے حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ گھائے میں رہتا ہے، اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ لشتم لشتم پانچویں تک تو بڑھ سکے، اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات تک پورا کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، ان کی فیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ باقی اسکول، گوجرانوالہ سے جہاں انھوں نے داخلہ لیا تھا، تین چار دن بعد واپس آ گئے۔

حالات سے مجبور ہو کر دیوان سنگھ اب وہیں حافظ آباد میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک کپڑے کی دکان پر نوکر ہو گئے۔ یہ ملازمت دو تین برس رہی۔ اس کے بعد انھوں نے کوشش کر کے فیروز پور کے سول اسپتال میں کمپاؤنڈر کی نوکری حاصل کر لی۔ چھ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے منڈی ابوہر (ضلع فیروز پور) کے اسپتال میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن

نہیں رہے؛ فیروزپور واپس چلے آئے۔ فیروزپور میں مشکل سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ پھر تبادلہ ہوا۔ اور اب کے وہ موگا (ضلع فیروزپور) پہنچ گئے۔ موگا کی یہ خصوصیت ہے اور اس شہر کے لیے باعثِ فخر بھی، کہ آنکھوں کے مشہور معالج راسہ ہار ڈاکٹر منہرا داس (ف: ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء) یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی اصل میں حافظ آباد ہی کے رہنے والے تھے، لیکن موگا میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک اسپتال قائم کیا تھا، جس میں موتیابند کے علاج کے متلاشی ملین آکر رہتے تھے۔ ڈاکٹر منہرا داس کی دیوان سنگھ کے خاندان سے دور نزدیکی کی کچھ عزیز داری بھی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر منہرا داس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے اسپتال میں کام سیکھنے کا موقع دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کا شوق دیکھتے ہوئے خوشی سے اجازت دے دی۔

وہ اس اسپتال میں کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ شروع میں نور علی شاہرہ تھا؛ بعد کو ترقی ہوئی، تو بارہ ملنے لگے۔ ساتھ ہی موتیابند کا آپریشن کرنے کی تعلیم پانے اور اس کی مشق بھی کرتے تھے۔ یہاں وہ تین برس رہے۔ جب ہاتھ جم گیا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی، تو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مانسہرہ (ریاست پٹیالہ) میں آزادانہ نجی طبی پریکٹس شروع کر دی۔ خدا نے ان کی محنت اور خلوص میں برکت دی، کام چل نکلا۔ یہاں انھوں نے اپنا ایک چھوٹا موٹا اسپتال بھی قائم کر لیا، جہاں وہ موتیابند کے آپریشن کرتے تھے، اور باہر کے مریضوں کو ٹھہراتے تھے۔ غرض اب زندگی کا مہیاب کہی جاسکتی تھی۔ شہرت بھی حاصل تھی اور تین چار سو روپے مہینے کی آمدنی بھی۔

یہیں مانسہرہ میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے انھیں ”ڈاکٹر دیوان سنگھ“ کی جگہ ”دیوان سنگھ مفتون“ ایڈیٹر مہفتہ وار ”ریاست“ بننے کی راہ پر ڈال دیا۔

فیروزپور اسپتال میں تھے، جب انھیں اردو رسالہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ ”زمانہ“ (کاپور) کے خربدار بن گئے۔ ”محزن“ (لاہور) ان

کے ملنے والے ایک صاحب کے پاس آتا تھا، یہ اس سے مستعار لے کر پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ شوق ابوہر اور موگا میں بھی نہ صرف جاری رہا، بلکہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ اب اور ماہنامے بھی آنے لگے، بلکہ یہ روزنامہ ”اتہار عام“ (لاہور) کے بھی باقاعدہ خریدار بن گئے۔ جہاں گئے، وہاں کے بعض علم دوست اصحاب سے بھی روابط پیدا ہو جاتے۔ ان سے نہ صرف پڑھنے کو وسائل و جرائد ملتے، بلکہ ان کی صحبت میں دل و دماغ کی صلاحیتوں پر چلا بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ صورتِ حال تھی، جب وہ مالنسہ میں بلا شرکتِ غیرے ایک اسپتال اور تین چار سو روپے ماہانہ آمدنی کے مالک تھے۔

ایک دن اسخوں نے ایک مضمون لکھا اور اسے شیر سنگھ فیروز پوری کے فرغی نام سے لاہور کے ہفتہ وار ”خالصہ اخبار“ کو بھیج دیا۔ مضمون چھپ گیا۔ اسی نام سے دو تین اور مضمون بھی اسے پرچے میں شائع ہوئے۔ پھوڑے دن بعد اخبار کے منیجر بھائی مول سنگھ کا خط آیا کہ آپ متقل طور پر ”خالصہ اخبار“ کی ایڈیٹری کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں؟ اور اگر جواب اثبات ہو تو، کیا تنخواہ قبول کریں گے؟ اسخوں نے جواب دیا کہ میں یہاں ڈاکٹری کرتا ہوں اور اس سے تین چار سو ماہانہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میری تعلیم معمولی ہے، لیکن مطالعہ کافی ہے، اور مجھے لکھنے کا شوق بھی ہے۔ بھائی مول سنگھ نے اس پر لکھا کہ ہم تو ایڈیٹر کو ۶۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں دے سکتے! آپ کی موجودہ آمدنی کے پیشِ نظر آپ کو خالصہ اخبار کی ایڈیٹری پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بظاہر معاملہ یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ ۶۰ اور ۳۰۰۔ ۴۰۰ میں جو تین فرق ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے! لیکن دیوان سنگھ کی ہیجان پسند طبیعت کو چین کھانا! اسخوں نے ایک بزرگ ہربان سے مشورہ کیا کہ صورتِ حال یہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ تمھارے

قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، تجربہ کر لینے میں کیا مضائقہ ہے! اس راء نے دیوانہ راہوے بس است، کا کام کیا۔ انھوں نے سجائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۴ روپے ماہانہ ہی پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ اور مالنسہ میں اپنا جما جمایا، چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔ وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے ہونگے۔ بیشک، ان کے زوردار داریوں سے پرچہ بہت مقبول ہو گیا، لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلاف قانون ٹھہریں، اور پرچے کے مالک اور طابع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک ہمسفر (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار امر سنگھ (ف: جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کونسا اخبار اتنے "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوتے نم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو! قدرتاً دیوان سنگھ ملازمت سے برخاستہ کر دیے گئے۔

اب وہ بیکار تھے، لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلہ صفر تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو بقیہ عمر کے لیے ذریعہ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام رچھپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر ہندوستان) ان دنوں لاہور میں تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انھوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ اردو صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (ف: جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام لیا، جو اس زمانے میں روزنامہ ہمدرد، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں؛ اگر آپ اجازت

دیں، اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرما دیں، تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں۔ جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاد دہانی کرائی، تو اب کے سبھی صدائے برخاست۔ دیوان سنگھ بھلا یوں کہاں ٹپکنے والی اسامی تھے! انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا مختصر سامان ایک گوردوارے میں رکھا اور سہدم کے دفتر جا دھکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف سو روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے، تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کر لوں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، نتخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چیر اسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصد تو آپ کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے، تاکہ میں آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چیر اسی کی بھی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس پر اس مردِ قلندر نے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر کچھ نتخواہ لینے، مفت کام کرنے پر بھی کچھ اعتراض ہوگا؟ جالب نے کہا کہ بھلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری تلاش کر لی۔ دن بھر سہدم کے دفتر میں مفت کام کرتے، چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے، اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گوردوارے آکر پڑھتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے! شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے۔ جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے، اور شیدا صاحب کے اخبار ”ہندوستان“ میں نوکری کر لی۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار اور ان کی کامیابی کا راز کھلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو اس کے حصول کی خاطر وہ راہ کی مشکلات سے

گھر اگر اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ
سی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے سبھی جی نہیں چراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز
اسخیں دو باتوں میں پنہاں ہے؛ مشکل سے نہ گھبراننا اور محنت سے جی نہ چراننا۔

یہ ”ہندوستان“ میں کام کرتے تھے کہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر موٹا سنگھ نے ان سے کہا
کہ مہاراجا پٹیلہ کے آدمی بھسور (ریاست پٹیلہ) کے قومی کارکن بابو تیجا سنگھ کو
بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے مہاراجا کی بعض ناجائز خواہش پوری
کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ بھسور پہنچے، ماسٹر موٹا سنگھ اور
بابو تیجا سنگھ سے ملے، سارے حالات سنئے۔ مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے
پایا کہ مہاراجا بہادر کی کارگزاریوں کا سبھانڈا بھسور آجائے، اخباروں میں مضمون
لکھے جائیں اور دیوان سنگھ خود حالات منتقاب کرنے کے لیے اردو میں ایک
پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کرے۔

قرار داد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان ”خونِ شہادت کا تازہ قطرہ“
لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے دو نسخے جلدی سے تیار کر داکے دفتری کے ہاں
سے اٹھا لائے اور اسخیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر مہاراجا
کے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، جس پر حکومت
ہند نے پمفلٹ بحق سرکار ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸۰۰
نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو اسخیں
افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن اسخوں نے ہتھیار ڈالنے سے
انکار کر دیا۔ بھسور پہنچ کر پھر ماسٹر موٹا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے مشورہ کیا۔
دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی گئے،
یہیں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کر کے اور دو ہزار
نسخے کے کرواپس روانہ ہو گئے۔ رستے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ڈاکخانوں
سے مختلف دوستوں کے نام پارسل بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے، اور بقیہ نسخے وہاں

سے ارسال کر دیے۔

پولیس نے تفتیش کی، تو انھیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ اس پر یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا !

جس دن پولیس نے انھیں پکڑ لے، اتفاق سے اس دن اتوار تھا۔ سٹھانے والوں نے انھیں ہتکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر بھیجا کہ ان سے رہمانڈ پر دستخط کرائے جائیں؛ مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو دائر ہوتا رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب سٹھانیدار انھیں ہتکڑی لگاتے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا ہے، تو صاحب بہادر نشے میں چور تھے۔ سٹھانیدار نے ان سے کوائف بیان کر کے رہمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھ بھی پا نہیں؛ انھوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہوگا؟ دیوان سنگھ نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤں گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے سٹھانیدار کو حکم دیا کہ ملزم کی ہتکڑی کھول دو اور اسے رہا کر دو؛ یہ کل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ تو یہ کہہ کر بنگلے کے اندر چلے گئے، ادھر سٹھانیدار غریب حیران، پریشان کہ ڈیفنس آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن رات کی تنگ و دو کے بعد ملزم گرفتار ہوا؛ اور صاحب نے یوں اس کی رہائی کا حکم دے دیا؛ لیکن حکم حاکم، مرگِ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا؛ اس نے انھیں رہا کر دیا۔

اگلے دن پیر تھا، یہ حسبِ قرار داد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیرکمان سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کیونکر آسکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم معافی چاہو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسا پمفلٹ نہیں لکھو گے، تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے۔ انھوں نے جوانی کی ترنگ میں جواب دیا کہ میں نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ؛ آپ کو مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ اس پر صاحب کھسیا نے ہوئے چپراسی کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو

عدالت سے نکال دو؛ یہ نہیں جانتا کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے ! وہاں کیا دیر تھی چیرا سی نے انہیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیل دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے صاحب نے نسیل پر لکھ دیا؛ ملزم ناخبر بہ کار نوجوان چھو کر لے، اسے تنبیہ کر دی گئی ہے۔ سیل داخل دفتر کر دی جاتے۔

یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی؛ اور پہلی گرفتاری بھی۔

اب یہ پھر بیکار تھے۔ بسر اوقات کے لیے چند سے لاہور کے مختلف پرچوں (گور و گھنٹال، ہندو، اکالی وغیرہ) میں جزوقتی کام کرتے رہے۔ لیکن کب تک؟ آخر ۱۹۲۰ء میں دلی پہنچے۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کا ڈنکا بجنا تھا۔ انہیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا دھن تھی۔ دیوان سنگھ ان سے ملے اور بڑے پایا کہ ایک روزنامہ ”رعیت“ کے نام سے جاری کیا جائے۔ اس میں دیوان سنگھ نے ۲۵۰ روپے لگائے، بقیہ سرمایہ خواجہ صاحب مرحوم کا تھا۔ شرط یہ تھی کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینگے، روزانہ خواجہ صاحب کی کتابوں کا ایک صفحے کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہوگا۔ اگر اخبار میں منافع ہوا، تو دونوں شریک برابر کے حصے دار؛ اگر نقصان ہوا تو اسے خواجہ صاحب پورا کر نیچے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار گھٹاٹے میں رہا۔ چند مہینے کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی، اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اخبار بند کر دینا چاہیے۔ قدرتا دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا۔ ابتدائی ڈھائی سو توڑو بے ہی تھے، اب پھر مستقبل کا سوال سامنے آگیا۔

خواجہ صاحب موصوف کے عزیز دوستوں میں ملا واحدی (ف: اگست ۱۹۷۶ء) بہت مشہور شخصیت تھی۔ یہاں دلی میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ ”نظام المشائخ“ نکالتے تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ ”رعیت“ مجھے دے دیجیے، میں اسے چلاؤنگا۔ غرض، ”رعیت“ کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کوچہ چیلان میں اکٹھا کیا۔ بھوپال سے

نیاز فتحپوری اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی؛ وہ اس کی متواتر شکایت چینیوں سے چیں بچیں تھی۔ اتنے میں نیاز کے مصر سے متعلق دو ادارے گویا روایتی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئے۔ حکومت نے ملا واحدی سے ضمانت طلب کر لی، اور مطبع ضبط کر لیا۔ پرچے نے دم توڑ دیا۔ ہے یہ کہ آج تک بھی یہ ملا واحدی کی ضد سے چل رہا تھا، ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

دیوان سنگھ پھر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی۔ ”رعیت“ میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگر سین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی محنت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آئیے، ہمیں چل کر آرٹھت کا کاروبار کریں۔ مرتا کیا نہ کرتا! مجبوراً دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور بہتی چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے سیٹھ صاحب کے ساتھ کاٹے اور سجاگ نکلے۔ اس کے بعد مہاراجا رپوڈ من سنگھ واپسی نا بھ کے جن سے سردار سردول سنگھ کو پیشہ کے ذریعے سے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نا بھ چلے گئے۔ وہ نا بھ میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دوسو روپے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپوڈ من سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے سکریٹری ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اتارنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے کبھی کبھار بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخر کار ۱۹۲۸ء میں انھیں الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں ان کی بیوی سر و جنبی دیوی بھی ان کے ساتھ نظر بند رہی تھیں؛ ان کی ۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو نئی دہلی میں رحلت ہوئی۔

جب مہاراجا نا بھہ کو گدی سے اتارا گیا، تو دیوان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہنا پھے میں رہ سکتے تھے! انھوں نے انگریز منظم اعلیٰ (ایڈمنسٹریٹر) مسٹر اوگلوی کی خدمت میں استغفہ پیش کر دیا۔ اوگلوی نے اول تو ان سے استغفہ واپس لینے کو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اصرار کرنے پر انہی رعایت کی کہ اچھا پندرہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر بضد رہے، تو استغفہ منظور کر لیا جائیگا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہ نا بھہ سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دون پہنچے۔ وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط دے کر حیدر آباد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ نومنت ہند کی خفیہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی، اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں! چنانچہ جب وہ حیدر آباد سے واپس نا بھہ پہنچے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خبر پاؤ کہ وہیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بتایا، بس نظر بند کر دیا۔ ان کے دوستوں کی بھی کسی نہیں تھی۔ خود مہاراجا نے مجلسِ واضع قوانین کے اراکین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لارڈ ریڈنگک والیسر سے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ وہ تین مہینے نظر بند رہے تھے۔

نا بھہ کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی بدعنوانیوں کی کہا بیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ حیرت یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھوٹتا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی رواد حکومت

ہند اور عوام تک پہنچائی جائے، تاکہ ان کی داورسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دیر سویر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا، جس کے ذریعے سے دالبیان ریاست کے مظالم طشت از بام کیے جائیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی دردناک کہانی ملک و قوم کو سنائی جائے۔

جب یہ ناسمجھ کی نظر بندی سے چھوٹے، نو سیدھے دلی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کسی نے حوصلہ افزائی کی؛ کسی نے اس خازنار سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فضول خرچ رہے۔ ناسمجھ کی پوری ملازمت کے دوران میں بھی کچھ پس انداز نہیں کیا تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ قصہ کوتاہ، کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ وار جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام ”ریاست“ ہو۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک بنیے سے قرض لیا اور یوں ۱۹۲۲ء میں اس کا آغاز ہوا۔

”ریاست“ کا اجرا کئی پہلوؤں سے عہد آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیسی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بخوبی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والی ریاست کی مدح میں قصیدہ، تاکہ اس سے کچھ فتوح حاصل ہو سکے؛ لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ پرچہ جس آب و تاب سے چھپنا شروع ہوا، وہ بھی اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال (البلاغ) اس شان سے نکلا تھا۔ لیکن وہ خوش و خشاں، دلی دولت مستعجل بود کا مصداق ثابت ہوا۔ اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ ”ریاست“ کے سلسلے میں اس کے مدیر اعلیٰ (دیوان سنگھ) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بی زبان اور مظلوم رعایا کی حمایت میں

وہاں کے حکمرانوں کے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیان ریاست نے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ کسی مقدمے دائر ہوئے جن میں فریقین کون تھے، ایک طرف راجا مہاراجا یا نواب کی بے پایاں دولت اور اثر و رسوخ، اور دوسری طرف ایک ہفتہ وار اخبار کا یکہ دنہا ایڈیٹر اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آفریں ہے دیوان سنگھ کو کہ انھوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے ذرہ برابر پسپائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے بیک وقت چار چار مقدمے چلائے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوئی ہوگی! پھر مالی زیر باری اپنی جگہ۔ ان پر اپنی زندگی میں پندرہ مقدمے چلے۔ ان میں سب سے مشہور نواب بھوپال کا مقدمہ ہے جو ہوشنگ آباد میں چھ برس تک جاری رہا۔ اور جس میں آخر کار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں میرا ستی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ ان مادی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر نا انصافی یا ظلم و ستم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

ریاست کی ایک اور خدمت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا، جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی ۶۰۰ دہلی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا۔ جس کے خلاف کوئی داد سختی نہ فریاد۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیان ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور حیب پس چلتا، رہنمایان قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے، تاکہ

اس طرح دلی نعمت انگریزی حکومت کی نظردوں میں اپنی خیر خواہی اور فرمانبرداری کا نقش اور نگہرا کر سکیں۔ غرض کہ یہ ریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سیدہ راہ ثابت ہوئیں۔ ”ریاست“ نے اسخیر، بیتقاب کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیا میٹ ہو گیا، جو ان کا رہ اور ننگ ملت و قوم راجاؤں، چہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

”ریاست“ ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، تو ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل۔ اس لیے حقیقت میں اب اس پرچے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگھ جنم کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کمائے اور اڑا دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا سا چھید، روپیہ اس میں نکلتا نہیں تھا؛ ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا آڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر صحافت کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گون کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی اور اعتدال قواء کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ بارے، مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومت ہند نے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انھیں کے ایما پر حکومت پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے؛ یوں جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

”ریاست“ بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں دلی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دون) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے یہاں دلی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو غسلسخانے سے نکلنے ہوئے پانٹو ریٹ گیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ جس سے بہت خون خارج ہوا، علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے۔

جب دلی میں گھر والوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں بوالائے۔ لیکن وقتِ اخیر آگیا تھا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء آدھی رات سے کچھ پہلے روحِ نفسِ عنبری سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مردِ میدان بھی جس نے ساری عمر لڑتے جھگڑتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرتے گزار دی تھی، فرشتہ موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے !

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: ہندرسنگھ، اونکار سنگھ، نندکار سنگھ سب یہیں دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی ”ہندوستان چھوڑو“ تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ ۱۸۵۰ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور تقریباً سال بھر بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ جیل خانے میں انھوں نے اپنی زندگی کے وہ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے جو ان کی نظر میں اہم اور سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں ”ریاست“ بند رہا۔ ان کی رہائی کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو دوبارہ جاری ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں یہ یادداشتیں ”ناقابلِ فراموش“ کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ بعد کو ان کا ایک مختصر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی ہر دلعزیزی سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۷ء میں بڑے سائز کے ۱۵۵ صفحات پر شائع ہوئی۔ راجپوت کے قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ ”سیف و قلم“ کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے چھپ جائے، تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہوگا۔

تعلیم کی کمی کے باوجود انھوں نے ساری عمر کی مشق سے، اردو سے اچھی خاصی واقفیت

حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اغلاط سے پاک نہیں، لیکن ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے۔ ”ناقابل فراموش“ میں تسلسل منفقود ہے، جستہ جستہ واقعات ہیں۔ ہر ایک واقعے کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دینے کی کوشش بھی موجود ہے، جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود، اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی ”ترویجی“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انھیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیونکر سوچا جاسکتا ہے! بہر حال وہ پیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب ”جذبات مشرق“ بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمہ بھوپال کے بعد وہ تین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انھوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے منتخب اشعار کا تشریحی ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد مدتوں یہ تراجم بھی ”ریاست“ میں چھپتے رہے۔ انھیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست احباب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، انھوں نے انھیں ”مفتون“ کا لقب عطا کیا۔ اور یہ کچھ ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام ”دیوان سنگھ مفتون“ نہ کہیں، ان کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

مرحوم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادی وسائل یکسر ندارد، تعلیم نہ ہونے کے برابر، ہر طرح کے ہزیافن سے گورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے مفتور۔ لیکن ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں

خود اعتمادی کا یہ ثمرہ تھا کہ انھوں نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرائی۔ اور انھیں
اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ وہ آزادانہ جیے اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے



مسح الزماں، ڈاکٹر سید

ان کا خاندان جالس رنلج رلے بریلی، یوپی (کاسہ منے والا تھا)۔ ان کے والد سید
مہدی الزماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل، اور سماجی پہلو سے عمائد شہر میں
سے تھے۔

مسح الزماں ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جالس ہی میں پیدا ہوئے تعلیمی دور بہت کامیاب
رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بی، اے کے امتحان میں الہ آباد یونیورسٹی کے تمام اردو کے ابدواروں
میں اول آئے، تو چنتا منی گھوش کا یادگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد
وہیں سے ایم اے (اردو) کی سند پائی، جس میں پھر تمام طلباء میں اول رہنے پر کوٹریٹ
جملی تمغہ عطا ہوا، اس کے بعد پھر چاہتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل
کریں، لیکن اس وقت صدر شعبہ اردو ضامن علی ضامن (دف: ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء)
تھے۔ اور وہی ان کے تحقیقی کام کے نگران بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر
اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات ٹالٹی رہی، اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۶۸ء
میں وہ ڈی لٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم اے کرنے
کے بعد ۱۹۴۲ء میں وہیں اپنی یونیورسٹی میں اردو کے مدرس (لیکچرر) مقرر
ہو گئے؛ پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ
۱۹۵۲ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انہوں نے
بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے

بھی کام کیا (نمبر ۶۹ تا نومبر ۱۹۶۷ء) چونکہ وہاں تو بیع نہ ملی، اس لیے واپس الہ آباد چلے آتے۔

اگرچہ جسم کے لاغر اور قواء کے کمزور تھے، لیکن عام صحت کم و بیش ہمیشہ سٹھیک رہی۔ آخری وقت بہت دیر پانچ آیا۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جان بحق ہو گئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ کربلا، الہ آباد (ہمت کنج) میں دفن ہوئے۔

جائس کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی ان کا طرہ انبیار سہا ہے۔ سید مسیح الزماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان گھرانوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں صاحب علمی ذوق اور شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا؛ بلکہ عروض پر چند رساے بھی ان سے یادگار ہیں۔ مسیح الزماں مرحوم نے بھی فارسی انھیں کی نگرانی میں پڑھی، اور اس میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے: ڈراما اور مرثیہ۔ ڈراما کے فن کے مالہ، اور ماحلیہ سے خوف واقف تھے۔ یونیورسٹی میں ڈراماٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کی سرپرستی میں (خود مسیح الزماں صاحب کی نگرانی میں) ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی، بلکہ باہر شہر کے حلقوں میں بھی، ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں مسیح الزماں مرحوم کی مساعی کو بہت دخل ہے۔

جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اس میں تصنیف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا! اعتقاداً چونکہ شعبی تھے، اس لیے مرثیہ سے شغف بھی فطری بات تھی۔ ان کی پہلی کتاب ”مرثیہ میر“ تھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مرثیہ مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انھیں

کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ کتابیں یہ ہیں: (۲) اردو تنقید کی تاریخ؛ جلد اول (۱۹۵۲ء)؛ (۳) تعبیر تشریح، تنقید (۱۹۵۵ء)؛ یہ بعض مضامین اور مشرقی تقریروں کا مجموعہ ہے؛ (۴) ”حرف غزل“ (۱۹۵۷ء)؛ اس

میں اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گو یوں کا جائزہ لیا ہے؛ (۵) "امانت کی اندر سجھا" (۶۱۹۶۶)؛ نمن کی تصحیح کی گئی ہے، اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور اندر سجھا کی تدوین اور اس کی خوبوں اور خامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۶۱۹۶۸)؛ اردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اردو مرثیہ کا ارتقاء (۶۱۹۶۸)؛ ڈی لٹ کی سنار کا مقالہ؛ (۸) اردو مرثیہ کی روایت (۶۱۹۶۹) یہ گویا اردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) موازنہ انیس و دیر از شبلی (۶۱۹۷۰) مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیات مومن (۶۱۹۷۰)؛ مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیات میر؛ جلد دوم (۶۱۹۷۱)؛ غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین، اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) داغ کی شاعری (دہندی)؛ (۱۳) خورشید (۶۱۹۷۳)؛ پارسی تنقیر بمبئی کا پہلا اردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا؛ اسی کو بیات نو بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۶۱۹۷۰)؛ (۱۵) بیاسنہا متحدہ کی مختصر تاریخ (۶۱۹۷۴) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

ان کی شادی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

حیرت بدایونی، سید حسن

یونپی کے مردم خیز خطے بدایوں میں پیر کے دن ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء ۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور ناسھیال دونوں طرف سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے پشتوں سے ان کے بزرگ حکومت وقت کی ملازمت کرتے آئے تھے، اور گھر میں علم و فضل کا بھی دور دورہ منتھا۔

ان کے جد اعلیٰ قاضی محمد جلیس، بہار اور ننگ زیب میں قوادے عالمگیری کی ترتیب و تدوین شریک رہے تھے۔ اسی باعث ان کے بعد یہ خاندان "قاضی زادے" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بدایوں کے جس محلے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہ آج تک "قاضی ٹولہ" کہلاتا ہے۔

ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صدر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے، زمینداری بھی تھی۔ غرض دینی عزت اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے لیکن یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ انھیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری انھوں نے اپنے شایان شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا رفتہ رفتہ ساری املاک بک گئیں، جہاں عیش کے نقارے بجتے تھے، وہاں افلاس نے چھاؤنی چھالی۔

بدایوں کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شعر و حکمت کے امتزاج کا نام تھا۔

سید حسن کچھ حالات سے مجبور کچھ اپنی افتادِ طبع کا تقاضا، ان کی تنہا کا آغاز بھی عربی اور دینیات سے ہوا۔ اور بالآخر مدرسہ قادریہ اور مدرسہ شمس العلوم سے عربی اور علومِ قرآنی میں سندِ فراغ حاصل کی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (عربی) کے اعلیٰ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔

تعلیم جس نہج پر ہوئی تھی، اس میں معلمی کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چند سے انبالہ، بدایون، کانپور کے باقی اسکولوں میں مدرس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیبوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آ گئے، جوش و خروش سے میدانِ عمل میں کود پڑے اور جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرفتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب عاقبت اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ روپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدر آباد دکن پہنچے، جو اس دور میں شمالی ہند کے شرفا کا واحد ملجا و ماوا تھا۔ مہینہ بھر بعد جنوری ۱۹۲۳ء میں ریاست کے قانون کے مطابق حلف نامہ داخل کر کے ملکی صداقت نامہ ریاست کی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو، بلا ٹلی، مزید پیچھا نہ کیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

حیدر آباد میں بھی معلمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اولاً چند سے مدرسہ آصفیہ میں پڑھتے رہے، بعد کو شاہی خاندان کے نونہالوں کی درسگاہ ”مدرسہ اعزہ“ میں تبادلہ ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب کلیانی کے انالینق مقرر ہو کر پالیگاہ پر چلے گئے۔ دو تین برس بعد مہاراجا سرکشن پرشاد بمین السلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مہاراجا مرحوم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی نرتی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیردار کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔

یہی زمانہ ہے جب حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی تحریک چلی تھی۔ جب تک مہاراجا ان کی پشت پر تھے، سید حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے استعفا دے دیا، تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد پھر مہاراجا ہی کی وساطت سے انہیں محکمہ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۳۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پینشن پر سکدوش ہوئے۔ عمر بھر کے قیام نے حیدر آباد کو ان کا وطن ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور بدایون واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر بھر شاعر تھا۔ داد اعظمت علی ضیا، والد محمد حسن اثر، چچا محمد حسین سحر، بڑے بھائی محمد محسن، محسن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سلطان حسن کا تخلص ابر تھا۔ ایسی شعرزدہ فضا سے یہ کیونکر بچ سکتے تھے! غرض بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد کو اسے حیرت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی، جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے! اردو میں آئینہ (حیدر آباد ۱۹۷۳ء) اور فارسی میں ابرق (حیدر آباد ۱۹۷۴ء) مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں؛ یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ہفتے کے دن نماز مغرب کے بعد سو اساتذہ بچے راہی ملک بقا ہوئے۔ اگلے دن (۱۶ فروری) جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہِ یوسفین (نام پٹی) کے احاطے میں پائنتی کی طرف سپرد خاک ہوئے۔ امیر مینائی اور داغ بھی اسی درگاہ میں مجو خواب ابدی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

۱۹۲۵ء میں ان کی شادی جناب اعجاز حسین فرشوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ مجددِ تعالیٰ حیات ہیں، اردو و فارسی کی اچھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولادِ جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے مؤید حسن ایم۔ کام، رجنیل ریسرچ لیبارٹری میں آجس رے کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر افضل محمد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں ریڈر ہیں۔ اور سنجے احمد جلیس ایم، اے، انوار العلوم کالج میں اردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدین حسن حکومت ہند میں ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانوان کی بیٹی ہیں۔

کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط العام فصیح اور غلط العوام فصیح دونوں کو دھوکا سمجھتا ہوں؛ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں؛ غلطی عوام کی ہو یا خواص کی، وہ غلطی ہی رہے گی اور غلطی ہی کہلائے گی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام دیکھا جائے، تو آپ کو اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آئے گا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ شباب، وہ جوش، وہ دل نہ رہا؛ وہ تڑپ نہ رہی، وہ مزانہ رہا
تری آنکھ میں قدرِ وفانہ رہی، مرے دل میں مذاقِ جفانہ رہا
تری دھن میں گیا ہوں وہاں کہ جہاں نہ غم دل و جاں، نہ غم دو جہاں
کوئی دھن تری دھن کے سوانہ رہی، کوئی غم ترے غم کے سوانہ رہا
دل ہی کی زندگی سے ہے دنیا کی زندگی دنیا نہیں رہے گی، اگر دل نہیں رہا
حیرت! وہ میکشی نہ ہوئی، خود کشی ہوئی قابو میں جب زباں نہ رہی، دل نہیں رہا
رنج میں ہنسنا، عیش میں رونا، موت کی شادی، زیست کا غم
سارے زمانے سے الٹی دنیا، محبت، کیا کہنا!
دورِ شراب و نغمہ و گلشن، ابرِ سیاہ و موسمِ گل
آج کسی کی بزمِ طرب ہے غیرتِ جنت، کیا کہنا!
آج یہ کون انجن میں جلوہ فرما ہو گیا بزم کا عالم، ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا
میکدہ آباد، ساقی شاد، میکش زندہ باد آج ہم جیسے فقیروں کا ابھی پھیرا ہو گیا

غیروں کی وفا سے تو فراغت ہوئی حاصل
اپنوں کی جفا کا ہے ابھی بارِ گراں اور
دنیا فریبِ محض ہے، لیکن مفر نہیں
دنیا میں ہنوائی دنیا کیے بغیر
پھر ہوش میں آجائیں جنوں چھوڑ کے حیرت! اب دل کو نیاروگ لگانے کے نہیں ہم
تم نہیں ہو، تو برسات کس کام کی! آگ برسا رہے ہیں، یہ پانی کے دن
اپنی سی نہ کی کوئی کمی ہم نے دوام میں
چلتی نہیں انساں کی مگر، حکمِ خدا میں
ہے رحم کا وعدہ، تو کبھی قہر کی دھمکی
ڈالا مجھے کشمکشِ بیم و رحبا میں
پیتے ہیں محتسب بھی، اکیلے ہمیں نہیں
لیکن وہ پی کے گھر سے نکلنے کہیں نہیں
منزل وہی قدم ہے جہاں ٹوٹ جاتے دم
سچ پوچھیے تو عشق کی منزل کہیں نہیں

تم پہ میرا کوئی حق بھی نہیں، دعو کی بھی نہیں
آج تک میں نے اس انداز سے سوچا بھی نہیں

دل ہے نادان کہ کرتا ہے بھروسا تم پر
تم تو تم ہو، مجھے اب دل کا بھروسا بھی نہیں
اب یہ لگتا ہے کہ برسوں کی محبت ہے، مگر
اس سے پہلے تمہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں

تم مہربان تھے، تو سبھی مہربان تھے
تم مہربان نہیں تو کوئی مہربان نہیں
خبر سنی جو قفس میں بہار آنے کی
نظر میں پھر گئی تصویرِ آشیانے کی
شام سے صبح ہو گئی، صبح سے شام ہو گئی
آپ کے انتظار میں عمر تمام ہو گئی
ترکِ بادہ کی باتیں، پاکباز! رہنے دے
بادہ خوار باز آئے ایسے خیر خواہوں سے
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا
دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں
دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں
موسیٰ کو صد اُطوّر پہ آئی، تو یہ آئی
جاؤ بھی، بڑے آئے ہمیں دیکھنے والے!

موت ہے انسان کا آغزِ سبھی، انجام بھی
زندگی در حقیقت موت کی تاخیر ہے

مانا کہ دوسروں سے مخاطب ہیں وہ، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم سے خطاب ہے
تم نے کیا کر دیا، خدا جانے _____ دل ہمارا رہا، نہ ہم دل کے

دورانِ سفر میں رہیں رہیں، پایاں سفر معلوم نہیں
رہیں کو رخ منزل تو کجا، خود راہِ گزر معلوم نہیں
یہ چاند کا رنگیں دھوکا ہے، یا سچ مح نور کا تڑکا ہے
افسوس، ابھی آنا بھی تھیں، مرغانِ سحر معلوم نہیں

طوفانِ فضا میں چھا تو گیا، موجوں میں تلاطم آ تو گیا
اب دیکھیے، مکر ا جائے کہاں، طر جائے کدھر معلوم نہیں
اک ٹپس سی تر پا جاتی ہے، اک برق سی لہر ا جاتی ہے
کیا کہیے کہ سیلے میں زخمی دل ہے کہ جگر، معلوم نہیں

لاریب کہ صبح صادق کا دنیا میں تو برحق ہے آنا
البتہ ہمارے جیتے جی آئیگی سحر معلوم نہیں

ہر چند کہ ہو تم ہم سے خفا، اوروں کی طرف رخ ہے بھی تو کیا!
کیا ہم کو تمھاری آنکھوں کی افتادِ نظر معلوم نہیں؟

اٹھتے نہیں دل کی سمت قدم کرتے ہو طوافِ دیر و حرم
اللہ کے بندو! تم کو بھی اللہ کا گھر معلوم نہیں

مانا کہ افق پہ پھوٹی کرن، دنیا سے چمن بیدار ہوئی
آغازِ سحر معلوم سہی، انجامِ سحر معلوم نہیں

حیرت! اٹھیں انساں کیوں سمجھا! اب ہیں وہ پری، اب کیا شکوہ
جب حسنِ جوان ہو جاتا ہے، لگ جاتے ہیں پیر، معلوم نہیں؟

شمس مینری، حافظ شمس الدین احمد

ریاست بہار میں مینر بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہ حضرت شرف الدین عجمی کی سکونت
 اور رکھروہیں تدفین کی وجہ سے مینر شریف کہلاتا ہے۔ یہی مینر، شمس کے نزرگوں
 کا وطن تھا۔ ان کے والد ضمیر الدین صاحب معمولی کاشتکار تھے، محنتی، دیانتدار
 خا اترس اور تعلیم یافتہ۔ اسی لیے وہ لوگوں میں مولوی ضمیر الدین کے نام سے
 مشہور ہوئے۔ انھیں گاٹو کے زمیندار کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ترک وطن
 کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے گوالیار میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں
 نے بسا اوقات کے لیے ٹھیکیداری کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ فن تعمیر
 میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ انجینئر کہلانے لگے؛ اور پھر اسی حیثیت سے ریا
 میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بقیہ زندگی گوالیار ہی میں گزری۔ یہاں عزت بھی
 حاصل ہوئی، اور روپیہ بھی خوب کمایا؛ یہ خدا نے ان کی نیک ستمی کا پھل دیا۔
 ایک زمانے بعد وطن مالوٹ واپس آئے۔ اب دیکھیے قسمت کا کرشمہ! وہی
 زمیندار جس کی چہرہ دہشتوں سے تنگ آکر انھوں نے ہجرت کی تھی، اپنے
 لچھنوں کے طفیل، ان حالوں پہنچ چکا تھا کہ اس کی جا داؤد فروخت ہو رہی
 تھی۔ مولوی ضمیر الدین نے یہ جا داؤد خرید لی۔ تاکہ الایام ہمداد لہا بین الناس
 فرمان الہی ہے۔

شمس الدین احمد ۱۸۹۶ء میں ضلع ٹنہ کے گاٹو بلجھوری، اپنی نا انھیال میں پیدا

پیدا ہوئے۔ تعلیمی اور بہت شاندار دور رہا۔ دسویں کا امتحان ۱۹۱۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور فارسی میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ انٹر کا امتحان بھی پٹنہ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی ہی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور اب کے صوبہ بہار میں اول رہے۔ بی اے کے زمانے میں ان کے والد مولوی ضیاء الدین گوالیار میں مقیم تھے۔ یہ امتحان انھوں نے وکٹوریہ کالج، گوالیار سے، والد آباد یونیورسٹی سے دیا، جس کے ساتھ یہ کالج ملحق تھا؛ اپنے کالج میں اول آئے اور ریاست گوالیار سے وظیفہ ملا۔ اس زمانے میں مولوی احسن اللہ خان شاقب وکٹوریہ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے؛ شمس الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے ایم اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی، یونیورسٹی بھر میں اول آئے، اور طلائی تمغہ ملا۔ اسی دوران میں قانون کی سند (ایل ایل بی) بھی حاصل کر لی۔

اتنے شاندار تعلیمی دور کے بعد ملازمت میں کیا دشواری پیش آ سکتی تھی؛ منظور میں گریجویٹ ہاربر میں کالج تھا۔ شمس کا ۱۹۲۱ء میں وہاں اردو فارسی کے مدرس کی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ سال بھر بعد اونشا کالج، کنک (اڈیسہ) میں قانون کی تدریس مل گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بقیہ زمانہ ملازمت اسی کالج میں بسر ہوا؛ ۱۹۵۱ء میں ان کو انوار اکرام سے دیہی سے سکندرشہ ہوئے۔

مآخذ: پروفیسر سید حسن پٹنہ؛ جناب قسیم الحق گیاروی، پٹنہ

۷۔ یہ کالج ایک مالدار اور محیر بھوسہ ہار باؤنگٹ سنگھ نے قائم کیا تھا۔ گریجر (Greer) اس وقت حاکم ضلع تھا جس کا نام انھوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ آزادی کے بعد حکومت وقت نے کالج کا نام صرف بانی سے منسوب کر کے لنگٹ سنگھ کالج رکھ دیا (College named after L.)۔ چنانچہ اس وقت یہی نام ہے۔

ملازمت سے فادغ ہو کر اولاً انھوں نے دکالت شروع کی، لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ ساری عمر مدرسہ میں گزری تھی، قانون کے ساتھ زیادہ مسرکھی نہیں رہا تھا۔ لہذا اس میں کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں سننے میں شبینہ کا لٹ کھل گیا اور یہ تعلیم و تدریس کے لیے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن اب صحت بہت گر گئی تھی، اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر میں اس ٹیٹ کی شکایت ہو گئی۔ اسی عارضے میں ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔ درگاہ شاہ امدان میں دفن ہوئے۔

شعرونی کالج کے زمانے سے شروع کی، اور اس میں اپنے کالج کے استاد شاقب مرحوم کے مشورہ رہا۔ بعد کو جب شاقب کا کلام نظم و نثر ”گوہرین نامہ“ کے عنوان سے چھپا (لکھنؤ ۱۳۴۴ھ)، تو شمس نے اس کے شروع میں اردو میں تقریظ بھی لگان ہے کہ انھوں نے شاقب کے علاوہ اور کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”گلاباگ“ کے نام سے چھپ چکا ہے (ٹپنہ ۱۹۷۰ء) اس کے علاوہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کا مختصر انتخاب ”اشعارِ نظیر“ کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (الہ آباد)

انھوں نے اسی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی بیوی ان کی خالہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکا عین عالم شباب میں بجا لٹ جنون فوت ہو گیا؛ دوسرے حیات ہیں۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی؛ اس کی اولاد موجود ہے۔ تیسری بیوی کی اولاد بھی ماشاء اللہ خوش و خرم موجود ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

اللہ! یہ صنمکہ کیسا بنا دیا | اس خاکراں کو حسن کی دنیا بنا دیا
صد جلوہ ہائے بوقلموں سے جہان کو | آشوب گاہِ طور تجلی بنا دیا
دشتِ وحشت میں وہ اب پہلی سی رونق ہی نہیں

موت نے مجنوں کی، دیرانے کو دیراں کر دیا

کیا سکہ دشی ہوئی شمس! میری عشق میں

جان دی اللہ کو، دل نذر جاناں کر دیا

خزاں سے پامال ہو رہا ہے، چمن جو تھا اسی آرزو کا

جو گل بظاہر شگفتہ ہیں بھی، نہیں ہے نام ان میں بگڑ بگا

بھلا کر دگے بھلا ملیگا، بُرا کر دگے، بُرا ملیگا

اسی نے کاٹا ہے جس نے بویا، اسی نے چاٹا ہے جس نے تھوکا

اللہ ان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی۔ گویا کبھی ملے تھے کسی میہاں سے ہم

منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیو؟ بس یہ کہڑھ گئے ہیں ذرا کا داں سے ہم

کبھی ہم سے قول و قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی چاہ تھی، کبھی پیاد تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی وقت گرمی خوں بھی تھا، کبھی عہد زورِ جنوں بھی تھا

کبھی خوش عہد بہاد تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی جنگلوں میں قرار تھا، کبھی شغلِ سیر و شکار تھا

یہی لطفِ لیل و نہاد تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھے بہت تمہارے بھی مہی دم امتحانِ رہا کوئی

یہی ایک شمس نزا د تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہت کم ہیں جمالِ روئے یلی دیکھنے والے زیادہ ہیں فقط محل کا پردہ دیکھنے والے

نہ چل اوستِ جامِ کامرانی اس قدر تن کے

بہت دیکھی ہیں تقدیریں بگڑتی ہم نے بن بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور منائیں منتوں سے ہم

تیا مت ہے، مگر پھر روٹھ جانا آپ کا من کے

کوئی چھٹیا پڑے تو شمس جنگل کو کل جائیں

شالِ داغ ہم بھی منتظر بیٹھے ہیں ساون کے

ہونٹوں پر تسم کیوں کیا، گالوں میں لالی پھولوں کی
کچھ پھول ادھر بھی دیتی جا، ادھیچنے والی پھولوں کی!

بھاگن کی ہوا میں چلتی ہیں، شاخوں میں کلیاں کھلتی ہیں
اس فصل میں جو بن دکھلاتی ہے ڈالی ڈالی پھولوں کی

گنچوں کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیے کڑانے میں
باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب دوالی پھولوں کی
اپنے بیگانے ہوئے اے جانِ جاں تیرے لیے

بن گئے دشمن زمین و آسماں تیرے لیے
ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا، دوستوں نے دوستی

ہو گئے اپنے پر ایلے بدگماں تیرے لیے
کیسے ہم بیکر تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال

ایک آفت ہم پہ آئی ناگہاں تیرے لیے
سختیاں ساری سہیں تیرے لیے اے دلربا!

کھوئے سب آرام، اے آرامِ جاں تیرے لیے
جان تک اس نے لگا دیا چاہ کی بازی میں ہ
کچھ نہ دیکھا شمس نے سود و ذایاں تیرے لیے

یاد سے دُور بد و نظر نہ ہوئی	لاکھ جا ہا کہ ہو، مگر نہ ہوئی
شبِ فرقت گزری جائے گی	کون سی شب ہے، جو سحر نہ ہوئی؟
وہ طلب کیا، جو در پہ ٹھہر گئی!	وہ نظر کیا، جو پردہ در نہ ہوئی!
وہ دہ دہ جس کے تیرے	آتشِ شوق تیرے نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صحرا میں
شمسِ وحشی کو کبیا خبر نہ ہوئی!

اعجاز حسین، ڈاکٹر سید

ان کے والد کا نام سید محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریف اور مسکین طبع تھے لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سید حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ الہ آباد کے مضافات کے محلہ راجا پور میں خاصی جااد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں، نہ بیٹہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں شریف، لیکن غریب نوجوانوں سے کیں اور سب کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی ولادت اپنی ناخیاں میں ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں، ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینہ یقیناً اگست کا تھا، اور جمعہ کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یوم آزادی کی مناسبت سے اسے ۱۵ اگست بنایا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ ہے۔ اور بطیفہ یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا، نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو۔

سید حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ فوق نخلص کرتے تھے۔ بیک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ آنش سے ملتا ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف کسی

قسم کا کام کاج کرنا دون مرتبہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اندوختے سے سب شوق پورے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ نتیجہ وہی ہوا، جس کی کوئی بھی عقلمند پیش گوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت انہی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اجلا خرچ تک چلانا دوسرے ہو گیا۔ کہاں کبھی روپے کی وہ ریل پیل تھی، اور کہاں اب آمدنی گھٹنے گھٹتے ۲-۲۵ روپے ماہانہ رہ گئی۔

سیار اعجاز حسین کی تعلیمی رفتار بہت سست رہی۔ گھر کے ماحول کے باعث انھیں اردو اور فارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تنگ بندی کرنے لگے، لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان جاتی تھی؛ اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دو مرتبہ کامی کے بعد انھوں نے کھلتے کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا معیار نسبت کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے میونسٹرل کالج، الہ آباد میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میں بھی ایک مرتبہ ٹیل ہوئے؛ لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۲ء میں میونسٹرل کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھانے اور اپنے خرچ کی کفالت کرتے رہے۔ چونکہ اب سرکاری ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اول درجے میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور سو روپے ماہانہ کالیرجے اسکالرشپ بھی ملا۔ جس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی اور تشویش کچھ کم ہوئی۔ پھر جب ۱۹۲۹ء میں وہیں اردو کے مدرس کی جگہ نکلی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے کی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ اس میں اگر

افسوس کا کوئی پہلو تھا، تو یہ کہ ان کے وہ نانا (سید حسین) جنہوں نے انہیں پالا پوسا، پروان چڑھایا، پڑھایا لکھایا، ان کے آرام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم ہونے (۱۹۲۹ء اگست) سے پانچ مہینے پہلے (۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء) رحلت فرما چکے تھے۔ انہیں اپنے چہیتے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سید سجاد ظہیر مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۷۳ء) نے اپنے بعض ہمنیال احباب کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اس کے قیام اور استحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے۔ ان میں ڈاکٹر زیڈ، اے احمد (زین العابدین احمد) موجودہ رکنِ راجیہ سبھا، کنور محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ الہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہو گئی۔ جلسے ہونے لگے، جہاں بحث مباحثے ہوتے، اوریوں شہر کے ادبی حلقوں میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی سید اعجاز حسین بھی اسی سبھنور میں پہنچ گئے، بلکہ انجمن کے سکتر بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب ”نئے ادبی رجحانات“ اسی ماحول میں لکھی گئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے ایشیا میں داخلہ لے لیا تھا۔ موضوع مقالہ تھا: ”اردو شاعری پر تصوف کا اثر“ لیکن خدا معلوم کیوں، مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ دس بارہ برس بعد انہوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی سٹافانی اور مقالہ بعنوان ”مذہب و شاعری“ تیار کیا، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں

اسی عہدے پر رہے، پھر ریڈ مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پروفیسر رہنے کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسو روپیہ مہینہ کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، اسی وظیفے کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعف قواء قدرتی عمل ہے، جس سے مفر نہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طالب علم کے پی ایچ، ڈی کے امتحان کے سلسلے میں منظر پر (بہار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بیسود۔ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور پردیس میں اتوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جان بحق ہو گئے۔ لاش الہ آباد آئی اور اشوک نگر کے نواح میں سرستی گھاٹ کے قریب، اپنے نا خھیالی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) آئینہ معرفت؛ (۲) مختصر تاریخ ادب اردو؛ (۳) نئے ادبی رجحانات (۱۹۴۲ء)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملک ادب کے شاہزادے؛ (۶) اردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیات سیدنا حضرت سید طاہر سیف الدین مرحوم؛ (۹) ادبی ڈرائے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵ء)؛ (۱۱) اردو شاعری کا سماجی پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں۔

وہ ابھی طالب علم تھے، جب ان کے نانے انھیں روز افزوں آوارگی اور تماشہ بینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے؛ پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ مجددہ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ان کے نانا مرحوم شعر کہتے تھے۔ گھر پر کتابوں کا معقول ذخیرہ تھا۔ آغاز میں ماحول بھی رنگین اور شعر انگیز تھا۔ اسی لیے وہ بہت اوائل عمر میں شعر کہنے لگے؛ نخلص اعجاز تھا۔ بہت دن تک نانا آباہی سے اصلاح لی، لیکن جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے، تو انھوں نے اپنے میورسنٹرل کالج کے

اسسٹنٹ پروفیسر (عربی و فارسی) شیخ عہدی حسن نامری کا دامن سٹھاما۔ ان کی ادبی تربیت میں شیخ صاحب موصوف کا بہت ہاتھ سٹھا۔ دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کی بیاض سے حاصل کیے گئے ہیں۔

جذبِ دل نے نشترِ غم کو رگِ جاں کر دیا
درد کو اس طرح اپنایا کہ درماں کر دیا
پیکرِ مستی میں اک دھبّا سا سٹھا میرا وجود
فوقِ بینابی کے صدقے جس نے انساں کر دیا
موجِ غم سے داد کیا ملتی، دلِ برباد کی
میں نے خود، اعجازِ ابرقِ طرے کو طوفاں کر دیا

سفرِ حیات بھی ختم ہے، کہیں زندگی کا نشان نہیں
ابھی اور تھم کے میں دیکھتا، میرے بس ہیں عمر و اہل نہیں
میرے دل کی ہیں یہ کہانیاں جو بکھر گئی ہیں یہاں و ماں
یہ چمن میں لالہ و گل نہیں، یہ فلک پہ کہکشاں نہیں
نہ وہ تنگدہ میں کہیں ملا، نہ حرم میں اس کا پتا چلا
یہ اب اعترافِ شکست ہے، یہ جرس نہیں، یہ اذال نہیں
دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا، یہ سوال اہلِ ہوس سے کر
کہ میرا عشق عالمِ کیف ہے، یہ دیارِ سود و زیاں نہیں
میرے ٹوٹے دل کو نو دیکھیے کہ یہ غتے بنتے بنا ہے دل
میری عمر بھر کا ریاض ہے جو یہ آشنا نے فغاں نہیں

خدا ہی جانے، اب اس دل کا حال کیا ہوگا
کہ اس غریب کو مرنے کی بھی خوشی نہ رہی

بہا کیسی، کہاں کی خزاں، خدا جانے
 خیالِ دید میں کچھ فکر نہ نہ رہی
 ہمیں سجود ملائک نے یوں کیا برباد
 کہ بزمِ خاص میں کچھ قدرِ بندگی نہ رہی
 غمِ دوراں پہنچ آیا غمِ جاناں کے قریب
 آخر آہی کیا ہالہ مہِ تاباں کے قریب
 یہ تیری یاد ہے، یادِ دردِ محبت کی خلش
 اک کسک ہوتی ہے رہ رہ کے رگِ جاںِ قریب
 اک جیواں نے کیا، ذوقِ فنا سے محروم
 ورنہ یہ خضر بھی ہوتے کہیں انساں کے قریب
 ابھی ہے زخم کا احساس، فکرِ مرہم ہے
 ہنوز منزلِ اول ہے، غم فقط غم ہے
 متاعِ غم بھی نہ لٹ جائے اس اندھیرے میں
 چراغِ راہِ محبت میں روشنی کم ہے
 نہ کوئی ربط، نہ ترتیب، بزمِ انجم کی
 مگر غزل کی طرح دلکش و منظم ہے
 نہ مل سکا، نہ ملیگا کسی کو روزِ ابد
 مگر صحیفۂ عالم کا اک ورق کم ہے
 خللِ دماغ کا ہو یا سکونِ دل، اعجاز!
 یہ عشق جو بھی ہو، وجہِ قیامِ عالم ہے

نگاہوں کا ملنا تو پلِ سبھر سے کم سمجھا
 وہ مدت مگر جاوداں ہو گئی ہے

کمندِ زمین تابہ افلاک — پہنچی
 بلندی کی لپٹی عیاں ہو گئی ہے
 ہمہ نامرادی، ہمہ زندگانی
 محبت بھی اک داستان ہو گئی ہے
 اپنی بیگم کی زناات پر جو مرثیہ کہا تھا، اس کا پہلا بند ہے :
 یاد آیا ہے کہ جب سودائے پیش و کم نہ تھا
 دامنِ عہدِ جوانی آنسوؤں سے نم نہ تھا
 عالمِ شعر و شباب و مجمعِ احباب میں
 زندگی کا راستہ سیدھا تھا، پیچ و خم نہ تھا
 ذہن کی تکمیل ان ہاتھوں میں تھی، جن کے لیے
 کاسۂ علم و سہنر بھی جامِ جم سے کم نہ تھا
 گردشِ ایام کی اس چلیلائی دھوپ میں
 کاروانِ شوقِ لطفِ اندوز تھا، برہم نہ تھا
 تلخیِ حالات بن جاتی تھی، پیغامِ حیات
 راہ کا پتھر عصائے موسوی سے کم نہ تھا
 اس فضاے جانفزا میں ایک تبدیلی ہوتی
 چادرِ یکساہیت پر چڑھ گیا نگِ دوئی

شفقت کاظمی، سید فضل الحسن

یہ خاندان اہل تشیع کے امام ثامن حضرت امام رضا علیہ السلام کا نام لیوا تھا۔ جب ۱۲۴۳ھ میں ۱۸۱۸ء میں امام رضا کا انتقال ہو گیا، تو ان کے اخلاف عراقی نے کھل کھڑے ہوئے جسے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی۔ شفقت کے اصناف سبھی کا بل، مغربی سے ہوتے ہوئے اگر شمال مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پھر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقل مکان کیا اور آکر ڈیرہ غازی خان (قدیم) میں رخت سفر کھول دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی بھی کبھی بطور تخلص بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۲۵۰ فروری ۱۹۱۴ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی تھا۔ سید جزو علم ہے۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک سی محکمے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم

ہے قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۸ء کے سیلاب عظیم کی نذر ہو گیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پُرانے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی، دریائے رخ سے اندیشہ ہے کہ یہ بھی اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

تھا کہ وہ پولیس میں ہیں۔ گھر سے اپنے روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں سٹھانے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے۔ کام کے بعد اسے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں مکان پر آ جلتے۔ فیکر منٹس اور مرخان مرغ آوی سٹھے۔ محرم کی مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے، اور بعض اوقات اس کے لیے خاصی لمبی مسافت طے کر کے جاتے۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ اور کربلا سے قبرستان ٹالھی والا ڈیرہ غازی خان میں دفن ہوئے۔

شفقت صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعر کا مطالعہ خاص طور پر کیا۔ انھیں بیشتر شعریا دتھے، جن سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گویا ہان بن گئے۔

ان کے تعلیم پر کسی اچھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بارے، گھر میں تنوعت اور توکل کا ماحول تھا۔ والد کی پسن ۱۲-۱۳ء وہ بچہ ہی تھا تھی۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں انھیں کپڑے کڑھائی کے لیے دیتی رہتی تھیں۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ بہر حال تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اب شفقت نے مقامی انڈسٹریل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں بڑھتی کا کام، خاص کر فریج بنانا سیکھ لیا اور اس طرح چھینے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا۔

اسی زمانے میں وہ مرگی کے موزی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مدتوں اس کے دورے پڑتے رہے۔ مگر زیادہ دوا و دشن سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکارا ملا۔ لیکن اس کا اثر زبان کی خفقت سے لکنت کی شکل میں آخر تک رہا۔ وہ "ر" اور "ڑ" ٹھیک طرح سے نہیں ادا کر سکتے تھے۔

اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چیرا سی مقرر ہو گئے۔ سب افسران کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ چونکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے انھیں ترقی دے کر محو چنگی

بنادیا گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیپر مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں کمیٹی کے تمام اجلاسوں کی کارروائی قلمبند کرنے کا خاص وظیفہ نہیں روپے پینا الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اسے لاکر شیگی ترشی سے بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ آخری ایام میں انھیں ایک افسوسناک تجربہ ہوا۔ کمیٹی کے نئے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آئے، جو ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جاوید انھیں دق کرنا شروع کیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ان کا معمولی وظیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ شفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خودداری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ میعاد سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

شفقت نے شعر گوئی بعمر ۱۸ سال ۱۹۳۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت موہانی (دف: مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاعر کی میں قبول کر لیں۔ بچانے کیوں، انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد ندیم جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر کوآپریٹو محکمے میں ملازم رہے۔ افسر صدر فیضی امر و ہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعہ کلام ”خانہ زنجیر“ شائع ہو چکا ہے۔ بفقہم بفقہم بقیہ حیات ہیں۔

شفقت نے ندیم کے علاوہ صادق ایوبی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا۔ صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے یورپ کی مختلف زبانوں کے بلا مبائغہ بیسیوں افسانوں کا ترجمہ کیا۔ میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) ان کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ صادق نے انھوں نے افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا۔ اور غرض

نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قانون کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔ شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۴۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے اکھیں کامیابی ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مشورہ کرتے رہے، اس کے بعد ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ ”خاکِ پائے حسرت موہانی“ لکھتے رہے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دوستوں نے ”نغمۂ ناہید“ کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ تو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (منظر گر طرہ ۱۹۵۸ء)؛ نغمۂ حسرت (منظر گر طرہ ۱۹۵۹ء)؛ داغِ حسرت (دلاہور ۱۹۷۰ء)؛ نغمِ حسرت ملتے ہیں۔ بہت نختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجہ وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی عسیر الحالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ۱۹۴۱ء/۱۹۴۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا عارضہ لاحق ہو گیا اور آخر تک وبالِ جاں رہا۔ جون ۱۹۴۳ء میں دل کے مریض میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہ ہوں، اواخر ۱۹۷۳ء میں جسم کے بائیں حصے کو فالج نے بیکار کر دیا اور وہ مستقلاً صاحبِ فراش ہو گئے۔ حکومت نے توجہ کی اور اکھیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں ۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو فالج کا ذہنی طرف حملہ ہوا، جس سے بیہوش ہو گئے۔ اسی حالتِ غشی میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب کئی، اس لیے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام اکھیں اپنے والد کے جوار میں (کر بلائے ٹالھی والا میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ سید فدا بخاری نے ”مرگِ دلخراش“ سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ) عیسوی تاریخ میں سید چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ

لکھا :-

توڑی گردوں نے ہم پر یہ کیا جفا، ہاے !
 اٹھ گئی رسمِ اخلاصِ دل زملنے سے
 سینہ اپنا ہے، اور ترکشِ قضا، ہاے !
 بھو گئی شمعِ غمخاں وفا، ہاے !
 شاعرِ بے بدل، قادرِ کلامِ ادیب
 نذر گئی نکتہٴ سنج و سخن سرا، ہاے !
 تاجدارِ غزل، سقا بشبہٴ حسرت
 پیرِ سدا خود کو سمجھا وہ غاکِ ہاے

نکر تاریخ پر آئی یہ ندا، آزاد !

”سید شفقّت کاظمی چلا، ہاے“ (۱۹۷۵ء)

شفقت کی شادی اپنے چچا سید جند و شاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی سید
 جند و شاہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ مائوں حکومت کی ملازمت کی۔ اس سے
 سبکدوش ہوئے، تو اپنا مطب جاری کر لیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ آرام و
 آسائش کی زندگی گزاری۔ شفقت کی جسمانی اولاد صرف ایک لڑکا نجیب الحسن
 رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی، اے تک تعلیم پائی ہے۔

کافی ہے اپنے رفعِ تردد کے واسطے

ان کی نہیں بھی عرضِ وفا کے جواب میں

پیرا ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم

تھی شانِ اعتنا جو ترے اجتناب میں

دلچسپیاں بہت اولِ مرحوم ! تجھ سے ستمیں

جب تو نہیں، تو رونقِ بزمِ جہل نہیں

تجھ سے بچھڑ کے، سب کی نظر میں ذلیل ہیں

تو ہر باں نہیں، تو کوئی ہر باں نہیں

مقدّر میں لکھی تھی باہم جدائی نہ تم بیوفا ہو، نہ ہم بیوفا ہیں

بسر ہو ہی گئے دن زندگی کے تجھے کیا، شاد و پانا شاد تھے ہم

اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے
 کیا جانے کیوں زباں پہ ترا نام آگیا
 بات جب بڑھ گئی، تو کیا کرتے تھے ہم کو یار اسے اختصار نہ تھا
 بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت !
 خوشا وہ عہد کہ ان سے نہ تھی رشتا سائی
 سرگزشت حیات کیا کہنے ! خیر، اچھی بُری گزر بھی گئی
 بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی آخر میں تری جفا سے ہارا
 بکوں روئیں وہ تری دشمنی کو جن کو تری دوستی نے مارا
 کچھ اور بھی آسے تھے، لیکن جب وقت پڑا، تجھے پکارا
 تری نگاہ تو اکٹھی تھی بے سبب مجھ پر یہ اور بات ہے کہ مجھ کو فریب کھانا تھا
 بے وفائی عہد کرنے سکے وہ، تو کیا ہوا
 خود اپنی زندگی کو بھی ممکن تھا ثبات
 باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا، مگر باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار
 خوش ہو کے سہم رہا ہوں تری ہر جفا ہنوز
 ثابت نہیں اگرچہ کچھ اپنی خطا ہنوز
 وہ ایک درد جس نے بنا دی ہے جان پر
 وہ ایک درد جان سے پیار ہے آج تک
 گزری ہے نفس میں عمر، لیکن بھولے نہیں یادِ اشیاں ہم
 کچھ بس نہ چلا تری جفا پر دیکھا کیسے سوئے آسماں ہم
 اپنی قسمت تھا داغِ رسوائی کیا کریں اب تجھے پشیمان ہم !
 سب کا مقصود ذکر تھا تیرا جتنے تھے تجھے سناتے ہیں
 کیا ختم سفر یہ یاد کرتے گزریں جو مصیبتیں سفر میں
 ہر دم سے بے نیاز ہو کر لوٹ آئے ہیں تیری رہگزریں

ظلم و مہائیکگی، کہاں انک دنیا! _____ کہیں اپنا بھی خدا ہے کہ نہیں؟
جن کو تیری نگاہ بھول گئی _____ اب کوئی ان کو پوچھتا بھی نہیں

تھکا دیا ہے زمانے کی گردشوں نے بہت
تیری گلی میں اجازت ملے، تو دم نے لوں
زمانہ دیکھ چکا ہے مری دفا کا مال
کسی پہ اب نہ چلیکا تیری نظر کا فسون

جب نرا وارِ غم بھی نہ سمجھے گئے _____ ہم کریں اور امید کیا آپ سے!
آج حیراں ہیں یوں، آپ سے مل کے ہم _____ جیسے اب انک نہ تھے آشنا آپ سے

اس زباں سے ترا گلا کیوں ہوا _____ جس زباں سے تری شنا کی ہو

رو دھو کے یہ سال بھی گزرا _____ اب کے بھی پھرے نہ دن ہمارے

خود ہی ان انک جا پہنچے ہم _____ قاسد سے کچھ کہتے کہتے

تیری ادائے کرم، لاکھ و لکھ بیساری

مگر وہ دل جو تری بے رخی پہ مرتا ہے

جب اٹھ کے آگئے ہیں، تو اب اس سے کیا غرض

ہم بھی کبھی تھے آپ کی محفل میں، یا نہ تھے

کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پہ انفعال

آئی ہے تیری یاد جو پھرنا کہاں مجھے

جینے کی ہوس وہ کیا کریگا _____ مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

جفائے خاص کے لائق بھی کو ٹھیرایا

اب اور اس کے سوا کیا کرے دفا کوئی!

کسے خبر کہ حدیثِ جہاں کے پردے ہیں

خود اپنے غم کا فسانہ سنا گیا کوئی

ایسے نکلے تری انجن سے کہ ہم عمر سحر کے لینے بے ٹھکانا ہوتے
 جو ربیہا کے لائق تو سمجھا ہمیں
 اتنی امید بھی تھی کہاں آپ سے
 یاد کرنے پہ بھی یاد آتا نہیں
 کس گھڑی ہم ملے تھے کہاں آپ سے
 ان کا خیال، ان کا تصور ہے آج تک جن سے کہیں ملے، نہ کبھی جن سے بات کی
 لگتا ہے یوں کہ جیسے ابھی دل کی دل میں ہے
 حال آں کہ ان سے قصہ غم بار بار کہا

شمیم کرمانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ انظم گڑھ (یوپی) کا قصبہ کرمان آبادی وطن تھا لیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی ناسخیاں پارہ رخلع غازی پور میں ہوئی۔ کرمان کے سادات حضرت میر شمس الدین عرف میر شمس (ف: ۱۰۶۰ھ) کے نام سے وہیں پیر شمس کا اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سات حج پیادہ پا کیے تھے۔ اس علاقے میں ان کی کرامات کے وسیوں قصے زبانزد خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بطور تفاؤل ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا، گھر میں پیار کا نام شمسو تھا۔ ان سے تین بڑے بھائی تھے، علی بخش غصنفز، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن نور حسن خاتون ان سے چھوٹے تھے۔

جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر ہوئی جب یہ مرحلے طے ہو گیا، تو انھیں بڑے بھائی سید علی بخش غصنفز کے پاس گورکھپور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھپور کا قیام بہت مختصر رہا، جلد ہی وہاں سے واپس آکر انھوں نے وثیقہ عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی

کی تعلیم پائی اور اسی سے یونیورسٹی کے مولوی "اوٹر کامل" کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی مسرور فیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے؛ اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

وثیقہ عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی، اے وی ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ مقررہ تنخواہ قلیل تھی، اور جو کچھ واقعی ملتا تھا وہ قلیل تر تھا؛ اور ستم یہ کہ اس کی بھی وقت پر ادائیگی ہمیشہ غیر یقینی رہتی۔ یہ صورت حال کسی عنوان اطمینان بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدرسہ کو خیر باد کہہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی صنعتِ فلم سازی روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سید منور حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سید منور حسین کے ایک بھائی سید شوکت حسین رضوی فلمیں بناتے تھے، مشہور ملکہ ترنم نور جہاں ان کی بیوی تھیں۔ سید شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور پچھلی پچر کی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدرسہ سے اور قلیل آمدنی سے تنگ تو آ ہی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کا سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی راہ اختیار کی تھی؛ کچھ سید شوکت حسین نے بھی سبز باغ دکھائے؛ انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے اچند فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے زیر اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول سے انھیں اچھی

واقفیت تھی، فلموں کے لیے یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہو گئی؛ آواز بھی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے دور میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ لیکن انھیں فلم کا خالص کاروباری ماحول اس نہ آیا۔ انھوں نے گھر کی زمینداری دیکھی تھی، اگرچہ ان تک آنے آتے وہ رئیسانہ سٹاٹ باٹ سب ختم ہو چکا تھا، تاہم ابھی رسی کا بل نہیں گیا تھا۔ غرض کہ جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی اے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری اُن کی دسترس سے باہر تھی کیونکہ ان کی غیر حاضری میں وہاں اور انتظام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر دہائی کی کشش غالب آنے لگی، جو اردو، فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی کسٹڈین کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی اسامی پر متمکن تھے۔

انھیں اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، توہم کے سببی شکار تھے اسی باعث اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے اردن اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ معاینے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی نس پھٹ گئی ہے۔ اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ ان کا جنازہ ۳ جنوری ۱۹۷۶ء کو نگر ام کے میر حسن عسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا۔ پرنسپل سر سید احتشام حسین مرحوم دفن: ۲۷/۱۹۷۶ء ان کے

ہمزلف تھے۔ دونوں برائیں ایک ہی دن گئی تھیں۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور چھوٹی ہاشمی بانو، سید احتشام حسین کے شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں سید حسین اختر (عرف مراد) سید عابد اختر (عرف عماد) اور سید باقر اختر (عرف سلمان)۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ والد شاعر تھے؛ اختر ان کا تخلص تھا۔ بڑے منجملے سجائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا، حکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے سجائی سید احمد علی، حمزہ سید محمد علی، سب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ غرض ان کے بچپن میں ان کے ارد گرد شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کسی میں انک بندی کرنے لگے۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوز خوانی پر بھی توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے لکھتے رہے۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے۔ چندے آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں، جن کا مجموعہ بعد کو ”روشن اندھیرا“ کے عنوان سے چھپا۔ (۱۹۴۳ء) اس کا سارا خرچ ربیع احمد فدوائی مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۵۴ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: برق و باران (منظومات)؛ عکسِ گل (لکھنؤ، ۱۹۶۴ء)؛ حرفِ نیم شب (دلی: ۱۹۷۲ء)؛ جانِ برادر (دلی: ۱۹۷۳ء)؛ پروفیسر احتشام حسین کا مرتبہ؛ صبحِ فاران (دلی: ۱۹۷۲ء) انھوں نے پڑت جواہر لال نہرو مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۴ء) کی فرمائش پر جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ ”تلاشِ سر“ کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعذرا ابواب موقت الشیوعہ جرائد میں

شائع ہوئے تھے، لیکن افسوس کہ یہ نظم مکمل نہ ہو سکی۔ اور بھی مختصر بہ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ان کا کلام سیدہ بختہ اور بلوغ ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے صفِ اول کے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بر باد سہی لیکن، بر باد غمِ دل ہوں _____ آنکھوں سے لگا مجھ کو، گر درو منزل ہوں

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے

ایک براتِ آچکی، ایک براتِ اور ہے

ان کو شمیم! کس طرح نامہ آرزو لکھیں

نگھے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

گرا تھا جام، نہ ٹوٹا تھا کوئی آئینہ _____ شکستِ دل کی سبلا آپ کو خبر کیوں ہوا

کبھی نہ روٹھنے والے بھی روٹھ جاتے ہیں _____ یہ بات پیار میں ہوتی تو ہے، مگر کیوں ہوا

دل سے شمیم! گفتگو، کیجئے کب تک چلے

رات بھی مختصر نہیں، بات بھی مختصر نہیں

جو میکرے میں ہو جھگڑا، تو پہلے یہ دیکھو

کہ میکرے میں کہیں شیخ و برہمن تو نہیں

بہشت سے بھی زیادہ حسین نظر آئی _____ وہ سرزمین جو مالِ گناہِ آدم ہے

آدابِ جنوں مانگے، آئینِ وفا مانگے

کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے

اک جانِ طلبِ تم ہو، تم مل ہی نہیں سکتے

دنیا سے یہ دل آخر، مانگے بھی تو کیا مانگے

دنیا کے اجالوں نے لوٹا ہے، شمیم! ایسا

دل بزمِ چراغاں میں، آندھی کی دعا مانگے

بہ بتاؤ کہ تبسم بھی ہے اک زخم کا نام _____ چاک ہے کس لیے انسان کا سینہ، نہ کہو

تذکرہ معاصرین

احساس انا کیا ہے، احساس وجود اپنا
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جا تھکے ہم تنہا
ہمیں بھی دیکھ کہ شاید تجھے نہیں معلوم
"جہاں نگر" ہمہ عالم ہے "خود نگر" تنہا
اب اپنے ساتھ مجھ غم زما نہ ہے
چلے تھے جب تو غم دل سقا ہمسفر تنہا
نہ جانے غربت اہل نظر پہ کیا گزرے
زمانہ سنگ بکف اور شیشہ گر تنہا
ایسا نہ ہو کہ جوش جنوں سختک کے بیٹھ جائے
ہو قی رہے خرد سے ملاقات گاہ گاہ

شکستِ گل کا تبسم بھی حرفِ دلکش ہے مگر کہاں ترے اندازِ گفتگو کی طرح
تمہاری بات نہیں ہم تو با وفا کھڑے گلہ ہے ان سے جو ایفائے عہد تک جیسے
زخمِ جبین کا ماجرا، تم سے، تبسم! کیا کہیں!
کوچہ غیر سے نہیں، اپنی گلی سے آئے ہیں
سمجھے ہے مفہومِ نظر کا، دل کا اشارہ جانے ہے
ہم تم چپ ہیں، لیکن دنیا حال ہمارا جانے ہے
ہلکی ہوا کے اک جھونکے میں، کیسے کیسے پھول گرے
گلشن کے گل پوش نہ جانیں، گلشن سارا جانے ہے
شمعِ تنہا، پھیلے پیر تک، درد کا آنسو بن ہی گئی
شام کا تارا کیسے ڈوبا، صبح کا تارا جانے ہے
کیا کیا ہیں آئینِ تماشا، کیا کیا ہیں آدابِ نظر
چشمِ موس یہ سب کیا جانے، وہ تو نظارہ جانے ہے

اپنے شمیم رسوا کو تم جانو ہوا سب جان کوئی
 بستی ساری پہچانے ہے، صحر ا سارا جانے ہے
 شمیم! عہدِ گذشتہ کی گفتگو نہ کرو وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بات گئی
 ملکوں کی چمک پہ گرتے ہوئے، دیکھا ہے شیخ و برہمن کو
 پھر میرے کھنڈر کی قیمت کیا، جب دیرو حریم بک جاتے ہیں
 جو کہ رہے ہیں کہ آنی نظر نہ منزل دوست
 وہ لوگ جانبِ دیرو حریم گئے ہونگے
 غم عشقِ دل کو بخشے، جوتاشِ جاودانی
 تو حیاتِ محقر کا غم بے ثبات کیا ہے
 جو مذاقِ رنگ و بو ہو، تو دلوں کا بھید کیسا
 کہیں موجِ گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے؟
 خاموش نہ تھا دل بھی، خواہید نہ تھے ہم بھی
 تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عالم بھی

مانی ناگپوری، بشیر خان

ان کا خاندان دہلی سبھوپال کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں ترک وطن کر کے ناگپور چلے آئے، اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے: کریم خان، منیر خان، نظیر خان، نصیر خان، سب سے بڑے کریم خان ہی بشیر مانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگپور کے مشہور سپٹان گل حیر خان کی دختر امتیاز بی سے ہوئی تھی۔ امتیاز بی اپنی ناسخیال کی طرف سے ایک نو مسلم گونڈ خاندان سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے یہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن جو خانم تھیں۔ ان کا عنفوانِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ناسخیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان، خانہ و اماں تھے۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی، اور اردو تعلیم کے علاوہ دسویں و سب سے تک انگریزی بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے، والدہ ۱۹۳۸ء میں سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت نانا کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ والد اعلم بالفتواب۔

بشیر خان شروع سے مخنی اور کمزور قوام کے ہونے کے باعث کسی محنت کے کام کے گون نہیں
تھے۔ لہذا عمر بھر کہیں مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چندے ایک قریب کی مینیکا نیز
کی کان میں کلر کی کی؛ معلمی کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر
تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعفِ معدہ کے دائمی مریض تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اسخیں میں
متلا ہو کر میوزل اسپتال، ناگیور میں علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے
دن ۳ مئی ۱۹۷۵ء شام کو مالکِ حقیقی کا بلاوا آگیا۔ اور اگلے دن (۴ مئی) دوپہر
بعد مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا مینر خان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔
ڈیڑھ دو سال بعد بیوی کا زچگی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا
نکاح مرحومہ کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس یکم کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے؛
چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاء اللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

مانی ابھی اسکول کے آخری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے
میں پروفیسر منظور حسین شورا اور محمد حبیب اللہ خان غفنی تلمیذِ شفیعِ اردو ہوی
(ف: ۱۹۲۲ء) وہیں ہائی اسکول اسکول، ناگیور میں فارسی اور اردو پڑھاتے
تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلاؤٹھوی (ف: مئی ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی
کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ مانی بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے کوشش
کی کہ انبال احمد خان سہیل، ظلم گڑھی (ف: نومبر ۱۹۵۵ء) اسخیں اپنی شاگردی
میں قبول کر لیں۔ لیکن مرحوم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد مانی
نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزلت پسند اور نام و نمود سے متنفر تھی،
اس لیے کسی کے در پر نہیں گئے۔

افسوس کہ مجموعہ کلام زندگی میں شائع نہیں ہوا، اگرچہ اسے خود ہی "صحیفہ صنم" کے نام
سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ اسی سے چند شعر

نمونے کے طور پر درج کر رہا ہوں، جو ان کے شاگرد عرفان فنوجی اور محمد عبدالحلیم (ناگپور) کی مہربانی سے حاصل ہوتے ہیں:

میں یاد گرفتاری بڑھ جاتی، تو اچھا ستھا
شرم آتی ہے گھر جاتے، چھوٹے ہوئے زنداں سے
سخنوروں کا شعر میں خیال جیسے لڑ پڑے
جو بات ان کے دل میں ہے، وہی ہے میری آرزو

نواز شمس غم دوراں سبھی پہ یکساں ہے گناہگار کا دل ہو کہ بیگناہ کا دل

تیر و سناں نگاہ کو باندھ گئے سخن طراز
چوٹ لگی ہے پھول سے زخم کھلے ہیں بات سے
کام کچھ گردش دوداں بھی نہ آتی، مانی!
پھر کہیں لوٹ کے وہ لیل و نہار آتے ہیں

اہل دانش نہ سنواریں گے جہاں کو، یارب! کوئی دیوانہ، اسی آب، اسی گل سے اکھٹا

باوضو سجدہ گزارانِ حرم صفا بستہ
تیری پلکیں ہیں کہ حجاج کا کعبہ میں ہجوم
کتنے دل ہو گئے احساں گناہ سے خالی
حسن نے دیکھ لیا، جب بنگاہِ معصوم
تبصرے لاکھ ہوئے، خالی رنجِ جاناں پر
ایک نکتہ ہے کہ کھلتا نہیں جس کا مفہوم

گم کردہ کیوں ہیں خلاؤں میں، یہ عالم لو کے دیوانے
مانی! یہی اپنی دنیا ہے شایانِ طوافِ شمس و قمر

بہتر ہے نگاہوں کی پناہ نگاہ مراد کہے ہیں گرفتار نہیں ہوتے ہیں قاتل

دل کو محرومی دانش یہ بھی آتی ہے کچھ درِ علم سے ہاتھ آیا، نہ حکمت سے ملا

مانی! منبر کوئی مقام نہیں عشقِ کاران، دار پر سمجھا

مضطر حیدری، دلاور حسین

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے دہلی پہنچے اور پٹنہ کے مختصر قیام کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کا آغاز مدرسہ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو سان جیمز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے اُبالی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے، دسویں درجے کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈرکٹا پننگ بن گئے، جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتہ میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی، تو بمبئی کی راہ لی کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں گیت یا نظماں لکھنے کا کام مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا، اور اسٹوڈیو نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے بھی لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور معاوضہ بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ دل برداشتہ ہو کر واپس کلکتہ چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے نانا ابا کی سرپرستی میں گزرا تھا؛ وہ شعر اور موسیقی کے رسیا تھے۔ دلاور حسین بھی انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے، ان سے بھی متاثر ہوئے۔ ادھر نانا جان اللہ کو

پارے ہو گئے۔ اب گویا سر پر کوئی نہ رہا۔ انھوں نے نانا کے مختصر ذخیرہ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا ہارمونیم لے کر موسیقی کی دھنیں بجانے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ اس میدان میں قدم رکھ دیا۔ شعر پر مستقل اصلاح کسی سے نہیں لی جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے پھرو سے پر مشاعروں میں سناتے رہے مالبتہ کلکتے کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہِ درسم تھی، انھیں کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ 'جامِ جم' کے عنوان سے اردو سبھا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں رباعیاں، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہم عصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے؛ ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ خالی نہیں۔ افسوس کہ عمر نے وفانہ کی۔ وہ سچا س برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، جس سے صحتیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس سے گھر اکرا انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اگلے دن لاش حاجی محمد حسن اسکوپر (کلکتہ) کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بچے تھے مانی یادگار چھوڑے۔

چمن والوں کے ہونٹوں پر ہیں شادابی کے افسانے
مگر افسردگیِ کلکتاں کچھ اور کہتی ہے
مکوتِ بحر کو تم دائمی کہہ لو، مگر مضطر!
سبک رفتاریِ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے
سوچا ہے کہ اک بت کو اب دل میں بسا لینے کے
دیران رہیگا یہ السد کا گھر کب تک!

دنت پر جھوٹی تسلی بھی سکون افزا ہے
پھر بھی مضطر! یہ سر سے درد کا درماں تو نہیں

ہماری داستاں اب نامکمل رہ نہیں سکتی
 زباں رک بھی گئی تو آنکھ سے آنسو رواں ہونگے
 خلوص ہو تو کہیں بندگی کی قید نہیں _____ صنمکدے میں طوافِ حرم بھی ممکن ہے
 رات کی بات کیا، رات گئی، بات گئی _____ صبح سے آنکھ ملاؤ کہ سحر ہوتی ہے
 یہ رسم عام نہیں پھر بھی ہم نے دیکھا ہے
 خود اپنی آگ میں پروانے جلنے لگتے ہیں
 عجیب حال ہے اس دل کا ان دنوں مضطر!
 ہنسی ہنسی میں بھی آنسو نکلنے لگتے ہیں
 کنجِ نفسِ مقتل تو نہیں ہے، جان بچی اور لاکھوں پائے
 صحنِ چمن کا ذکر نہ چھیڑو، بال و پیر کا نام نہ لو
 مے ان کی، میخانہ ان کا، جام ان کے، شیشہ ان کا
 تلخی مے کا شکوہ کیسا! کیفِ و اثر کا نام نہ لو
 کل کی بات، تھقی کل تک، مضطر! چھوٹ تھقی قیس کھانے کی
 آج قسم کھانے کے لیے بھی ان کے سر کا نام نہ لو

یہ ہمیں تھے کہ بھرم آپ کا رکھا ہم نے
 ہم کبھی حسرتِ دیدار سے آگے نہ بڑھے
 عبث ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو!
 نگاہِ ساتی بدل گئی ہے، شراب کی کچھ کمی نہیں ہے
 رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں
 ہمیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں
 یہ سنگ و خشت کو عظمت ہمیں نے بخشی ہے
 ہمیں نے دیر ہمیں نے حرم تراشے ہیں

اغترابِ دلِ نام سے ڈرتے ہیں
 رات تو دور ہے ہم شام سے ڈرتے ہیں
 قسمتِ نشوونما سراج ہے ہم نورِ مضطرب
 ہونگے وجہ اور جوابِ نام سے ڈرتے ہیں
 شبِ بھمی رات ڈھلتی ہے، ڈھلنے دو، کھل اٹھیں گے چمن اُرت بدلتے تو دور
 صبحِ روشن کا سورج نکلے تو دور، ہرکلی پھول بن کر نکھر جائیگی
 ظلمتِ شب سے اے دل! ہراساں نہ ہو، تارے گن گن کے ناحق پریشاں نہ ہو
 لاکھ بھاری سہی، رات پھر رات ہے خود گزرتے گزرتے گزر جائیگی
 ہم ٹھہرے، مہوش شراپی، ہسکی باتیں کرتے ہیں
 ذہن میں وائیل کے بھی خلل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 اک لٹے کا اڑن سہم بھی ہے بہت مایوس نہ ہو
 عمر کا حاصل اک یہی پل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 شامِ ابد کے دھندلے بادل چھاتے ہیں ہر سمت مگر
 رات کے، پھر صبح ازل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 مری چارہ سازی کی فکر ہے، مرے ساتھ تیرا بھی ذکر ہے
 مرا حال دیکھ کے چارہ گر ترے نام تک تو پہنچ گئے
 وہ نگاہِ نازکھی ادھر، تو پیام تک تو پہنچ گئے
 کبھی ہم کلام بھی ہونگے ہم کہ سلام تک تو پہنچ گئے
 اب تو اظہارِ تمنا سے بھی جی ڈرتا ہے
 اتنے سہمے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

محنت جاں بھی ہے، جاں بلب بھی ہے
 دل کا عالم جو کلی تھا، اب بھی ہے

فطرتِ حسن کو تکی کیا سمجھے
 بے نیازی بھی ہے، طلب بھی ہے
 مضطر بروزِ حشر بھی ٹھہرے گناہگار
 وہ بچ گئے وہاں بھی، عجب اتفاق ہے
 افسانہ خاموشی، یہ اشکِ غم، یہ شمعِ انجمن
 چھڑ دی کس نے بھری محفل میں پروانے کی بات
 کیا جانے کہیں آگ ہے یہ؛ شعلوں کا پتلا ہے، اور نہ دھواں
 محسوس مگر ہوتا ہے یہی، جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں
 فطرت میں ازل ہی سے میری، نیرنگی و ندرت ہے مضطر!
 افسانہ تو ہوں میں ایک، مگر عنوان بدلتا رہتا ہے
 کچھ اور مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے _____ ہم اپنے سفینے کو ڈبو بھی نہیں سکتے۔
 ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر _____ جن کو ساحلِ نظر نہیں آتا
 ترے فراق کی لذت پہ ناز کرتا ہوں _____ ترا وصال تو خواب و خیال ہے اے دوست!
 شب کی تنہائی مزہ دینے لگی _____ دن بھی اب یوں ہی گزارا جاوے
 منتظر کل بھی سختے کسی کے ہم _____ آج بھی انتظار کرتے ہیں
 کم نظروں کے اور اک وگماں سے آگے _____ اس مفسدہ پر دازِ جہاں سے آگے
 اے قافلے والو! نہ یہاں پر ٹھہرو _____ منزل ہے ابھی دور، یہاں سے آگے
 بجلی کی چمک قید کرو، تو جانیں _____ کوندے کی لپک قید کرو، تو جانیں
 مانا کہ گلشن پہ تمھارا قبضہ نہ _____ پھولوں کی ہلک قید کرو، تو جانیں
 میخانے میں یہ پسند و نصیحت کیسی!
 اسراف و قناعت کی حکایت کیسی!
 اے اپنی ہے، جامِ اپنا، صراحی اپنی
 اے پیرِ مغاں! تیری اجازت کیسی!

ذوالفقار علی بخاری، سید

ان کے خاندان کا مسقط الرأس وسطی ایشیا کا مشہور مرکزِ علیم اسلامیہ شہر بخارا تھا، جہاں سے ان کے اجداد اسٹارہوین صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر جنتِ نظیر میں آئے تھے۔ ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب مرحوم پیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے خانی شہرت حاصل کی سب سے بڑے پیر سید محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے؛ رفعتِ تخلص تھا۔ منجھلے سید احمد شاہ بخاری تھے، جنہیں اردو دنیا "پطرس" کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انہیں بھلا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں انتقال ہوا۔ اردو والوں کی جیسی اور بے توفیقی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ آج تک ان کی سوانح عمری نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے یہی سید ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں بہت ساری سطوریں پیش کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دونوں سہائوں نے ”پیر“ کے سابقے سے کس طرح چھٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب ”سرگزشت“ میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سہاٹی جان کا پورا نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا، اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ بخاری۔ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت لینے کے اہل نہیں تھے، لہذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بنائے رکھیں۔ چنانچہ سہاٹی جان ”پیر احمد شاہ“ سے احمد شاہ ہو گئے، اور میں ”پیر سید ذوالفقار علی شاہ“ سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر تھے۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں قابلیت کے باعث ان سے بہت محبت کرتے تھے؛ اور انھیں صرف ”پیر“ کے نام سے پکارتے تھے لیکن لفظ پیر کا تلفظ اس طرح کرتے جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پیئر بالکل اسی طرح جیسا کہ پیٹر سوپ میں ہے (فرانسیسی پیئر، انگریزی میں پیٹر ہے اور فرانسیسی میں پطرس۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر کا نام سنا ہوگا؛ انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ غرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پیٹر لکھنے لگے؛ بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پیٹر ڈاکٹر لکھتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ میں چھپے تھے، ان کے ساتھ نام پیٹر ڈاکٹر (Peter Watkins) ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کر لوں:

سید امتیاز علی تاج (ف: اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ ”کھکشاں“

جاری کیا؛ بڑے ٹھاٹ کا پرچہ ستھایہ۔ چونکہ اس وقت بیشتر صرف اڈل کے ادیبوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھے؛ وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھنے لگے۔ انہیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے؛ یہ کالج میں تاج کے اجتماعت بھی رہے۔ بخاری نے ”کہکشاں“ کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھا؛ یونانی حکماء اور ان کے خیالات“ اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ ”پطرس“ کا قلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپے اور نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی دو تین قسطوں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا، لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے سہواً ”پطرس“ کے ساتھ ان کا پورا نام ”احمد شاہ بخاری“ بھی لکھ دیا۔ اوریوں یہ راز فاش ہو گیا کہ ”کون“ معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں“ اب چونکہ سب کو معلوم ہو ہی گیا تھا، اس لیے اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے بھی یہ قلمی نام اختیار کر لیا، اور کھلے بندوں اسے اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے بھائی ”ذوالفقار علی بخاری“ ہو گئے۔ اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے ریڈ۔ اے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال۔۔۔ ہوا یہ کہ ایک دن پشاور میں ان کے کسی دوست نے انہیں بتایا کہ اخباریں بینام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ سبلا بتاؤ، اتنی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے ”ٹریبیون“ اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ ورک ویشیں یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجہ اشتہار پڑھنے پر درخواست بھیج دی، اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)

اور پروفیسر محمد سعید کے نام لکھ دیے کہ اگر میرے بارے میں مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو، تو ان اصحاب سے رجوع کیا جائے۔ قصہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومت ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اصناف نے ایک ممتحنین کا بورڈ قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جاسکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر شملے میں تھا۔ وہ اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن ذوالفقار علی بخاری مقرر ہوتے تھے۔

یہ بہت ذمے داری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجور (جون ۱۹۲۳ء) اس بورڈ کے رکن تھے جس جگہ بر ذوالفقار علی بخاری کا تقرر ہوا تھا، یہ ۱۹۲۰ء میں رنجور کے نشین پر سبکدوش ہوتے سے خالی ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس ساڑھے دس برس متمکن رہے۔

اگرچہ بمبئی اور کلکتہ میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی، لندن نے حکومت ہند کی درخواست پر مٹرلائینل فیلڈن (ف: لندن، ۳ جون ۱۹۳۴ء) کو ہندوستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں کارکنوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے معاون ثابت ہو سکیں۔ ذوالفقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست فیلڈن سے ان کا ذکر کیا، بخاری نے بھی درخواست بھیج دی، اور بالآخر انتحابی بورڈ نے ان کا آئی اسٹیشن میں پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔

فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا نام

سمجھ رکھ لیجیے، وہ محکمے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لارڈ ولنکڈن والیسراے سے ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے جیب بھی کوئی محکمانہ یا دفتری قسم کی دشواری پیش آئی، جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوئی، وہ سیدھے ولنکڈن کے پاس چلے گئے؛ اور ان سے، جو حکم چاہا، جاری کرا لائے۔

ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ تھوڑے دن بعد فیلڈن کی خواہش پر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی دئی آ گئے۔ اویہاں دلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو ترقی ملی اور یہ ان کے نائب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بن گئے۔ ذرا خیال فرمائیے، بڑا بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر، اور چھوٹا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اور کنٹرولر جنرل، فیلڈن، ان دونوں کا یارِ غار، گویا ان کی جیب ہیں۔ اس پر سردار دیوان سنگھ مفتون (ف: جنوری ۱۹۷۵ء) نے سچبتی کسی کہ ایک بی بی سی لنڈن میں ہے، اور ایک بی بی سی دلی میں، یعنی بخاری برادرین کا رپورٹیشن جو آل انڈیا ریڈیو کی کرتا دھرتا ہے۔

تھوڑے دن بعد جب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بمبئی تبادلہ ہو گیا، تو ان کی جگہ پطرس ڈپٹی کنٹرولر بن گئے، اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا :

کسی نے پوچھا : حضرت ! اب یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت میں جب تک پورا نام نہ لیا جائے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں ؟ محض بخاری کہہ دینے سے القباس کا اندیشہ ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے اور تعین بھی ہو جائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری)

صحیح بخاری، اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) غلط بخاری، اس بات پر ایک فقہیہ پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپک کے رہ گیا کہ اس کے بعد بیشکلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں بھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں ہی سے اشارہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے (یا کہیے فیلڈن نے) فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو انگلستان بھیجا جائے جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سکٹر (مسٹر آچاریہ) اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ غرض سال بھر سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری واپس آئے، لیکن دلی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلی میں قیام نہیں رہے گا چنانچہ یہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیام بمبئی کے دوران میں انھوں نے روزمرہ کے کام کے لیے گجراتی اور مراٹھی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں، اگرچہ خود انک انک کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھتے خوب تھے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ عہد حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدان ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ فریقین کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب انک اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین نہ دلا دے کہ جنگ مفادِ عامہ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پر مبنی ہے، اسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورتِ حال کی اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا

ہے کہ فوج تو لڑنے کو میدان جنگ میں جاتی ہے، اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آ جاتے ہیں، لوگوں پر یہ واضح کرنے کو اور انہیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوتی ہے کہ ملک کی آزادی، بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ قدر کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں۔ پس، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تائید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومت برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین بھی پورے زور شور سے حرکت میں آ گئی۔ بی بی سی، لندن نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز سے تیز کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے و دھاندلوں پر تھے؛ ایک خود ہندستان میں؛ دوسرے وہ ہندستانی قہر میں بریو سپ اور ایشیا اور افریقا کے جنگ کے میدانوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے عملے میں کئی اردو دان حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسب ضرورت مختلف محاذوں پر جا کر ہندستانی فوجیوں سے ملتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور سفارشیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک اتحادی ادارہ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی ادارے کے ہندوستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ادارے کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ مختلف ممالک کے اصحاب مجاز کو برطانی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پر آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پر دورے کو گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں عارضی طور پر ”میجر“ کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

لندن سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتہ ہو گیا۔ یہاں انہوں

نے بنگالی سیکھی۔ ان کا بنگالی کا علم اور معیار گجراتی اور مراٹھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں بیتکلف تقریر کر سکتے تھے۔ کھلتے سے انہیں پھر بمبئی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی ملی ہے، تو وہ بمبئی ہی میں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ بمبئی میں تھے کہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں انہیں امریکا کی مشہور فلم ساز کمپنی میٹرو گالڈون میئر نے فلمیں تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انہوں نے حکومت سے رخصت لی اور امریکا سدھارے۔ وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے، تو تقسیم ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ بھی پاکستان گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انہیں کارکھا ہوا ہے) اس سے پہلے نام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائریکٹر جنرل مقرر کئے گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے۔ علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں وہ گر گئے اور ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا، اتنے میں دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم رجب ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اتوار کو اٹھا، اور انہیں پی سی ایچ سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ نیران اکبر آبادی کا قطعہ تاریخ ہے؛ خبر مرگ زیڈے بخاری کی سن کر مری آنکھ سے ہو گئے اشک جاری یہ تاریخ فکرِ رسا سے ملی ہے جہاں سے لٹھے آج زیڈے بخاری“

(۱۳۹۵)

رئیس امر وہی کے قطعے میں ”ذوالفقار حقائق پناہ“ سے ۱۳۹۵ برآمد ہوتے

ہیں۔

اس برصغیر۔۔۔ ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں ذوالفقار علی بخاری نے جو نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی ذہانت اور طباعی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ میں انھیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شہہ بھر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سخی، حاضر جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جائے، تو انھیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔

ڈراما اور موسیقی ان کے مرغوب موضوع تھے۔ علما اور عملاً دونوں طرح۔ اور انھیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جغادری ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دل پسند مشغلہ بطور پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا، اور وہ زندگی بھر عیش کرتے رہے۔

انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کی تحریریں عموماً شائع نہیں ہوئیں، وہ ہمیشہ ثوب سے خوبر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائیں!

انھوں نے "حریت" کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ "مگر گزشت" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء) معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا، یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔ ذوالفقار علی بخاری شعر بھی کہتے تھے۔ وہ کلاسیکی انداز کے خوش فکر شاعر تھے۔ اگرچہ وہ نئے طرز فکر سے دامن کشاں نہیں گزرتے، لیکن بنیادی طور پر انھوں نے روایتی اسلوب سے روگردانی بھی نہیں کی۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

اے میرے شہر سے آنے والو! کچھ تو کہو، ہاں کچھ تو کہو
 اس شہر کے گھر آباد ہیں، یا آباد ہیں زنداں؟ کچھ تو کہو
 دامن کے چاک سے دور ہے کتنا چاک گریباں، کچھ تو کہو
 یا اب کے بھی بیصرفہ گزری فصل بہاراں، کچھ تو کہو
 کیا جوشِ جنوں کا رنگ رہا؟ کیا وحشت کے سامان ہوئے؟
 یا اب کے بھی بے فیض رہی پرسی رحمتِ باراں، کچھ تو کہو
 کیا صبح کو اب بھی بادِ صبا، پیغامِ محبت لاتی ہے؟
 کیا شام کو اب بھی لہرائی ہے کالِ چچیاں؟ کچھ تو کہو
 کیا بزم میں اب بھی ساغر مے سے چہرے روشن ہوتے ہیں؟
 کیا شام میں اب بھی ہوتا ہے محفل میں چراغاں؟ کچھ تو کہو
 وہ شہر کا واعظ، جو ہر ایک پہ کفر کا فتویٰ جڑتا تھا
 کس حال میں ہے وہ مردِ خدا؟ اے مردِ مسلمان! کچھ تو کہو
 ہاں موت سبھی کو آتی ہے، ہم سب کو مرنا ہے، لیکن
 اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے امکان؟ کچھ تو کہو
 گم کردہ راہ، خاکِ بسر ہوں، زرا ٹھہر
 اے تیز رو! غبارِ سفر ہوں، زرا ٹھہر
 رقصِ نمود یک دو نفسِ ادر بھی سہی
 دوشِ ہوا پہ مثلِ شر رہوں، زرا ٹھہر
 اپنا خرام تیز نہ کر، اے سیمِ زیست!
 بجھنے کو ہوں، چراغِ سحر ہوں، زرا ٹھہر
 مومِ موم سی امیاء ہوں، مجھ سے گریز کر
 اپنی کسی دعا کا اثر ہوں، زرا ٹھہر

سجدہ شوق کرے کون ادا، میرے بعد
آپ پھرتے رہیں، بن بن کے خدا، میرے بعد
ایک میں ہوں کہ مری یاد دلوں سے نہ مٹی
ورنہ ٹٹنے کو تو کیا کیا نہ مٹا! میرے بعد
میں ہوں سرسبز خزاں میں بھی بہاروں کی طرح
کس کو اس آئیگی یہ آب و ہوا، میرے بعد
کس کو آئیگا اسیری میں رہائی کا مزا
کس کو پہنا تینگے زنجیرِ وفا، میرے بعد

وصل کی شب بھی، بحر کی شب ہے،
تجھ سے شکوہ، سو واد ہے،
مرنے کا بھی کوئی سبب ہے
ساری دنیا کا وہ رب ہے
ایک سے بڑھ کر ایک غضب ہے،
سیرے جنوں میں بھی اک ڈھب ہے
جس کی طلب تھی، اس کی طلب ہے
کوئی ہمارا بھی منصب ہے
عشق کا مطرب مہر بلب ہے
جن سے عداوت جب تھی نہ اب ہے
مالِ عرب تھا، پیشِ عرب ہے

موجِ دل تہابِ طلب ہے
تو آقا ہے، میں بندہ ہوں
میراجِ تیسری خاطر
جس نے مجھ کو دل بخشا ہے
دل کا آنا، دل کا جانا
مجھ کو بس تیرا ہی جنوں ہے
اس دنیا میں، اس دنیا میں
ہم ہیں اور دیوار کا سا یہ
حسن کا نغمہ، اللہ اللہ!
وہ بھی میرے دست نہیں ہیں
دل حاضر ہے، دل کے مالک!

سب پیاسے ہیں، کون پلائے!
آنکھیں دیکھیں، جی لپٹائے
جب وہ کافر سامنے آئے

تیرا میرا منہ تکتے ہیں
حسن کا جلوہ، اللہ اللہ!
ایمانوں کا اللہ بلی

اللہ دے، اشیاء پر خدا کی کشش

ہم شناسا بھر کی تہ کے ہوئے
 اس توقع پر رہے کا نئے عزیز
 صحرے سے لوٹ لوٹ کے آتا ہوں گھر کو میں
 اور ساحل کے ستم سہ کے ہوئے
 دیکھ لوں دو گل کہیں یکے ہوئے
 جو بھی کچھ ہم ہیں یہیں رہ کے ہوئے
 ہم کو دیکھو، میکدے کے دشمنو!

پھر ہے گمراہیوں کی مجھ کو تلاش
 مجھ کو محفل میں باریاب کر دے
 پھر کوئی راہ پر نہ ہو جائے
 سجدہ گاہ، شاگ در نہ ہو جائے
 داندان بہم شود خسر من
 بجلیوں کو خبر نہ ہو جائے

غیب کی دو بیت عشق، عشق کی عنایت غم

غم ہزار لغت ہے، کوئی غم کو کیا جانے!
 اک صدا ہے جس پر ہم رقص کرتے رہتے ہیں
 وجد میں جو آجائے، زبرد ہم کو کیا جانے!
 نرم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
 کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے!

بہت ہو گئے، جو دردِ دل کو دردِ دل سمجھتے ہیں
 مگر ہم دردِ دل کو زلیت کا حاصل سمجھتے ہیں

عشق ہے آخر، موت نہیں ہے
 تل جائیگا تلنے تلنے

تیرے الطافِ گزشتہ مجھے یاد آتے ہیں
 غم فرا موش تو ہوں، لطف فرا موش نہیں

شورشِ عقل ہے برہم کنِ جمیعِ دل
سمہ تن حرف ہے تو، میں سمہ تن گوش نہیں
مندرجہ ذیل ان کی آخری غزل ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کہی تھی :

شام ہو، دوست ہوں، سُبُو بھی ہو
کرِ حق میں، ہوں صوفیانِ کرام
بزمِ یاراں میں، باسمہ آداب
ہوا اگر تیرا طرہ دستار
اور باتوں کے ساتھ حسبِ محل
کچھ تو آئے نظر، سرابِ ہی
ذہن کا ہے دلِ مسلمان ہے

اور خدا رکھے تجھ کو، تو بھی ہو
میساروں کی یاد ہو بھی ہو
تو ہی موضوعِ گفتگو بھی ہو
گل کی گلشن میں آبرو بھی ہو
آنکھوں آنکھوں میں گفتگو بھی ہو
کچھ تو انعامِ حبتو بھی ہو
ان میں ممکن ہے، دو بدو کنی ہو

نشر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان

ضلع جالندھر (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں میاں والی مولویاں (شخصیل کور) ہے، محمد عبدالحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے؛ ضلع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ جالندھری لکھتے تھے۔ بے بسی بڑی مردم خیز رہی ہے۔ عہدِ مذلیہ کے بعض مشہور علما یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدرالدین ادلیا۔ جب کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، تو انھوں نے بھی یہیں قیام کیا تھا، بلکہ میاں والی مولویاں کی بنیاد ہی انھوں نے رکھی تھی۔

نشر کے والد مولوی محمد اشرف خان مقامی پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے۔ نشر کا تعلیمی دور بہت متنازعہ؛ اپنے درجے میں ہمیشہ اول آتے۔ دسویں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا، جہاں اس وقت ان کے سہائی مولوی عبدالغفور خان مقیم تھے۔ اس امتحان میں بھی اول آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رائے گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔

شاغری بہت کمسنی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے زمانے میں اساکہ باران سے خلق خدا بہت پریشان تھی، ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون

لکھنے کو کہا۔ نشتر نے مضمون تو نشر میں لکھا، لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا :

الہی! قبول اس کی کر لے دعائیں
کہ مینھ کو ترستی ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گئی۔ کوئٹہ میں فوجی ملازمت کے امیدواروں کے لیے کیڈٹ کا بیج قائم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ نشتر نے بھی ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے درخواست دے دی۔ اور مقابلے کے امتحان میں یہاں بھی اول آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انھیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سروس پر یعنی باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ نشتر نے فیلڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے، اور عمر بھر ڈیڑھ سو روپے سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کچھ مدت بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد چنڈے "کیل" (امرتسر) کے ایڈیٹر رہے اور پھر لاہور آ گئے۔ اب انھوں نے مختلف ناشرین کے وہاں کام کرنا شروع کیا۔ بیسیوں کتابیں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوئیں۔ غرض ناشرین کے وارے نیا رہے ہوتے رہے، لیکن نشتر غریب نے زندگی بھر کبھی فارغ البالی کا منہ نہ دیکھا۔ شبنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیما بکری آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروز الدین (ف: اپریل ۱۹۴۹ء) نے انھیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیما بکری بپارے بھی کیا کرتے، اسٹیمپس روپے کی ضرورت تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی انھوں نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا اور اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ نشتر نے نہ صرف اس ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ خود چھپے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد کو الہام منظوم کے عنوان سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔

اس دوران میں نشتر نے ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں انٹر کے امتحان پاس کر لیے تھے۔ بی، اے کی تیاری کر رہے تھے کہ شادی ہو گئی۔ اس کے بعد کسبِ روزگار کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یوں تعلیم سے دست بردار ہونا پڑا۔

نشتر نے شروع میں کچھ دن نظم طباطبائی سے مشورہ سخن کیا، لیکن جلد ہی اسناد نے فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نشتر کو جملہ اصنافِ سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نام یہ ہیں: نشتر ادب، روح ادب، شرحِ بابِ جبریل وغیرہ۔

اتوار ۲۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

افسوس کہ باوجود تلاش، ان کے دونوں دیوان مہیا نہ ہو سکے۔ ایک تذکرے میں تین غزلیں ملیں، اسخیں میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

رخصت ہوا شباب، زمانہ گزر گیا
وہ ہم، نہ وہ جواب، زمانہ بدل گیا
پہلی سی وہ زمین نہیں، وہ آسمان نہیں
دنیا ہے جیسے خواب، زمانہ بدل گیا
ہنکامے عشق و حسن کے افسانہ ہو گئے
اللہ انقلاب، زمانہ بدل گیا
ارشاد جو حضور کا ہے، ہاں بجا، درست
بدلے نہیں جواب، زمانہ بدل گیا
نشتر جو شکوہ سخنِ تناقل ہوا کبھی
ہنس کر دیا جواب: "زمانہ بدل گیا"

یہ طرفہ بحر ہے، ساحل ہے موجِ موج اس کی
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں دواں ہیں مسافر تلاشیں منزل میں
اگرچہ جادۂ منزل نظر نہیں آتا
یہ اشک اشک نہیں، تنگ اشک ہیں، نشتر
جگر کا خون جو شامل نظر نہیں آتا

جو گلشن میں بہارِ فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں
تو دامن دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں
نگاہ ویرانی، دورِ رخ ہیں تصویرِ محبت کے
گلستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں
خود اپنا رہنما ہوں میں، بیابانِ تمنا میں
کہ ہر ذرے میں کوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

منظر لکھنؤی، سید منظر حسن

نجیب الطرفین یعنی ودھیالی اور ناٹھیالی دونوں سلسلے امام دہم حضرت نقی علیہ السلام سے جا ملتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب نجم الدین سب سے پہلے سبزوار سے ہندوستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندان اجتہاد کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، اور نصیر آباد کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا۔ لیکن کسی چیز کو وہ انہیں رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جد امجد سید وارث حسین صرف رئیس روضہ (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والد بزرگوار شمس الدین مولانا سید سبط حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں، بلحاظ خطیب ان کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ ان کا پنجشنبہ ۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ (۲ مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

منظر کی ٹھیک تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، جو خاندان اجتہاد کا خاندان تھا۔ سید سبط حسن ماہر لکھنؤی، مرزا محمد اشفاق (شیعہ کالج لکھنؤ) کا نظم علی خان صاحب (شیعہ کالج لکھنؤ) کا

کے فرد تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبط حسن کا انتقال ہو گیا؛ مجبوراً اس کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم نامکمل رہ جانے سے قدرتاً دنیوی ترقی کی سب راہیں بند ہو گئیں، جس سے لازماً عمر بھر قلیل، بلکہ نا کافی آمدنی میں گزارا کرنا پڑا۔ زندگی بھر مختلف پریشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسط درجے کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بُری، لیکن آرام و آسائش کے مسلسل فقدان نے رفتہ رفتہ رنگ دکھایا؛ ۱۹۷۲ء میں تپ دق میں مبتلا ہو گئے۔ کافی وسائل نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہو سکا۔ تپ دق اب مہلک نہیں رہا اور قابل علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ ہنوز خاصا گراں ہے؛ اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے (یعنی ۲۳ جون کے ابتدائی حصے میں) اپنے گھر پر جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امامبارہ غفران مآب (لکھنؤ کے اندرونی صحن میں) شمالی پہاڑ کے مقابل) سپرد خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر تھا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدان علم و فضل میں ڈنکا بجاتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، فاطمہ تخلص تھا۔ منظر کے ایک چچا مولانا ظفر ہمدانی ماہنامہ سہیل مین "لکھنؤ کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سید کامل حسین کامل (سکریٹری انس جعفر علی خان اشراف پوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منظر کے بڑے بھائی سید محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے۔ (تیسرے بھائی سید محمد وارث حسن انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہ بھی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ "ہفت رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ معلوم ہوا تھا

کہ ان کے برادرِ خرد و ماہرِ صاحبِ ان کے قصائد "منظر و نظارہ" کے نام سے مرتب کر کے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ شائع نہیں ہوا (۱۹۷۸ء) اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، غزل وغیرہ) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظرِ مرحوم ساری عمر مجرور رہے تاہل کے جنجال میں پڑے ہی نہیں۔ بڑی بذلہِ سرخ، شگفتہ اور باغ و بہارِ طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور مرخجانِ مرغ، کسی کے بُرے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقہٴ احباب میں سب انھیں "منظر بھیا" کہہ کر پکارتے؛ اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

اَنَا لِلْبَدْوِ اِقْبَالُ لَيْبِهِ رَا جَعُونَ

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان پر قدرت ہے۔ فنی پہلو سے بھی بے عیب ہے۔

چند قطعاتِ ملاحظہ ہوں:

آبلہ دل کا پھوٹ جائیگا
جامِ ہاسخوں سے چھوٹ جائیگا

رشتہٴ صبر ٹوٹ جائیگا
مسکرا کر نہ دیکھیے، ورنہ

جو حجابات ہیں، وہ اٹھا دیجیے
ہوسکے، تو صد پر صد! دیجیے

دل کی خاموش دنیا جگا دیجیے
آسے ڈھونڈتی ہے نگاہِ وفا

زرا دنیا سے ہٹ کر دیکھ لیجیے
بہانے سے، پلٹ کر دیکھ لیجیے

نقابِ رخ الٹ کر دیکھ لیجیے
اگر ہے مصلحت سے چشم پوشی

ذرا کچھ محبت کے ماروں سے کہہ دو
جیہیں کس طرح جاں نثاروں سے کہہ دو

بتاؤ تو، کیا فیصلہ ہے تمہارا !
جو صفحے نہ بولو، اشاروں سے کہ دو

زباں سے نہ رُودادِ غم کہہ سکیں گے
نہ ایذائے شامِ اِلم، کہہ سکیں گے
یونہی دل کے ارمان، دل میں رہیں گے
نہ تم کہہ سکو گے، نہ ہم کہہ سکیں گے

اب اذیت، اذیت نہیں ہے نِجّتِ شامِ فرقت نہیں ہے
یہ ندامت سرِ قبر کیسی ! جاؤ، کوئی شکایت نہیں ہے

وقت کے ساتھ چھل کے نکل جاؤ گے
پھیر لو گے نظر، چال چل جاؤ گے
تخام کہہ ہم کلیجے کو رہ جائیں گے
تم بدلتے بدلتے، بدل جاؤ گے

حامد الہ آبادی، حامد حسین

شیوخ عدلیہ کے ایک متوسط الحال، لیکن معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ضلع الہ آباد کی تحصیل چائل میں ایک مختصر موضع ”بہکا“ ہے۔ یہ انھی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا، جب وہ عہدِ عالمگیری کے آخری زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ حامد حسین جون ۱۹۳۲ء میں بہکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم اختر حسین خاصی سماجی حیثیت کے مالک تھے۔ بزرگوں کی پیداکردہ جادو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئی؛ انھوں نے اپنی محنت اور معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت سے خاندان کو پھر سے اپنے پائو پر کھڑا کر دیا۔ اس سے املاک میں بھی وسعت ہوئی؛ اور وقار میں ترقی بھی۔

حامد حسین اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے والد حکیم اختر حسین کسی مقدمے کے سلسلے میں کچھری گئے تھے، وہاں بھری عدالت میں کسی مخالف نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خاندان کی پوری ذمہ داری حامد حسین کے کندھوں پر آ پڑی۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ کچھ مدت بعد ۱۹۵۹ء میں حکیم اختر حسین کے بعض مبینہ قاتلوں کا پراسرار طریقے پر قتل ہو گیا اور اس سلسلے میں جو بدوق استعمال ہوئی تھی، بد قسمتی سے تفتیش پر کھلا کہ وہ خود حامد حسین کی تھی (جو قاتلوں نے اسی جرم کے ارتکاب کے لیے چوری کی تھی) اس

پر حامد حسین گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور اس سلسلے میں آٹھ مہینے جیل میں گزارے۔ لیکن بالآخر استغاثہ جرم ثابت نہ کر سکا اور یہ باعزت بری کر دیے گئے۔

دسویں درجے تک تعلیم باقاعدہ اسکول میں پائی تھی۔ اس کے بعد ناسازگار حالات کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ملازمت کے دوران میں پرائیوٹ طور پر انٹر اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کر کے آخر کار بی۔ اے کی سند بھی لے لی۔ ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی جہاں نیک نامی سے بسر ہوئی۔

وہ شعر تو بہت ابتدا میں کہنے لگے تھے، لیکن ۱۹۵۰ء سے اس پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہ شوق انھیں گویا ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم اختر حسین بھی شعر کہتے تھے، اختر اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ ان کے تین چار شعر دیکھیے جن سے ان کے اندازِ سخن کا کچھ اندازہ ہو جائیگا (اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح ان کے چند شعر محفوظ ہو جائیں)

حریص لذتِ آزار، مجھ کو دیکھ کر، ہمدم!
کسی نے میرے دل میں جستجوئے لامکاں رکھ دی
حاضر ہیں آپ کے درِ دولت پہ دیر سے
ہوش و حواس، عقل و خرد، جسم و جاں سے ہم
اک بے نیازِ عشق و محبت کی یاد میں
اختر! خدا گواہ، گئے دو جہاں سے ہم
کبھی بے آئینہ جلووں کی ازانی بھی دیکھی ہے
اگر مقصود ہو، لاشیشہٴ دل، دیکھنے والے
بساطِ کون و مکاں پر یقین کی چال چلا
تو راز مجھ پہ کھلا کہ کیا ہوں میں

پہلے مدتوں حامد بیکاوی کے نام سے لکھتے رہے، بعد کو احباب کے کہنے پر حامد حسین

حامد بکھنے لگے۔ الہ آباد کے ماہنامے ”شبحون“ سے اس کے روزاول سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ابتدا غزل سے کی تھی، لیکن ”شبحون“ سے تعلق کے بعد نظم پر بھی توجہ کرنے لگے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ ”شبحون“ میں کبھی کبھی تبصرے بھی لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں شہر رنقا و شمس الرحمن فاروقی کے ساتھ مل کر انھوں نے جدید شاعری کا ایک نمایندہ انتخاب ”نئے نام“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا؛ ان میں سے دو کتابوں ”ایجا دات کی کہانی“ (۱۹۷۳ء) اور ”بھارت کے نامور سائنسدان“ (۱۹۷۴ء) پر انھیں یوپی اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اگرچہ اس کا نام ”انٹاز کی خوشبو“ مشہور ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ ان کی بے نیازی کو بھی دخل رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو معمولی بخار میں مبتلا ہو گئے؛ علاج ہونے لگا۔ انھیں مٹاڑیہ قید کے زمانے سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور دل پہلے سے کمزور تھا؛ اب کچھ پیچھے سے بھی متاثر پائے گئے، تو علاج کے لیے میڈیکل کالج، الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پانچ دن تک زیست اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت کی۔ لاش ان کے وطن بہاگائی اور وہاں خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ان کی شادی الہ آباد کے جوار کے ایک مقام ”سید سراواں“ میں ہوئی تھی۔ جسمانی اولاد میں چار بیٹے (اعظم، معظم، اسلم، اکرم) اور دو بیٹیاں (نسرین اور تمکین) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ کلام آج تک جمع نہیں ہو سکا۔ کچھ غزلیں ماہنامہ ”شبحون“ میں ملیں۔ ان کی بیاض سے کچھ کلام شمس الرحمن فاروقی صاحب نے مہیا کیا، جس کے لیے ان کا ممنون ہوں، اسی کا انتخاب بطور نمونہ پیش ہے :

پامال جنوں مشہرِ تمنا بھی کرینگے
 یہ شرط اگر ہے تو ہم ایسا بھی کرینگے
 مستقبلِ زرّیں پہ سبھروسا بھی کرینگے
 جینا ہے تو جینے کا سہارا بھی کرینگے
 خاکستراضی میں شررِ دھونڈنے والے!
 کہتے ہیں کہ راہوں میں اجالا بھی کرینگے
 ہم برسِ سیکار میں امروز کے غم سے
 ہاں، ہم ہی علاجِ غم دوران بھی کرینگے
 دشواریِ حالات، حوادث کے تھپیڑے
 منزل کا یقین ہے تو گوارا بھی کرینگے
 یہ بزم کا عالم ہے، تو پھر اہلِ تمنا
 ساتی سے توجہ کا تقاضا بھی کرینگے
 پیداریِ غم آج کہ ہر اک پہ گراں ہے
 کیا اہلِ جہاں اس سے کنارہ بھی کرینگے؟

کتابِ شوق، لیکن بے ورق ہوں یکے از کشتگانِ ما خلق ہوں
 مری پہنا تیوں کا راز سمجھو مجھے دیکھو، طبقِ اندر طبق ہوں
 ہزاروں طور ہیں فاشاک جن سے انھیں سچائیوں کی میں رتی ہوں

ہزاروں لفظ ہیں لیکن ہر اک کی جیب خالی ہے
 یہ افلاسِ لباسِ شاعری، یارو! مثالی ہے
 لگے ہیں کان آوازوں پر، لیکن لفظ گونگے ہیں
 گذرے موسموں کی داستان سب سے نرالی ہے
 کسی تعریف ہی کی رکشانی میں آنکھ کھلتی ہے
 بتانے کی ضرورت ہے، یہ کالی رات کالی ہے۔

ہمیں تنہا نہیں ہیں جستجو کی دوڑ میں، لیکن
ہمیں سے کس لیے پھر آج ہر ذرہ سوالی ہے
یہ یکتائی ہماری، ہم سے ہی منسوب ہے حامد !
یہ اپنی وضع، اپنی طرز خود ہم نے نکالی ہے

اک شخص تھا سواب دہ بیاباں نورد ہے
اس شہر میں ہمارے سوا کون مرد ہے
چہرہ ہر ایک مد مقابل کا نرد ہے
عشقی نبرد پیشہ طلب گار مرد ہے
یک جہتی نگاہ کو آواز کون دے
ہر دفتر خیال یہاں فرد فرد ہے
اس جستجو کی دوڑ میں یہ سجد بھی کھلا
رنگ سخن تلاش معانی کی گرد ہے
غرنے سے لمحے لمحے کے جھانکیگا اصل رنگ
چہرے پہ ہم سبھوں کے اگر آب زرد ہے
دست سخن میں تیشہ باطل نہ دیکھیے
دشمن اگر چہ راہ کا ہر سنگ سرد ہے
اس میں حرارتوں کی نسی روح پھونک دو
خواہش کی لاش ایک زمانے سے سرد ہے

کہاں سے اہل محبت کہاں تنگ تے ہیں
چراغ دل کے سہارے جہاں تنگ تے ہیں
مقام عشق حقیقت نشان تنگ تے ہیں
ہزار سنگ سرد دستان تنگ تے ہیں

یتیم کی حد سے گزر کر گماں تنگ تے ہیں
یہیں تو ختم نہیں راہ جستجو الے دوست !
روایتوں کے سمندر کو پیر کر، ہم لوگ
تمہارے بام سے، تم کو خبر بھی ہو شاید

منزل ورہ کا یقین کیسا
اپنی تشہیر کی خاطر ہی سہی
روح کی موت سے بچنے کے لیے
چل پڑے آپ تو چلتے رہیے
گھر سے باہر بھی نکلتے رہیے
اپنے قالب کو بدلتے رہیے

کچھ گفتگو سے اس کو سروکار بھی تو ہو
بکتے ہیں ہم بھی، کوئی خریدار بھی تو ہو
جس کی بشارتیں ہیں کتابوں میں جا بجا
یہ کاروانِ شوق، یہ راہیں، یہ منزلیں
تاریکوں میں ہم سبھی اماں ڈھونڈتے چلیں
یہ خامشی علامتِ اظہار بھی تو ہو
بازار کی طرح کوئی بازار بھی تو ہو
وہ صبحِ زندگی کی نمودار بھی تو ہو
حائل کسی جگہ کوئی دیوار بھی تو ہو
لیکن وجودِ صبح سے انکار بھی تو ہو

آؤ، ان لمحوں کو ہم لوگ مقید کر لیں
تاکہ آنکھوں میں یہ اندازِ جہاں رہ جائے
بات بننے کی نہ صورت، نہ کوئی شکلِ فرار
پاس لے دے کے اگر، بحرِ بیاں رہ جائے

آنکھوں کے ساتھ ذہن کا دروازہ بند کر
ہر صاحبِ کمال پر یوں نہ ہر خند کر
یہ ایسی ویسی بات نہیں ہے، اگرہ میں رکھ
جو تجھ کو مل گیا، اسے مٹھی میں بند کر
وہ تیرگی کا زہر، یہ تابندگی کا قہر
اب تجھ کو اختیار ہے، جو بھی پسند کر

راشدان، ام (نذر محمد)

پاکستان کے ضلع گوجرانولہ میں، وزیر آباد در لائل پور لائن پر ایک خاص بڑا قصبہ (جو اب شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے)، علی پور چیمبر ہے؛ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے اس کا نام "کال گرڈ" تھا۔ اس زمانے میں یہاں کامیابیوں کا خاندان عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ شاید اب بھی ہو۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کے مجموعہ تھے، لیکن انھوں نے دنیاویات کو اپنا پیشہ بنایا، اور پشتوں تک بنو و محراب کے مکین رہے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی خاصی عزت تھی اور ان کا یہ مقام انگریزی زمانے میں بھی قائم رہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد جناب فضل الہی چشتی صوبے کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ وہ بتدریج ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: نذر محمد اور عبدالماجد۔ یہی نذر محمد بعد کو، نام راشد کے نام سے دنیا سے شعر و ادب میں مشہور ہوئے۔ ماجد صاحب بھی مدتوں محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ وہ کسی زمانے میں ملتان میں سیکنڈری تعلیم کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ آج کل غالباً کسی ناشر کتب کے یہاں نوکر ہیں

راشد صاحب یکم اگست ۱۹۱۰ء کو کال گرڈ میں پیدا ہوئے۔ "خضر عمر" تاریخی

سے ایک صاحب نے مقام ولادت "کیلیان والا" کہا ہے یہ سچیک نہیں

نام ہے جس سے (۱۹۱۰ء) نکلتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انسٹرکٹ لائٹ پور پہنچے، اور ۱۹۲۸ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے چار برس بعد ۱۹۳۲ء میں ایم اے (اقتصادیات) کی سند حاصل کی۔

ان کی شعر گوئی اکال گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۱۷ء میں ”انسپکٹر اور مکھیاں“ کے عنوان سے سات برس کی عمر میں کہی۔ ہوا یہ کہ ایک انسپکٹر صاحب ان کے اسکول کا مہمانہ کرنے کے لیے آئے۔ ان کے سر کے گرد مکھیوں کا جھرمٹ منڈلا رہا تھا، جو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نذر محمد کو سخت تعجب ہوا اور اس پر انھوں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے اپنا تخلص ”گلاب“ لکھا تھا۔ ان کے والد جناب فضل الہی نے نظم دیکھی، تو بہت خوش ہوئے اور اس پر بیٹے کو ایک روپیہ انعام دیا۔ خود ان کے والد یعنی راشد کے دادا جناب غلام رسول جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، اور اردو، فارسی میں شعر بھی کہتے اور ”غلامی“ تخلص کرتے تھے، جناب فضل الہی نے بیٹے کی یہ نظم اپنے ابا کی خدمت میں بھیج دی۔ دادا نے اس پر ہونہار پونے کو یہ شعر لکھا:

میرے میاں گلاب! دہن میں گلاب ہو

خوشبو سے تیری بابا ترا فیضیاب ہو

اور کہا کہ شعر گوئی سے اجتناب کرو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے؛ بس اپنی تعلیم سے کام رکھو۔ لیکن یہ نشہ ایسا نہیں، جسے ترستی انار دے۔ چنانچہ ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ کالج پہنچے، تو اس شوق نے اور ترقی کی اور نچنگی اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج، لاہور کے زمانے میں یہ کالج کی بزم سخن کے سکتر اور کالج کے

ماہانہ رسالے ”راوی“ کے اردو حصے کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں اور نظمیں ہمایون اوزنگار میں بھی شائع ہوئیں۔ وہ نشر بھی لکھتے تھے؛ اس میں زیادہ توجہ تنقید پر تھی۔ غرض کہ کالج سے فارغ ہونے سے پہلے وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں وہ ”راشد وحیدی“ کے نام سے لکھتے رہے۔ یہ نسبت اسٹھوں نے اپنے خاؤ محمد وحید کیلانی سے اظہارِ ارادت کے طور پر اختیار کی تھی۔ کیلانی صاحب بھائی دروازہ، لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرسِ ثانی (سیکنڈ ماسٹر) تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نیرنگ خیال جاری ہوا؛ اور واقعاً ”ستارۂ درخشندہ و ماہِ کامل شذالی بات ہو گئی۔ تاثیر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پورا ”نیازندانِ لاہور“ کا حلقہ ان کی پشت پر؛ چغتائی کی مصوری کے شاہکار بھی ہر شمارے میں شامل ہوتے۔ اور ان تمام خوبیوں کے باوجود چندہ صرف تین روپے لائن! چھ جہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ پرچے کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس پر بعض اور اصحاب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ حافظ محمد عالم نے ”عالمگیر“ اور وحید کیلانی نے ”قوسِ قزح“ جاری کیے۔ ”عالمگیر“ تو چل نکلا، کیونکہ حافظ محمد عالم کا اپنا مطبع تھا اور ان کی مالی حالت بھی بودی نہیں تھی؛ لیکن ”قوسِ قزح“ نے دو ہی برس (۱۹۲۷-۱۹۲۹ء) میں دم توڑ دیا۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، جو ذرا طویل ہو گیا۔ کہ یہ رہا تھا کہ ن، م راشد ان دنوں راشد وحیدی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ راشد تخلص بھی کیلانی صاحب ہی نے دیا تھا۔

کالج کے دور میں وہ اسی نام سے روایتی شاعری کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی (ف: ستمبر ۱۹۲۸ء) اور روش صدیقی (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) اور سید عابد علی عابد (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) کے زیرِ اثر رہے، بلکہ ایک مرتبہ روش صدیقی نے خود محمد سے کہا تھا کہ ابتدا میں راشد نے اپنے کلام پر ان سے اصلاح

لی۔ لیکن جلد ہی وہ روایتی عشقیہ اور غنائیہ شاعری کو ترک کر کے میراجی (ف: نومبر ۱۹۴۷ء) اور نصرتِ حسین خاں کے ساتھ مل کر آزاد نظم نگاری کرنے لگے۔

ایم اے کرنے کے بعد اپنی افتادِ طبع کے باعث، اسفوں نے چاہا کہ والد کے اثر سے کہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل جائے۔ جناب فضل الہی اس زمانے میں شیخوپورہ میں تعینات تھے۔ یہ ان کے پاس پہنچے، لیکن یہاں کوئی کامیابی نہ نہ ہوئی۔ جلد ہی والد کا تبادلہ ملتان ہو گیا، اور یہ بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومت پنجاب نے دیہات سدھار کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا تھا۔ (سر) مالکم ڈائرنگ اس محکمہ کا کرتا دھرتا اور مسٹر برین ان کے دستِ راست تھے۔ من جملہ اور باتوں کے مختلف مقامات سے ایسے رسالے شائع ہونے لگے جن میں دیہاتی زندگی کی بہتری اور دیہاتیوں کی بہبودی کے موضوع پر مضامین چھپتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ماہنامہ "مخلستان" ملتان سے بھی نکلتا تھا۔ راشد اس کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ دو برس رہے، اور سچر ۳۴، ۱۹۳۶ء میں واپس لاہور آ گئے۔

لاہور کے علمی حلقوں میں وہ اجنبی نہیں تھے۔ مولانا احسن الدین تاجور نجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) اس زمانے میں اپنا مشہور ماہنامہ "شاہکار" شائع کرتے تھے۔ اسفوں نے راشد کو نائب مدیر کی جگہ پیش کی۔ شاہرہ صرف ۳۵ روپے تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا، تنخواہ کم ہونے کے باوجود راشد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ مگر یہاں کی فضا سے جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا۔ تاجور نے رسالے کا کاروباری صبیغہ اپنے برادرِ نسبتی سلیمان خان کے سپرد کر رکھا تھا؛ راشد کی ان سے کسی بات پر چل گئی۔ تنخواہ پہلے ہی ناکافی تھی؛ ۱۹۳۵ء میں شادی بھی ہو گئی تھی جس سے ذمہ داریاں مضاعف ہو گئیں۔ اسفوں نے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی، جو مولانا تاجور نے رد کر دی۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر راشد نے استعفیٰ دے دیا اور ملتان کی راہ لی؛ اور وہاں کمشنر کے دفتر

میں کلرک بن گئے۔

ملتان کے زمانہ قیام کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

یہ خاکسار تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ تحریک علامہ عنایت اللہ مشرقی (ف)؛ اگست ۱۹۶۳ء) نے ۱۹۳۱ء میں شروع کی تھی۔ یہاں اس کے حسن و قبح پر بحث کرنا بے محل ہوگا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خاکساروں کو خاکی وردی ڈالنے، کندھوں پر سیلچے رکھے، بازاروں میں فوجی مارچ کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ ان کے عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راشد شروع سے نظم و ضبط کی زندگی کے قائل رہے تھے۔ انھیں خاکساروں کی تنظیم اور باقاعدگی بہت پسند آئی۔ غرض وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور رفتہ رفتہ ضلع بھر کے رضا کاروں کے سالار کے عہدے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان لوگوں کی آمریت ان کے حلق سے نہ اتر سکی اور سال ہی بھر بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ملتان کا یہ زمانہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اپنی آمدنی میں اضافے کی غرض سے روسی مصنف الیگزینڈر کوپرین کے ناول ”پاما“ کا اردو میں ترجمہ کیا کہ شاید اس سے کچھ یافت ہو لیکن ناشر نے انھیں ایک حبہ بھی نہ دیا، بلکہ کتاب پر سببیت مترجم ان کا نام تک شائع نہیں کیا۔

انقصہ صورت حال سخت ناانسانی بخش تھی۔ خانہ داری کی روز افزوں دہمہ داریاں، تنخواہ قلیل، اور کام ان کے مذاق کے بالکل خلاف۔ ان کے لیے ملتان میں کوئی اور کشش بھی نہیں رہی، لیکن احتیاج انسان کو سب کچھ برداشت کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور بالآخر مئی ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے دفتر میں پروگرام اسٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ چند ہفتے بعد اسی عہدے پر دلی تبادلہ ہو گیا اور یہاں ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ریڈیو کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سید احمد شاہ

بخاری "پطرس" مرحوم (ف: دسمبر ۱۹۵۸ء) نے ادیبوں کی کھیپ کی کھیپ کو فوج میں عارضی کمیشن دلو کر محکمہ تعلقات عامہ میں بھرتی کرادیا۔ اسی رہے میں راشد بھی کپتان بن گئے اور عراق، ایران، مصر، سری لنکا (سبلون) میں چار برس گزار کر وسط ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آئے، اور دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن لکھنؤ میں اسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور وہ پاکستان چلے گئے۔ پشاور اور لاہور میں دو ڈھائی سال گزارنے کے بعد ان کا ریڈیو پاکستان کے مرکزی دفتر کراچی میں بحیثیت مدیر تعلقات عامہ تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی دو سال پشاور میں رجینل ڈائریکٹر بھی رہے۔

۱۹۵۲ء میں انھیں اقوام متحدہ (نیویارک) میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیویارک، انڈونیشیا، پاکستان، ایران میں ۱۵-۱۶ برس گزارے ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے پینشن پر سبکدوش ہوئے، تو مستقل سکونت انگلستان میں اختیار کر لی۔ پہلے لندن میں ایک کرایے کے مکان میں مقیم رہے؛ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں "چیلٹن ہم" میں اپنا مکان خرید لیا۔

ان کی پہلی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اس بیگم سے ان کے پانچ بچے ہوئے، چار بیٹیاں؛ نسرتین، یاسمین، شاہین اور تمزمین؛ اور ایک بیٹا: شہریار۔ بفضلہ سب بچے زندہ ہیں شہریار پاکستانی سفارتخانہ برسلز (بلجیم) میں ملازم ہیں۔ (۱۹۷۵ء) بڑی دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

اس بیگم کا اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نیویارک میں مقیم تھے۔ یہاں ان کی چھوٹی بچی تمزمین یو این او کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اسکول میں اس کی استانی مس شیلانجیلی تھیں۔ اس خاتون کے والد اطالوی نسل کے اور ماں انگریز ہے۔ وہ خود ڈرامہ نگار ہیں۔ مدتوں روماد (اطالیہ) کے انٹرنیشنل اسکول میں پڑھاتی رہیں اور جس زمانے میں راشد نیویارک میں تھے،

یہ وہاں یو، این، او کے انٹرنیشنل اسکول میں ملازم تھیں۔ جب راشد کی بیوی کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے دو سال بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ۱۹۶۷ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے 'نزیل' رکھا۔

جون ۱۹۷۵ء میں ان کے خسر مسٹر انجیلینی کا لندن میں انتقال ہو گیا، اور ان کی لاش جنوبی لندن کے برقی شمشان میں جلائی گئی۔ راشد بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ جب لاش جل رہی تھی انھوں نے وہاں کے منتظمین سے دریافت کیا کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ جب انھیں بتایا گیا، تو کہا یہ تو بہت آسان اور عارف ستھرا طریقہ ہے۔ بیوی سے کہنے لگے کہ جب میں مروں، تو میری لاش بھی اسی طرح جلائی جائے۔ یہ بات انھوں نے بیوی سے پھر ایک موقع پر دہرائی، بلکہ جب ان کا بیٹا شہر یار برسلسز سے ملنے کو لندن آیا، تو اس سے بھی کہا کہ "میاں، میرے مرنے پر میری لاش برقی شمشان میں جلا دینا۔"

مسز شیدا راشد کا بھائی روما میں تھا۔ اس کی موت کا تار ملنے پر وہ روما چلی گئیں۔ روانگی سے پہلے انھوں نے راشد سے کہا تھا کہ آپ بعد کو میری والدہ کو ساتھ لے کر روما آجائیے گا۔ راشد ۹ اکتوبر کو اپنے مسکن چیلٹن ہم سے وان اسٹیڈ آئے۔ اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ بکس ہاتھ میں لیے پیدل اپنی خوشدامن کے مکان گئے۔ انھیں انجانا کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں بو جھیل بکس لیے تقریباً میل بھر کے اس پیدل سفر نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد شام کے ساڑھے سات بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور اس سے پیشتر کہ کوئی طبی امداد پہنچ سکے، وہ جاں بحق ہو گئے۔ یکم روما سے اور بیٹا شہر یار برسلسز سے آئے تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء دن کے چار بجے ان

۵۔ یہ نام انھوں نے اپنے نام زید محمد کے پہلے حصے، اور بیوی کے نام شیدا کے آخری حصے سے ترکیب کر دیا ہے (وہ بیوی کو شیل کے نام سے پکارتے تھے) یوں عربی میں نزیل کے معنی ہیں 'نہاں'۔

کے جسدِ خاکی کو ان کی خواہش کے مطابق، جنوبی لندن کے برقی شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا۔

چونکہ لاش کا جلانا، اسلام کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے لندن میں مقیم بیشتر مسلمانوں نے تجبیز و تکفین اور جنازے میں شمولیت نہیں کی تھی۔ مشکل سے آٹھ دس آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور وہ کبھی ان کے ذاتی دوست۔

راشد کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) ماورا (۱۹۴۲ء)؛ (۲) ایران میں اجنبی (۱۹۵۵ء)؛ (۳) لا = انسان (۱۹۶۹ء)۔ بعد کا کلام بھی مدون شدہ موجود ہے، اور یقیناً چھپ جائیگا۔ اس کے علاوہ اسفوں نے بعض ترجمے کیے تھے، ان میں سے بھی تین شائع ہو چکے ہیں۔ کوپرین کے ناول ”یاما“ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ولیم سیروین کے ناول (Mama I love you) کا ترجمہ اور کوپرین آیزلے کا ناول (وقت کا آسمان) بھی چھپ چکے ہیں۔ آخری زمانے میں وہ جدید فارسی کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے، اور اسفوں نے ۲۰-۲۲ ایرانی شعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا، یہ تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جب ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ ”ماورا“ شائع ہوا ہے، تو ادبی اور تنقید کی حلقوں میں گویا بھونچال سا آگیا۔ اس سے پہلے ہیئت کے تجربے تو ایک زمانے سے ہو رہے تھے، لیکن کہا گیا کہ اسفوں نے صنعتِ ابہام کو بدنامی حد تک استعمال کیا ہے اور جنوبی عربیائی کھلے بندوں ان کے ہاں ہے، اتنی اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ جارحانہ تنقید بیشتر ان اصحاب کی طرف سے ہوئی، جو وکٹوریائی عہد کے اخلاقی قواعد و ضوابط کے زیر اثر عورت اور اس کے متعلقات کا برسرِ عام ذکر بھی بد اخلاقی (بلکہ گناہ) تصور کرتے تھے۔ حیاتِ انسانی نے تو اپنی تنقید نامِ راشد پر کے عنوان سے کتنا بچے کی شکل میں شائع بھی کر دی تھی۔ (دلی نومبر ۱۹۴۵ء) لیکن دھن کے پتے راشد نے ان مخالفانہ حملوں کی پروا نہ کی، اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔ ”لا = انسان“ کے شروع میں

ان کا ایک طویل مصاحبہ (انٹرویو) چھپا ہے، جس سے ان کی شاعری کے کئی گوشے روشنی میں آتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بہر حال، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں راشد کا مقام محفوظ ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بوئے آدمزاد

بوئے آدمزاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں ؟
دیو اس جنگل کے ستائے میں ہیں
ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں !

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا
چاندنی راتوں میں وہ بیخوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں، ہاتھ سرد
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے بابِ بُرد ؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، زولیدہ شاخوں سے انہیں
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موسم کی تمثال دیو

ہاں اتر آئیگا آدمزادان شاخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات !

گداگر

جن گذرگا ہوں پہ دیکھا ہے نکا ہوں نے لہو
یا سبہ عورت کی آنکھوں میں یہ سہم
کیا یہ اونچے شہر رہ جائینگے بس شہروں کا دہم
میں گداگر اور مرا در یوزہ فہم

راہ پیمانہ عصا اور عافیت کوشی گدا کا لنگ پا،
آرہی ہے ساحروں کی، شعبدہ سازوں کی صبح
تیز پا، گرداب آسا، ناچتی، بڑھتی ہوئی
اک نئے سدرہ کے نیچے، اک نئے انساں کی ہو
تابہ کے روکینگے ہم کو چار سو !

کیا کہینگے اس نئے انساں سے ہم
ہم تھے کچھ انساں سے کم ؟
لنگ پر کرتے تھے ہم باران سنگ
ستھی ہماری ساز و گل، نغمہ و نکھت سے جنگ
آدمی زادے کے سالیے سے بھی تنگ ؟

داشته

میں ترے خندہ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے

کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم نہ رہے گداز؛
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسے لگے اشکوں کے سحاب
اس پہ حیرت تو نہیں تھی لیکن

کسی دیرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح

ایک مبہم سا خیال

دفعۃً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں

کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی

آج لیکن مری باہنوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور

یہ ترے گریہ نمناک سے میں جان گیا —

تجھ سے وابستگی شوق بھی ہے

ہو چکی سیلے میں بیدار وہ دلسوزی بھی

مجھ سے ہے مجھ پر رازل جس پہ میں مجبورِ ازل !

نفسِ خود میں کی تسلی کے لیے

وہ سہارا بھی تجھے دینے کو آمادہ ہوں

تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے !

کوئی اندیشہ ہے تو یہی

ترے ان اشکوں میں اک لمحہ کی نو میدی کا پرتو ہو لیکن

اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے

یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جائے

جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لیم

جسم کی مُزد و شبانہ دے کر
بن کے رزاق، تری تذلیل کیے جاتا ہے
میں بھی باہنوں کا سہارا دے کر
تری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں
سبا ویران

سلیمان سربز انو اور سبا ویران
سبا ویراں، سبا آسب کا مسکن
سبا آلام کا انبارِ بے پایاں
گیاہ و سبزہ گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنہِ باراں
طیور اس دشت کے منقارِ زیرِ پَر
تو سرمہ در گلو انسان
سلیمان سربز انو، اور سبا ویران

سلیمان سربز انو، نرُشتر و غمگین، پریشاں مُو
جہانگیری، جہانبانی، فقط طرّامہ آہ
محبتِ شعلہ پُراں، ہوسِ بو سے گلِ بے بو
ز، زازِ دہر کمتر جو
سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیار کے غارتگروں کے نقشِ پاباقی
سبا باقی، نہ ہر وے سبا باقی
سلیمان سربز انو

اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ لپے آئے
کہاں سے، کس سب سے کاسۂ پیری میں لپے آئے

شورش کشمیری، عبدالکریم (آغا)

ان کا خاندان کشمیری، ذات برہمن، گوت ڈاڈھی۔ بزرگوں میں کوئی مشرف باسلام ہو گیا تھا غالباً ان کے پردادا سرینگر سے ہمارا جاگلاب سنگھ کے عہد میں نقل مکان کر کے امرتسر (پنجاب) میں آئے تھے۔ لیکن ان کے دادا (امیر بخش) کسی بات پر ان سے ناراض ہو کر لاہور چلے آئے، اور ایک دوڑ (انارکلی) پر ایک تھوڑا سا کشمیری باقر خانی اور چلے بیٹھے لگے۔ خوب کمایا اور خوب اڑایا۔

ان کے دو بیٹے تھے: ایک عبدالکریم کے والد نظام الدین (ف: ۱۳ اپریل ۱۹۵۶ء) اور دوسرے ان سے بڑے جن، کا عین عنفوان شباب میں بعمر ۱۶-۱۷ سال تپ بھرقہ سے انتقال ہو گیا۔ باپ کی توہم پرستی نے انہیں سمجھایا کہ بیٹا اس لیے ہاتھ سے نکل گیا کہ سرتقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ انہوں نے حفظ و تقدم کے طور پر چھوٹے بیٹے کو اسکول سے اٹھالیا کہ اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اکاؤنٹا بنایا اور گھر میں فراغت، لاڈ چاؤ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جاہل رہ گیا کوئی ستر بھی نہ سیکھا۔ جب تک باپ کا لاہور عروج پر رہا، یہ بھی عیش کرتے رہے۔ لیکن باپ کے جو بچھن تھے، ان کے لیے تو قانون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر ڈھلنے لگی، تو فکر ہوئی کہ بیٹا کیا کر گیا! ایک دوست کی وساطت سے ایک مین کے کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ دو ایک سال میں یہاں چل نکلے، تو ریلوے ورکشاپ میں جگہ مل گئی۔ لیکن بعد کو پرانے کارخانے کے مندر مالک کے اصرار پر واپس چلے

آئے، اور پھر کہیں اور نوکری نہیں کی۔

عبدالکریم ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، تعلیم دیوسانج ہائی اسکول، انارکلی، لاہور میں پائی۔ ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۲۸ء کا ہندوستان سیاسی سرگرمیوں کے باعث شعلہ رجولان بنا ہوا تھا۔ سامن کیشن میں کسی ہندوستانی کا شامل نہ کرنا پورے ملک نے اپنی توہین تصور کیا اور اس سے تحریک آزادی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ نوجوانوں پر اس کا خاص طور پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شہر شہر خفیہ اور دہشت پسند جماعتیں قائم ہو گئیں۔

اسی زمانے میں عبدالکریم نے ایک ہندو دوست کے ساتھ مل کر "بال بھارت سمجھا" قائم کی۔ عبدالکریم نے بہت کم عمری میں مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے دو زمانے "زمیندار" کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ اخبار گھر میں آتا تھا، ان کی دادی ماں اسے پڑھا کرتی تھیں۔ عبدالکریم نے یہ عادت انھیں سے لی۔ زمیندار کی ڈن، ظفر علی خان کی خطابت اور صحافتی شاعری۔ ان سب باتوں کا نوجوان عبدالکریم کے کردار اور مستقبل کی تشکیل میں بڑا ہاتھ رہا۔

اب عبدالکریم باقاعدہ سیاسی تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے سب سے پہلی تقریر جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کے منگامے کے دنوں میں شاہی مسجد لاہور میں کی۔ اس پر گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا، اور دو سال قید اور زمین سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ لیکن اپیل میں جرمانہ معاف ہو گیا، اور یہ ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی قید کے بعد رہا ہو کر، گھر آ گئے۔

لیکن اس کے بعد جیل جانا گویا آئے دن کی رسم بن گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہر سال چند مہینے جیل میں گزرے، اور ستمبر ۱۹۳۶ء سے آخر ۱۹۴۴ء تک مسلسل پانچ سال، اگرچہ سزاسات برس کی ہونی تھی، حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۴۴ء تک یعنی جب ان کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی، وہ اس کا ایک تہائی (یعنی ۹ برس) جیل میں بسر کر چکے تھے۔ فروری ۱۹۳۹ء میں وہ مجلس احرار میں شامل

ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ سب اوقات کی کیا صورت ہو۔ ان کی صلاحیتوں اور اقدار طبع کو دیکھتے ہوئے احباب نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ ان کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے۔ ایک سمندر و مخیر دوست نے دو ہزار روپے کا عطیہ دیا جس سے "مکتبہ احرار" کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ نام ہی اسے لے ڈوبا۔ شہید گنج کے قیضے کے بعد مجلس احرار کی ساکھ عوام میں کوڑی بھرنی نہیں رہی تھی۔ اب جبکہ ان کے نام پر قائم کردہ ادارہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس مکتبے کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں، لیکن نفع جو کھس رہا ہو، عبد الکریم کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سارا سرمایہ بھی منتظون کی سہل انگاری اور نا تجربہ کاری کے باعث ضائع ہو گیا۔

اب سب لوگ ان سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر ۲۷ مئی ۱۹۴۵ء کو ان کی انبائے میں شادی ہو گئی۔ ولہن زخورشیدہ) ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ یہ انھیں لے کر لاہور واپس پہنچے، تو دعوتِ ولیمہ میں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان بھی گئے۔ انھوں نے ادبِ تجالاً تین شعر کا قطعہ کہا:

گجر دم یکے قاصد یہ مسرتِ زاپیام آیا
کہ انبائے سے شورش ایک کھنڈاسی وطن آیا
مرے دل سے دعا نکلی کہ اس جوڑے کے سر پر
نئی کی رحمتوں کا اور خدا کے فضل کا ساتا
مبادک ہو تمھیں شورش! یہ تیری خانہ آبادی
تسے گھر آگئی اک اور انگریزوں کی فریاد کا

بعض وجود بہت باہر گت ہوتے ہیں، خاص طور پر بیوی۔ ذمے داری بڑھ جاتی ہے اور انسان میں کام کرنے کا نیا ولولہ اور نئی انگ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ شادی کے بعد عبد الکریم نے انتہائی سنجیدگی اور فرض شناسی کے احساس سے مستقل

آمدنی کے وسائل پیدا کرنے پر توجہ کی، اور بفضلہ اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مختلف ناشرین کے ہاں سے اجرت پر کام کیا۔ ان کے مسودوں کی تصحیح، ترتیب، نظر ثانی کے علاوہ خود بھی کچھ لکھتے، اور اس طرح چار پانچ سو روپے ماہانہ یافت ہونے لگی۔ پھر مشہور کانگریسی لیڈر لالہ پٹری داس (ف، جولائی ۱۹۶۹ء) کے داماد پروردہ چندر کے (جو کسی زمانے میں وزیر پنجاب بھی رہے) ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف، فردری: ۱۹۵۸ء) کی مشہور کتاب 'غبارِ خاطر' کا دوسرا ایڈیشن (جس میں موسیقی سے متعلق ایک خط کا اضافہ تھا) اسی ادارہ نے شائع کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں، لیکن تقسیم ملک میں اس کا سارا اثاثہ برباد ہو گیا۔

آزادی ملک سے پہلے مجلس احرار کی طرف سے تھوڑی مدت کے لیے ایک روزنامہ 'آزاد' نکلا تھا۔ اس کے شعبہ ادارت میں کئی نام تھے، لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا بیشتر کام شورش ہی کرتے تھے۔ لیکن یہ پرچہ دولت مستعجل ثابت ہوا۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ تقسیم کے ساتھ ہی انھوں نے مجلس احرار سے اپنا تعلق منقطع کر دیا اور اس کے بعد سیاسی جماعت کے رکن نہیں بنے۔ اب انھوں نے مصافحت کو اپنا اور ڈھنڈا بھونانا لیا۔ ۱۹۴۷ء ہی میں انھوں نے اپنا سہفہ 'وارچان' جاری کیا، جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

سلسلہ قید کی زندگی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو بخیرِ معرہ کا شدید دورہ پڑا جس پر بغرض علاج میں اسپتال (لاہور) میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن کی دوا دوش سے کچھ افادہ ہو گیا، سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن جمعہ ۲۴ اکتوبر کی شب میں طبیعت یک نخت پھر خراب ہو گئی اور نصف شب کے تھوڑی دیر بعد (سارے بارہ بجے) یعنی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اول وقت حرکت قلب بند ہوجانے سے۔
ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ناشرین نے اس ایڈیشن کے لیے مولانا آزاد کو دس ہزار روپے بطور حق تصنیف ادا کیے تھے۔

جان بحق ہو گئے۔ جنازہ بروز سبت ۲۵ اکتوبر ہی کی شام میں اٹھا اور میانی صاحب کے
 (مشہور قبرستان) میں سپرد خاک ہوئے۔ چادر لٹکے اور سات لڑکیاں جسمانی یادگار
 چھوڑیں۔

ہمیں امر ہوئی نے تاریخ کہی:

یادِ شورش میں ہے اشکوں کی تراوش، اے دل!
 اور سینے میں غم، بحر سے سوزش، اے دل!
 سوزشِ غم میں کہاں فکر کی کاوش، اے دل!
 حاصلِ شورشِ غم ہے غمِ شورش، اے دل!

۶۱۹۷۵

ان کی تعلیم جیسا کہ چکاپوں، نامکمل رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے وسیع مطالعے سے یہ کمی
 پوری کر لی۔ خوش بختی سے انھیں اپنے عہد کے مشاہیر علم و ادب کی رفاقت اور صحبت کے
 مواقع ملے اور انھوں نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزاد،
 مولانا ظفر علی خان، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا خاص اثر رہا۔ مولانا آزاد سے نشر کا
 پرشکوہ انداز سیکھا، مولانا ظفر علی خان کے تتبع میں صحافی شاعری اختیار کی، اور
 عطاء اللہ شاہ بخاری کی پیروی میں وہ شعلہ بیان خطیب بن گئے۔ مولانا آزاد کی معنوی
 شاگردی پر انھوں نے خود یوں فخر کا اظہار کیا ہے:

کسی ذیل قلمکار سے تعلق کیا!

نذا کا شکر ہے، تلمیذِ ابوالکلام ہوں میں

موضوعاتی ہنگامی شاعری میں ظفر علی خان کو جو یدِ طولی حاصل تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
 شورش اس میدان میں ان کے قدمِ بقدم چلے اور اس میں ایسی حیرت ناک کامیابی حاصل کی کہ
 خود مولانا ظفر علی خان کو یہ سন্দھینا پڑی:

شورش سے مراد شتہ ہے، اور وہ ازلی ہے

میں وقت کا شتم ہوں، تو وہ ثانیِ سہراب

اسی باعث رشید احمد صدیقی نے کہا تھا: شورش کاشمیری ابوالکلام کے طنطنہ و قلم اور ظفر علی خان کے ہمہہ انشا کا وارث ہے؟

انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر مولانا ظفر علی خان، تاجور نجیب آبادی اور احسان دانش سے اصلاح لی۔ بلکہ احسان تو اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ الفت تخلص کرتے تھے، شورش تخلص انھیں احسان ہی نے دیا تھا؛ نیز وہ آخر تک اپنا کلام انھیں دکھاتے رہے۔ وہ کبھی کبھی اسرار / اسرار بصری کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ یہ نام انھوں نے ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہائی اور گھر پر نظر بندی کے دوران میں اختیار کیا تھا کیونکہ ان کی نقل و حرکت اور تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔

نظم و نشر کا خاصا ذخیرہ ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان میں چار کتابیں: (۱) بولے گل، (۲) دل، (۳) دو چراغِ عقل (۱۹۷۲ء) آزادی ملک سے پہلے کی سوانح عمری؛ (۴) پس دیوارِ زندان (آزادی سے پہلے، جیل کی دس سالہ داستان)؛ (۵) موت سے واپسی (عہدِ ایوبی میں اسیری کے ۲۳۲ دن کی کہانی)؛ (۶) تمغہ خدمت (ساہیوال جیل کے تین مہینے سترہ دن کے حالات) گو یا خود نوشت سوانح کا حصہ ہیں؛ (۷) "شب جاے کہ من بودم" سفر نامہ حجاز ہے۔

ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: (۱) گفتنی تا گفتنی؛ (۲) چہ قلندر از گفتیم؛ (۳) الجباد، الجباد۔ انھوں نے بعض شاہرہ عہد کے تاشرائی خاکے بھی لکھے تھے، (۱) حسین شہید سہروردی؛ (۲) حمید نظامی؛ (۳) امیاں افتخار الدین؛ (۴) سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چہرے، مختصر خاکے (کراچی ۱۹۷۵ء)۔

ایک کتاب اس بار میں "بہ نام قحبہ خانے کی کہانی ہے" فیضانِ اقبال" میں علامہ اقبال کے "خطبات، مقالات، ارشادات اور خطوط" کا "افشردہ و عصا" (۱۹۷۵ء) پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے خیالات کو دس مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا ہے۔ اور کبھی کبھی کتابیں ہیں۔

ان کا کلام بہت ملتا ہے۔ بطورِ نمونہ صرف ایک مختصر نظم پر اکتفا کرتا ہوں۔

شعر اللہ و اب عند اللہ

زبان بگڑی، قلم بگڑا، روش بگڑی، چلن بگڑا
 خود اپنے ہاتھ سے کافر گروں کا پیر، سن بگڑا
 چلا آکھیز کا جھگڑ کہ شرقی و غرب کا پٹ اٹھے
 اٹھی دشنام کی آندھی، مزاج اہرمن بگڑا
 حیا مفقود، غیرت سرنگوں، خوفِ خدا غائب
 کچھ اس انداز سے بدعت فروشوں کا چلن بگڑا
 کروں طولِ سخن، تو بات حرفِ ناروا ہوگی
 کلام مختصر یہ ہے کہ ہر لات و دشن بگڑا
 میں اکڑ سوچتا ہوں کس طرح سے ان کو سمجھاؤں
 یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے نظمِ انجمن بگڑا
 یہی وہ گفتار ہے، ناز ہے جس کی بلاغت پر
 یہی وہ ہمہ ہے، جس سے اسلوبِ سخن بگڑا
 خدا کے فیک بندوں کو کہاں تک گالیاں دو گئے؟
 کرو گئے کیا، اگر اس پر خدا سے دوا لیجئے بگڑا
 "لگے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صابا!
 زبان بگڑی تو بگڑی تھی، خبر تیسے دھن بگڑا"

ہزار لکھنوی، سید حسن

ان کے مورث نقوی سادات میں سے تھے۔ روایت ہے کہ ان کے بزرگ عہد شجاع الدولہ (۱۷۵۳-۱۷۸۵ء) میں ایران سے لکھنؤ آئے اور یہاں بلند مراتب پر فائز ہو گئے۔ سید حسن ہزار نے شاعری گو یا ورثے میں پائی۔ ان کے والد سید جعفر حسین عرف محمد صاحب شعر کہتے اور بہادر تخلص کرتے تھے، وہ سان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی (ف، جون ۱۹۵۰ء) کے شاگرد تھے۔ لالہ سری رام نے انھیں فصاحت کا شاگرد دکھا ہے، لیکن ہزار ایک تخریر میں انھیں صفی کا شاگرد کہتے ہیں۔ ممکن ہے، دونوں سے یکے بعد دیگرے مشورہ رہا ہو، یا شاید لالہ سری رام کو غلط اطلاع ملی ہو لکھنؤ کی انجمن معین الادب اپنی ادبی سرگرمیوں اور خدمات کے لیے کسی زمانے میں معروف تھی۔ اس کے سالانہ مشاعرے بڑے تزک و احتشام سے ہوا کرتے تھے جن میں باہر کے مشاہیر بھی شریک ہوتے۔ بہادر توتوں اس انجمن کے سکریٹری۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے احباب نے اثر لکھنوی کی تجویز پر اس انجمن کا نام بدل کر "انجمن بہادر ادب" کر دیا۔

بہادر تو خیر ان کے والد ہی تھے۔ ان کے علاوہ ننھے آغا صاحب زبیر لکھنوی، حکیم مہتمن آغا صاحب آفتاب، سید محمد ہادی عزیز بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ گو یا ان کے بچپن میں چاروں طرف ہندوستان سید علی ہمدانی (ہزار کے بہنوئی)، سید نواب افسر لکھنوی اور کاظم علی خان صاحب (شیعہ کالج لکھنؤ)

شاعری کا چہرہ چاہتا تھا۔ گھر کی مستورات تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ سزا نے اسی احوال میں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں وہ اپنے والد بہار کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے تھے؛ وہاں اپنے والد ہی کے کہے ہوئے چند شعر پڑھ دیتے۔ ہزار تخلص بھی والد کے تخلص بہار کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ اسٹوس کہ بہار کا بہت جلد انتقال ہو گیا، اور یہ ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ بالآخر جب باقاعدہ شاعری کرنے لگے تو مولانا عبدالباری اسی (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) سے اصلاح کا رشتہ قائم کر لیا۔

ہزار کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ والد کے بعد ان کے چچا ماسٹر مجتبیٰ حسین ان کے کفیل ہوئے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ستیا پورے گئے اور وہاں ان کا گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا؛ ۱۹۴۱ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور نہ شاعری کی کثرت نے انھیں کوئی اور کام کرنے کی فرصت دی۔ اگرچہ رسمی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے سے اس کی بہت حد تک تلافی کر لی تھی۔

وہ شروع میں لکھنؤ ہسپتال بورڈ میں ملازم ہوئے لیکن یہاں غالباً زیادہ دن نہیں رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بگ بگ راجا دارانے گڑھ نے انھیں اپنا درباری شاعر مقرر کر دیا۔ بعد کو وہ راجا صاحب موصوف کے ادبی سکریٹری بھی بن گئے۔ ایک موقع پر خوش ہو کر راجا صاحب نے انھیں تین نوے سونے کا میڈل اور ”عذریب سخن“ خطاب عطا فرمایا تھا۔

انھیں پب دہلی کا پرانا عارضہ تھا۔ اس کے علاوہ خون کے کم دباؤ اور قلب کی تکلیف بھی تھی۔ بہت علاج ہوئے۔ یوپی حکومت نے بھی علاج کے لیے امداد دی اس سے حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کو کسی کام سے کانپور گئے۔ وہیں شام کے وقت ایک ہسپتال میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اور آٹا فانا جان بحق ہو گئے۔ اگلے دن (۴ نومبر ۱۹۷۷ء) کو کانپور ہی میں بسا بیوں کے تکیے کے سامنے تکیہ چٹو شاہ میں سپرد خاک کر دیے گئے۔ کہاں عمر بسر کی، اور کہاں کی مٹی مقبرت میں رکھی تھی۔ سچ ہے قَاتِرِیْ نَفْسِیْ بِأَيِّ اَرْضٍ تَمُوتُ اِنَّ اللہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

رائے گڑھ کے قیام کے زمانے میں شادی کی تھی، اس بگم کے بطن سے ایک بیٹی (لیکن) ہوئی
یہ ماشاء اللہ زندہ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ کھنڈو میں رہتی ہیں۔ سزا کی اس بیوی کا
جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے نکاح ثانی نہیں کیا، بقیہ عمر تھرو میں
گزاردی۔

انھوں نے غزل، سلام، قصیدہ، نظم۔ بہت کچھ لکھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعہ کلام ان کی
زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف
ایک غزل ملی، اسی کو جوں کا توں پیش کر رہا ہوں۔

جلوہ حق آشنا، آئینہ باطل نہیں
صاحبانِ فکر جو چاہیں، کریں وہ فیصلہ
میرے ماتھے کی لکیریں، ہیں جلالِ خسروی
اب خدا ہی نا خدا بن جائے تو ہے اور با
ظلم ڈھانے کے لیے بھی حوصلہ درکار ہے
ایک ہے اپنے لیے، وہ دھوپ یا چھاؤ ہو
مہربانی سے تری، بہتر تغافل تھا ترا
اپنی عزتِ ذمہ شاہی کی حدوں سے دور ہے

کوئی بھی سینہ مرے دل کا متحمل نہیں
میں ہی کتنا رہو گا، "میں کسی قابل نہیں"
میں فقیر بیواؤں ہوں، مگر سائل نہیں
ورنہ میری حدامکان میں کہیں ساحل نہیں
تنگدلی کے ذہنِ اعلیٰ کا کوئی قابل نہیں
ہم مسافر ہیں، ہماری کوئی بھی منزل نہیں
وہ بھی کوئی بات ہے، جس کا کوئی حل نہیں
شورشِ طوفان، دہیں عشرتِ ساحل نہیں

اے سزا! اس دور میں حقلگو کی منزل دار ہے
یہ صدمے صور، آوازِ شکستِ دل نہیں

طالب دہلوی شیش چندر سکینہ

دلی کے ایک متمول کاشتہ (سکینہ) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد رے صاحب ہمیشہ داس (آنریری مجسٹریٹ) کا انبالہ چھاؤنی میں شراب فروشی کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ کسی زمانے میں پورے پنجاب (قبل آزادی) میں مسکرات کا ٹھیکہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ خاندان کے تمول کا اندازہ کچھ اس سے کیجئے کہ دلی میں دریائے جہا کا پراپل طالب کے دادا رے صاحب سالک رام (ف: ۱۹۱۷ء) نے حکومت سے ٹھیکہ لے کر تعمیر کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کاکا جی کے مندر (دلی) کے پاس کاشتہ برادری کا جلسہ کیا۔ اس میں آٹھ ہزار افراد نے شرکت کی تھی؛ سب لوگ رے صاحب سالک رام کے مہمان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جلسے پر ان کا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔

زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ رے صاحب ہمیشہ داس کی تجارت کے جوڑ توڑ سے ناواقفیت اور بڑی حد تک اسامیوں کی بے ایمانی کے باعث کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جن لوگوں سے لینا تھا، انھوں نے دینے سے انکار کر دیا؛ جنہیں لینا تھا، وہ تقاضا کرنے لگے۔ رے صاحب نے کسی لوگوں کو اپنی ضمانت پر مختلف جگہ سے قرض دوار کھا تھا؛ قرضخواہوں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے واجبات کا مطالبہ ان سے کر دیا، اور یہ بھی دینا پڑے۔ غرض دیکھتے دیکھتے لاکھ لاکھ روپیہ ہو گیا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں کسی نہ کسی طرح وہ وقت بھی گزر گیا اور خاندان پھر اپنے پانوں پر کھرا ہو گیا۔

طالب کی پیدائش ۱۲ فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک چھوٹے بھائی ایش چند ایم اے (دلاوت)؛ یکم مارچ ۱۹۱۵ء میں، جنھوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ انشاء اللہ حیات ہیں۔

طالب کی ابتدائی تعلیم انبالہ چھاؤنی میں ہوئی اور انھوں نے ۱۹۲۵ء میں بنارس داس ہائی اسکول، انبالہ چھاؤنی سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد سان سفینس کالج، دہلی میں داخلے لیا جہاں سے ۱۹۲۸ء میں دہلی یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں ۱۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ان کے والد راے صاحب ہمیش داس کا انتقال ہو گیا۔ انٹر کے بعد انھوں نے بی اے میں داخلے لیا تھا، لیکن گھر کے تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور یہ سلسلہ مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ جب حالات سدھر گئے اور پھر فرصت نصیب ہوئی، تو انھوں نے بی اے ۱۹۳۲ء میں ہندو کالج، دہلی سے پاس کیا۔

ہاتھی لاکھ لے، پھر بھی سو لاکھ کار بہت الے تلے نہ ہی تاہم، خدا کے فضل و کرم سے گھر کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ انھیں بسر اوقات کے لیے کسی نوکری کی ضرورت پیش آتی، لیکن میکار کی زندگی بھی تو نہیں کشتی؛ وہ ۱۹۲۷ء سے شریک بن گئے تھے، اور اس میں اپنے چھوٹے بھائی منشی بہادر جہاد برق دہلوی (ف: فروری ۱۹۳۶ء سے مشورہ رہا۔ برق خود آغا شاعر قزلباشی (ف: مارچ ۱۹۴۰ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح گویا طالب کا سلسلہ داغ کے واسطے سے خاندان ذوق سے جا ملا۔

شر گوپی کے شوق نے طالب کو اکسا یا کہ وہ صحافی بنینگے۔ اس زلمے میں دیش بندھو گیتا (ف: نومبر ۱۹۱۹ء) کے اخبار "نیج" کا طوطی بولتا تھا۔ طالب صحافت کی تربیت حاصل کرنے کو اس کے دفتر پہنچے کسی معاوضے یا تنخواہ کے بغیر چھ ماہ دباں کام کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے ماہنامہ "اکھل" (اردو)، "امپکن رپورٹر"، "دشگیر" (پانچ) اور بعض اولہ پرچوں سے تعلق رہا۔ کہیں طویل، کہیں مختصر، لیکن کسی جگہ مستقل تعلق قائم نہ کر سکے۔ ان کی وضع داری کا ایک قصہ سنئے!

سہ چھوٹا اس طرح کہ برتن کی بیوی، طالب کے والد (دلے ہمیش داس) کے سگے چچا کی صاحبزادی تھیں۔

نشتی بہار راج بہادر برق کا انتقال بہت اچانک اور افسانہ کال حالات میں ہوا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو وہ اپنے دوست شگن چند روشن پانی پتی کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پانی پت گئے، دہلی کے کئی اور شعرا بھی گئے تھے۔ وہیں شب میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے دم ٹوٹ ہو گئے۔ طالب نے ۱۹۳۷ء میں ان کی برسی کے دن اپنے مکان پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء کو چھوڑ کر چونکہ اس سال فرقہ دارانہ فسادات کے باعث فضا بہت کمزور تھی یہ سلسلہ بلاناغہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں شری حیر گیت سبھانے پیشکش کی کہ آئندہ یہ مشاعرہ ان کی عمارت میں ہوا کرے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں پھیواں (جولائی) مشاعرہ ہوا، اور اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بند کروایا گیا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی شادی گوالیار کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی؛ چند رکھادی بیوی کا نام تھلا دلا وہیں خدائے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ تینوں بیٹے صغریٰ میں داغ مفارقت دے گئے۔ بیٹی (سنگیت) مجرمہ زندہ ہیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر بشن مرادی لائل سیکند کے ساتھ ہوئی تھی؛ جو آج کل کینیڈا کے شہر ہیلٹن کے اسپتال میں ماہر امراض دماغی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں مقیم ہیں۔ طالب صاحب اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے وسط ۱۹۷۷ء میں کینیڈا گئے تھے۔ وہاں سے ستمبر میں واپس آئے۔ بظاہر صحت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ موت اتنی قریب ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۷۷ء صبح کے وقت فوج کا حملہ ہوا؛ ۱۵-۱۶ کی شب میں (ڈیڑھ بجے علی الصبح) ارون اسپتال ہی میں جان بحق ہو گئے۔

طالب کو نظم و نثر دونوں سے یکساں مزاولت تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کرتے تھے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے مختلف رسالوں میں منشر پڑے ہیں۔ ان کی یہ کتابیں چھپ چکی ہیں؛ (۱) رتن مالا؛ شعری انتخاب؛ (۲) حرفِ ناتمام؛ برق صاحب سے متعلق مضامین؛ (۳) یادگار برق؛ برق صاحب سے متعلق مضامین (۱۹۴۵ء)؛ ہمارے حسین (دلی ۱۹۴۵ء) (۵) انوارِ نظر؛

(۶) خدنگ ناز؛ (۷) خشتان کیفی (دلی ۱۹۵۱ء)؛ (۸) کشمیر کی سیر: سفرنامہ (دلی ۱۹۶۶ء)
(۹) سترہ بیگانہ: غزلوں کا انتخاب (دلی ۱۹۶۸ء)؛ (۱۰) یہ کھتی دلی: (۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۷ء)
کی دلی کی ادبی سرگرمیوں کی داستان (دلی ۱۹۷۵ء)

کلام نچتہ ہے، جس میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں مضمون آفرینی کی کوشش ہر صفحے سے عیاں ہے کلام نچتہ اور بے عیب ہے۔ کہیں کہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

کسی کو غم کسی کا ہے، کسی کو غم کسی کا ہے
بے عنوانِ دگر، سب ایک ہی افسانہ کہتے ہیں
مری خطا کھتی نہ دیتے اگر نگاہ مجھے
نگاہ دی ہے تو مجھ پر اقبیادِ مومنوں میں
وہ دل جو تنگ بظاہر ہے اس قدر بھرا
اسی میں وسعتِ کون و مکانِ نکلیگی
اس قیدِ کامزا نہیں ہر ایک کو نصیب
جینے کا لطفِ حلقہ دار و رسن میں ہے
یہ اقبیادِ ماوشما ہے بیک نفس
زیرِ زمیں یگانہ و بیگانہ ایک ہے
سکونِ دل نہیں جس کے نصیب میں طالب!
اسے کہیں کبھی میسر خوشی نہیں ہوتی
محبت، ماورائے کفر و دین ہے
محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے
محبت، حسن ہے، حسن آفریں ہے
بھروسہ کیا کرے کوئی کسی پر!
جو اپنا ہے، وہی اپنا نہیں ہے
ہوئے جاتے ہیں آپ کیوں برہم!
ہم زمانے کی بات کہتے ہیں
تم کہ اپنا گمان ہوتا ہے
تم سے جب دل کی بات کہتے ہیں
زینت ہے بہار کی خسراں سے
جب موت نہیں، حیات کیا ہے!
مردم دیدہ رہی، یہ اور بات ہے
حذرِ نگاہ تک تو ہمدی نظر گئی

اسے محفل میں بھی تنہا سمجھو
جسے احساس ہو تنہائی کا
مانگ لو بڑھ کے کچھ ان سے اٹا!
دقت آیا ہے پذیرائی کا

لگی ہوئی ہے یہاں تو دل سے، نظر میں ان کے یہ لگی ہو
یہ دل لگی ہے، تو باز آئے، جناب! ہم ایسی دل لگی ہے

تھیں اور منصفی سے کہ دو یقیں کیسے کو آئے
 تھکے وعدے کا ٹھیک ہی کیا، کبھی کسی سے کبھی کسی سے
 رکھنگے کیا یاد رکھنے والے کہ آئے تھے نرم آب گل میں
 جو زندگی کے یہ چادرون بھی کٹے نہ طالب بہنسی خوشی تھے

دکھ دنیا آسان بہت ہے دکھ سہنا آسان نہیں ہے
 رقت خود عنوان ہے اپنا اس کا کچھ عنوان نہیں ہے
 اوروں کے جو کام نہ آئے کام کا وہ انسان نہیں ہے
 نہ مجھ سے ذکر کرے کوئی آشیانے کا چمن پرست ہوں، مجھ سے چین کی بات کرو
 اب خوشی میں بھی بھر آتی ہیں ہمدی آنکھیں

دقت بے وقت کی ہر سات کہاں تھی پہلے !
 مٹا ہو گا نہ کوئی اس طرح راہ محبت میں کہ وہ اپنا، نہ دل اپنا، نہ پہلو میں جگر اپنا
 کرم سے، درد سے، اخلاق سے، ہر مروت سے مزاج سے، بنا لے تو دل دشمن میں گھر اپنا
 پردے میں عنایت کے جو ہوتا ہے نمایاں ناقابل برواشت ہے وہ جو رو عتاب اور
 در پردہ بھی دیکھا، کبھے بے پردہ بھی دیکھا وہ شان حجاب اور تھی، یہ شان حجاب اور
 یاد بھولے سے کرینگے نہ کبھی اور، بھولے سے اگر یاد آیا !
 یاد آتا تھا بہر حال جسے شام بھولے، تو سحر یاد آیا

عجیب لطف ہے، کھاتے ہیں اور بھی قسمیں جب اعتبار کے قابل سخن نہیں رہتا
 وہ ایک میں، جو ہر اقرار پر یقیں کر لوں وہ ایک تم، جسے پاس سخن نہیں رہتا
 عشرت ذات نہیں وصلِ دگر پر موقوف تنگ قطرہ ہے سمندر میں فنا ہو جانا
 دل کی آواز کو کہتے ہیں، خدا کی آواز ہو مبارک اسے دنیا کی صدا ہو جانا
 نہ فرق آیا ازل سے زینت گلزار بہتی میں

بہادر اس کی، بہادر جاوداں معلوم ہوتی ہے
 ابھی چشم قبول اس کی طرف مائل نہیں شاید
 ابھی ہر سعی، سعی راگداں معلوم ہوتی ہے

یہ خوش فہمی ہے اپنی، یا لگا ہوا ناز کا حادو

"ہنسی" بھی اب تو ظالم تیری "ہاں" معلوم ہوتی ہے

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے
کچھ اس انداز سے اپنوں نے نوازا ہے
بہر عنوان ہو کر ہی رہیگا، وہ جو ہونا ہے

ترے اندیشہ سود و ذریاں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی راضی برضا ہو کے بھی دیکھو طالب!
مفلس، تنگ نہیں، عیب نہیں، جرم نہیں

لیکن افلاس کا احساس بُرا ہوتا ہے

بات باریک ہے، مشکل سے سمجھ پاؤ گے

جس کو کہتے ہیں دعا، وہ بھی گلا ہوتا ہے

بے زبانی زبان ہو کے رہی ہر نظر داستان ہو کے رہی

محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین

لکھنؤ کے ایک سربراہ آودہ خاندان کے فرد تھے، جس میں دین اور دنیا دونوں کا اجتماع تھا۔ ان کے دادا مولانا محمد صادق علی حید عالم اور حافظ قرآن بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی "عملیات" میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے فرزند حافظ علی حسین تھے۔ وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے وارث اور عربی فارسی کے عالم تھے۔ فارسی میں شریک تھے، فوژ تخلص تھا برصغیر کے لیے خطاطی اور خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی سلسلے میں اس زمانے کے مشہور مطبع نوکلشور میں تیس روپیہ ماہرہ پر ملازم ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے، جب نواب صدیق حسن خان رحیم (ف: فروری ۱۸۹۰ء) نے بھوپال میں تصنیف و تالیف کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا اور ریاست میں اس کے لیے ایک باقاعدہ دفتر کی تشکیل کی۔ انھوں نے نشی نول کشور (ف: فروری ۱۸۹۵ء) کو لکھا کہ آپ کے یہاں نستعلیق و نسخ کا جو بہترین کاتب ہو، اسے بھوپال بھیج دیجیے۔ اس پر نشی صاحب موصوف نے حافظ علی حسین صاحب کو بھوپال جانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ جب بھوپال پہنچے، تو تو نواب صاحب موصوف نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے ہاں کی کتابت کا حملہ کام ان کی نگرانی میں دے دیا۔ پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ نواب صاحب کی زندگی تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ ان کا انتقال بھی بھوپال ہی میں ہوا۔ وہیں قبرستان "گنج شہیدان" میں مدفون ہیں۔ یہی حافظ علی حسین ہمارے محوی صدیقی کے والد بزرگوار تھے۔ محوی لکھنوی میں ۱۵ مئی

۱۸۹۱ء (۶ شوال ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کا مرحلہ آیا، تو اس کا انتظام گھر پر ہوا۔ اس کے بعد فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ اور تکمیل اپنے والد کی نگرانی میں بھوپال میں کی، مدرسہ احمدیہ سے عربی کی، اور مدرسہ سلیمانہ سے فارسی کی سند فیضیت پائی۔

تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ آئے اور یہاں ماہانہ "النظار" سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۹۱۶ء تک یعنی پانچ برس، اولاً اس کے انتظامی اور پھر اوقاتی شعبے میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی مشاہیر عبدالحلیم شرر، فصاحت لکھنوی، علی محمد غارت لکھنوی، پیادے صاحب رشید، جالب دہلوی، وحید الدین سلیم، چکیت لکھنوی اکبر الہ آبادی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس سے انھیں اپنے دل و دماغ کی مخفی صلاحیتوں پر جلا کرنے اور انھیں بروئے کار لانے میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ یہیں محوی کی ملاقات مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) سے بھی ہوئی، جس سے بعد کو انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

۱۹۱۶ء میں ان کے والد حافظ علی حسین بہت بیمار ہو گئے۔ اس پر محوی صاحب لکھنؤ سے بھوپال چلے گئے، اور یہاں انھیں ریاست کے دفتر تارنخ میں عربی مترجم کی جگہ مل گئی، ان کی کتاب "ازدواج الانبیاء" لکھنؤ ۱۹۱۶ء اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا "دائرۃ ادبیہ" قائم کیا۔ "انسانی قربانیاں" کی تصنیف اور اشاعت اسی زمانے میں ہوئی۔ (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء)

لکھنؤ میں کوئی سال بھر قیام رہا ہو گا کہ مولانا عبدالقادر آزاد سکھائی (ف: جون ۱۹۵۷ء) نے انھیں کانپور طلب کیا۔ آزاد سبجانی مرحوم کا نام سہادی تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں بہت نمایاں ہے۔ انھیں فلسفے سے بہت شغف تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام سبجانی ربانی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں "مدرسہ الہیات" قائم کیا تھا۔ محوی صاحب کو اسی مدرسے میں عربی پڑھانے کے لیے بلا یا گیا تھا۔ محوی سال بھر کانپور میں رہ کر علی گڑھ چلے گئے، اور جامعہ ملیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

”طقات ناصری“ اور تاریخ فیروز شاہی“ کا ترجمہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا، ”الناظر“ کی ملازمت کے زمانے میں ان کا مولوی عبدالحق مرحوم سے تعارف ہو گیا تھا چونکہ یہ روزگار کی طرف سے پریشان تھے، اور اپنی استعداد اور استعدادی کے باوجود انھیں کہیں جگہ کر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے مولوی عبدالحق سے رجوع کیا اور اردو کی درخواست کی۔ موصوف ذہوان اور موہنا را دیوں کی حوصلہ افزائی پر ہمیشہ تیار رہتے تھے انھوں نے محوی کو اورنگ آباد بلایا جہاں وہ خود اس زمانے میں کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے سکتر بھی تھے۔ سو دہ پیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی، لیکن جب یہ اورنگ آباد پہنچے، تو مولوی صاحب نے اذ خود یہ بڑھا کر ایک سو پندرہ کر دی۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اورنگ آباد میں ان کا قیام ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس زمانے میں وہ انجمن کی انگریزی / اردو ڈکشنری کی ترتیب میں بھی شریک رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ مدراس چلے گئے۔ ادلاً حجابیہ عربک کالج میں عربی کے استاد رہے، بعد کو مدراس یونیورسٹی میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۵۲ء میں سکندرشہ ہوئے۔ بیان کی تصنیفی و تالیفی زندگی کا سب سے بار آور زمانہ ہے۔ یہاں انھوں نے دیوان میر محمدی سیدادہ مولوی (۱۹۳۵ء) واقعاتِ اظہری اور دیوانِ (اظہری)، اردو فارسی (۱۹۳۶ء) میر اسماعیل خان ابجدی کا انور نامہ (۱۹۴۲ء) اور کلیاتِ فارسی (۱۹۵۲ء-۱۹۵۴ء)؛ کلمات اشعرا سرخوش (۱۹۵۱ء) مرتب کیے؛ ان پر دیباچے اور حواشی لکھے؛ اور یہ سب کتابیں مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

مدراس کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھوں نے بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے بچوں کے لیے کسی کہانیاں لکھیں جو اسی زمانے میں شائع ہو گئی تھیں۔

انھیں شعر گوئی کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء ہی سے موقت الشیوع رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے احمد علی شوق قدوائی (ز: اپریل ۱۹۲۵ء)

کی شاگردی اختیار کی اور استاد کی زندگی بھران سے مشورہ کرنے رہے۔ اب بھوپال میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی جمع کرنا شروع کیا۔ نعتیہ کلام ”نغمہ فردوس“ کے نام سے چھپا (بھوپال، ۱۹۸۶ء) اور رباعیات کا مجموعہ ”آبشار“ کے عنوان سے (لکھنؤ، ۱۹۷۱ء)۔ اس سے مدتوں پہلے ایک طویل نظم ”شاعر کا دل“ کے عنوان سے بھی چھپی تھی (مدراں، ۱۹۳۸ء)۔ لیکن افسوس کہ غزلیات کا دیدار ان نہیں چھپ سکا، حال آں کہ ان کی بڑی تمنا تھی کہ یہ محفوظ ہو جائے۔ کسی زمانے میں ان کے شاگرد جوہر چاندوری نے ان کے سوشیوں کا ایک مختصر مجموعہ چھاپا تھا۔ (لکھنؤ، ۱۹۴۸ء) اب یہ بھی نایاب ہے۔ بہر حال، اگر پورا کلام نہیں، تو ان کا ایک ناسبندہ انتخاب شائع ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے ادبھی نظم و نثر کا بہت ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء سے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسہالِ مزمن کی تکلیف تھی۔ ہر طرح کے علاج کیے لیکن کسی سے ناکدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۷۴ء تک بالکل زار و نزار ہو گئے، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا تک دو بھر ہو گیا۔ اسی میں بدھ کے دن ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء صبح آٹھ بجے کے بعد صبح تفس عذری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بھوپال کے شاہی قبرستان ”بڑے باغ“ میں دفن ہوئے۔ سید حسن امجدی، حکیم میرن دہلوی (جامعہ نگر، نئی دہلی) نے تاریخ کہی، جس کے پہلے مصرع سے عیسوی اور دوسرے مصرع سے ہجری سال برآمد ہوتا ہے :

اٹھ گیا دنیا سے کیسا شاعر شیریں مقال (۱۹۷۵ء)

خادمِ اردو زبان مرحوم محوی لکھنوی (۱۳۹۵ھ)

محوی مرحوم نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے۔ پہلی بیوی لکھنؤ کی تھیں، شادی کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے ایک بچہ ہوا تھا، جس کے بعد وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ پہلے ان کی موت ہوئی اور پھر نو مود بھی چل رہا تھیں۔ تیسری بیوی بھوپال کی تھیں۔ ان سے دو لڑکے ہوئے : (۱) حامد حسین صدر لکھی، جو آج کل نیو کان لالہ اس میں صدر شعبہ اردو فاضل ہیں۔ (۲) محمود حسین، روزنامہ انقلاب لکھی

بھٹی کے دفتر میں ملازم ہیں۔ چوتھی بیگم بھی بھوپال ہی کی تھیں۔ ان سے تین صاحبزادے
(سعید حسین، جمیل حسین، منیر حسین) اور ایک صاحبزادی (نور جہان بیگم) ہیں۔ ماشاء اللہ
سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔

ذیل میں چند شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں، جو ان کے صاحبزادے منیر المحوی (منیر حسین)
کے عنایت کردہ کلام سے انتخاب کیے گئے ہیں:

اللہ رے طلسمِ جمال سخن فریب کچھ تجھ سے کہنے آئے تھے، یاد اب مگر نہیں
بچپن کیا ہے مجھے، افسانہ شب نے اظہار کا بھی شوق ہے، رسوائی کا ڈر بھی
نعمتِ شکرِ جفا، اہلِ نظر نے پائی۔ لو اہوس شکوہ بیدارِ شمر میں رہے
مراقِ عیش بھی پامال، ذوقِ غم بھی اندر رہے

یہ کیا ہم شکستہ خاطر دوں کی زندگانی ہے!
نگاہِ شوق بھی ناکام، ذوقِ عشق بھی رسوا

مگر دل ہے کہ سرشارِ فریبِ شادمانی ہے
مصوّر کی نظر، شاعر کا دل، سجدے میں ہیں دونوں

جوانی بن کے وہ حسنِ داد اکاشا سہکار آئی
وہ پھیلی چاندنی، تارے وہ چھٹکے، چاند وہ کلا

وہ صبحِ عید کے پیکر میں شامِ انتظار آئی
ہر گام پر تباہی ہے راہیں نئی نئی اس عقلِ نکمہ رس سے بھی اکتا رہے ہیں تم
یہ عدم کے جانے والے، ہیں تمہارے ہی تو شیدا

کوئی رہ گیا ہے پیچھے، کوئی لے گیا ہے بازی
گیا دل بھی جوانی بھی، نشاط و کیف کے دن بھی

تمنا جس کو کہتے ہیں، وہ دیوانی نہیں جاتی
یس ہوں، اور سارے جاں کے حادثات اتھاں ہوتے ہیں مشّتِ خاک کے
مّت کے بعد آج جو نظریں ہوئیں دو چار وہ بھی کس اشتیاق سے دیکھا کیے مجھے

اب یہ پتا چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے مدت کے بعد گھر کو جو آئے سفر سے ہم
تو ہی بتا، دل دیوانہ پھر کہاں جائے! جو اپنے گھر کے لیے ہے، نہ تیرے در کے لیے
دلوں سے یاس رخصت، درد رخصت، بلیسی رخصت

وہ جانِ حسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا
ذکرِ جن، نہ فکرِ نشین، خدا کی شان! آکر قفس میں اور دل آزاد ہو گیا
بہوں پر آہ، بالیس اشک سے تر، ہاتھ دل پر ہے

کسی کی یاد ہے، اور رات کا خاموش منظر ہے
سکوں کی شورش آباد جہاں میں آرزو کیسی!

اے ناداں! یہ نعمت کبجِ تربت میں میسر ہے
رونے سے بھی کچھ دل کی تسکین نہیں ہوتی کچھ روز محبت میں یہ کام بھی کر دیکھا
مرے عزم و وفا کی لاج دکھ لی، سخت جانی نے

ہجومِ آرزو میں در نہ جینا کوئی آساں تھا؟
رو رہا ہے دل، مگر اللہ ری مجھو دیاں ہنس رہے ہیں ہم زمانے کو دکھانے کے لیے

بہل آبادی، سکھ دیو پرشاد سنہا (منشی)

۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن سہوالی پور (ضلع رائے بریلی) ہے، جہاں سے ان کے جد امجد کسب معاش کے سلسلے میں الہ آباد آئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ بہل کے والد کا نام منشی بشیشور دیاں سنہا تھا۔ خاندان کی سکونت الہ آباد کے مشہور محلے میر گنج میں رہی، جس میں نہرو خاندان بھی رشتہ تھا؛ کایستھوں کی عربی فادہ سی سے رغبت ان کے حصے میں بھی آئی۔ تعلیم ماڈرن ہائی اسکول اور کایستھ پائتالہ کالج، الہ آباد میں ہوئی۔ ابھی تعلیمی مراحل ہی میں تھے کہ شعر کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں نوح نادر دی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن بعد کو کسی بات پر ان سے قطع تعلق ہو گیا۔ چونکہ اب ان کی مشق کافی ترقی کر چکی تھی اور زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہو گئی تھی، لہذا اس حادثے سے انھیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ الہ آباد اور نواح میں ان کے شاگردوں کا خاص وسیع حلقہ تھا۔ پڑھتے بھی خوب تھے، ان کے تراویں میں سوڈ سے زیادہ نشاط کا عنصر نمایاں تھا۔ کلام کے دو مجموعے ”جذبات بہل“ اور ”افکار بہل“ کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ اول پر دیباچہ سر عبد اللہ نقاد کے قلم سے ہے، اور دوسرے پر سر جی بہادر سپرو کے قلم سے۔ لیکن اس پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ ہو گیا۔

ساری عمر الہ آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد

کہیں اور ملازمت نہیں کی، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی؛ بس اوقات کے لیے خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔

صحت عموماً ہمیشہ اچھی رہی اور انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء کی درمیانی شب (گویا ۲۴ نومبر کے ابتدائی اوقات) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جان بحق ہوئے۔ موت سے ایک دن پہلے انھوں نے تازہ غزل کہی تھی، جس میں مصرع تھا:

بسل آیا ہے اکیلا، بسل جائیگا اکیلا

لیکن اسے غلط کر دکھایا ان کے ۳۸ سالہ بیٹے شیشو شنکر لال نے جب بسل کی چٹیا میں اگ لگائی جا رہی تھی، تو شیشو شنکر لال سدے کی تاب نہ لا سکے، اور آنا فانا ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔

بسل کا شعری رشتہ نوج ناردی کے واسطے سے داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ داغ اسکول نے زبان کو سلیس اور صاف ستھرا دکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس میدان میں داغ کے شاگردوں میں نوح کو اور بھی امتیاز حاصل تھا۔ بسل اپنے استاد کے رنگ میں اس حد تک رنگے ہوئے ہیں کہ بیشتر اوقات دونوں کے کلام میں امتیاز محال ہے۔ انھوں نے خود بھی خاندان داغ کا فرد ہونے پر اکثر فخر کیا ہے لکھتے ہیں:

یکس کے منہ میں دباں ہے، جو کہ سکے بسل!

مری زبان نہیں، داغ کے گھرانے کی

ہمارا سلسلہ ہے خاندان داغ سے بسل! جسے سو سیکھتا، وہ سیکھ لے اردو زبان ہم

چند شعر دیکھیے:-

عشق میں ملتی ہے مر کر، اہل دل کو زندگی
وقت اخیر موت کے آشاد بیکھ کر

نصف ہستی، نیستی کے دور میں پاتا ہوں میں
احباب رو دیے رنج، بیمار دیکھ کر

مٹ گئی شمع کی تنویر وہ سب رات کے ساتھ

خاک بھی اب نظر آتی نہیں پرداؤں کی

تیرے در سے، تیرے کوچے سے، اٹھنا غیر ممکن ہے
 دکھائیگی ہمیں جو گردش تقدیر، دیکھینگے
 آپ کی محفل سے اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا ————— تنگ آکر اٹھ گئے دنیا کی بھی محفل سے ہم
 نہ آئی نیند، نہ آئی قضا، نہ آئے آپ ————— تڑپ تڑپ کے شب انتظار دیکھ لیا
 گلزار میں آیا موسم گل، اللہ سے جو الٹی پھولوں کی
 اب پھول کے بلبل کہتی ہے، پھولوں سے کہانی پھولوں کی
 گلشن میں نہ کیونکر دل پہلے، وہ سنتے ہیں میں شائیں
 پھولوں سے فسانہ بلبل کا، بلبل سے کہانی پھولوں کی
 بلبل کے مقدّر سے مشک، تقدیر اسی کی اچھی ہے
 چل پھر کے صبا ہی چومتی ہے، کیا کیا پشیمانی پھولوں کی
 ہر موج ہے اک پردہ سازِ ہستی ————— کھلنے کو جالوں سے ہے رازِ ہستی
 کوشش نہ ابھرنے کی کرو، اے بلبل! ————— غرقابِ فنا ہو گا، جہانِ ہستی

قاصر، برہم نامہ دت (چودھری)

ایک قدیم موہیال برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ذات دت، اور گونٹ بھار دوارہ تھی اور پیدا ہوئے ۱۲ ستمبر ۱۸۹۱ء کو صبح پانچ بجے ویرم دھان تحصیل شکر گڑھ، ضلع گوداپنور (حال پاکستان) میں یہ قصبہ بھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انھیں کے بزرگوں کا بسایا ہوا ہے۔

ان کے والد چودھری گوران دت تامل دت تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اردو اور فارسی کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، انگریزی میں بھی دسویں کے سند یافتہ تھے۔ لیکن انھوں نے گھر کی رہنمائی کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ چودھری گوران دت تامل کے دادا (یعنی قاصر کے جدِ اعلیٰ) منشی ہمیش داس فارسی کے فاضل اور بہادر جاسوچیت سنگھ کے دیاری اور شیر تھے۔ بعد کو قاصر کے دادا منشی شکر داس نے دیاردار کار کر دی اور اپنی جادو کی نگرانی پر اکتفا کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بفضلہ گھر میں علم و فضل بھی تھا اور دوست بھی۔

یہ قاصر نے خود اپنی تاریخ ولادت دو جگہ لکھی ہے: ۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء (دال دال پات پات) اور ۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء (جری رڈ کرڈنکر)۔ جہتزی کی رو سے یہ تاریخیں ایک دوسرے کے مطابق نہیں ہیں۔

۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء مطابق بھی ۱۲ ستمبر ۱۹۲۷ء بکری کے: اور ۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء بکری کو ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء تھا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر وشوانا تھ دت کے نزدیک ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ مرتب ہے کیونکہ بکری تاریخ انھوں نے۔ کبھی کبھی جگہ لکھی ہے: غالباً عیسوی تاریخ کے تعین میں غلطی ہو گئی

چودھری گوداں دتتا مل بڑے مخیر اور سمد و قسم کے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کا انجام بہت المناک حالات میں ہوا۔ جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور فیصلہ ہوا کہ گوداں دتتا کی تحصیل شکر گڑھ (ویرم دتتا سمیت) پاکستان کا حصہ بنیگی، تو اعزہ واقارب کے مشورے اور اصرار کے باوجود انھوں نے ویرم دتتا سے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں سب میرے دوست ہیں، میں کسی کا مخالف، نہ میرا کوئی دشمن۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے کہ میں اپنا جہنم بھوم اور بزرگوار کا وطن ترک کر کے کسی اور جگہ جاؤں! یہاں تک کہ انھوں نے پاکستان سے اپنی دوستی اور اخلاص اور وفاداری کے اعلان کے طور پر اپنے مکان پر پاکستانی جھنڈا بھی لگا دیا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ پورا ہو کر رہا۔ چند دن بعد لوگوں نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا، اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب زمانے کی ستم ظریفی کا دوسرا پہلو دیکھیے۔ قاصر صاحب اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے۔ قسمت کے کھیل یہاں ان کا مکان جنونیوں نے اس لیے نذر آتش کر دیا کہ انھوں نے اپنے مسلمان دوستوں اور ان کے خاندان کے افراد کو یہاں پناہ دی تھی۔ دلاور حسین (پرنسپل ایم اے او کالج، امرتسر) شیخ حامد الدین (احمدی لیٹڈ) مولانا محمد حسین عرشی (مشہور شاعر اور عالم) وغیرہ انھیں پناہ گزینوں میں تھے۔ قاصر صاحب کا بیش قیمت کتابخانہ بھی اسی حادثے میں جل کر راکھ ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مکان کے جل جانے کا اتنا افسوس نہیں، جتنا ان قیمتی کتابوں کے تلف ہونے کا، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔

میں ان کے والد کی وفات کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے بہت دوزیکل گیا۔ قاصر صاحب کے ماں باپ نے اپنے گودے کے مشورے سے ان کا نام برہم داس رکھا تھا، لیکن انھوں نے بعد کو اسے بدل کر برہم ناتھ کر لیا کہ بہر حال، داس (ضلام) سے ناتھ (مالک آقا) بہتر ہے۔ پڑھنے لکھنے کی منزل آئی، تو انھیں مقامی پرائمری مدرسے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں پانچویں درجے تک تعلیم کا انتظام تھا۔ ٹیڈل کے درجن کے لیے گورنر انوالہ جانا پڑا۔ اور دسویں کی شد دیاں سنگھ ہائی اسکول، لاہور سے حاصل کی۔ اب انھوں نے دیاندر ایگلو ویدک کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ لیکن خدا معلوم کیا بجوگ پڑا کہ پڑھنے لکھنے

سے دل اچاٹ ہو گیا؛ بمشکل سال بھر یہاں رہے ہو گئے۔ والد نے دیکھا کہ بیٹا پڑھنے کی گول کا نہیں۔ تو اسے پولیس میں بھرتی کرادیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اثر و رسوخ سے اسے جلد ترقی دلوں اور تھانیدار بنوادیں۔ لیکن یہ پیشہ صاحبزادے کی پسند کا نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے حاضری کا پروانہ آیا، تو یہ حاضر نہ ہوئے۔ والد کو اس کی خبر ملی، تو سخت ناراض ہوئے؛ اور اپنی خفگی کا اظہار اس طرح کیا کہ کہا: اگر ہماری نہیں مانتے، تو جاؤ جہاں سینک سمائیں، وہاں چلے جاؤ۔ والدہ، جب یہ ابھی دس بارہ برس کے تھے، جنت سدھار چکی تھیں۔ گھر میں اور کون تھا، جو والد کے اس جبریلی حکم پر احتجاج کرتا۔ یا انھیں پناہ دے سکتا تھا! یہ بھی اپنی سیٹ کے کچے، یا پیادہ گھر سے کل کھڑے ہوئے، اور کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد قلیل تنخواہ پر ٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ایک تاجر کے ہاں نوکری کرلی۔ پھر اسی کے ساتھ دلی چلے آئے اور یہاں ایک در آمد برآمد کا کام کرنے والی تجارتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ کوئی سال بھر یعنی ۱۹۱۲ء تک یہاں رہے۔ اس کے بعد امرتسر چلے گئے اور وہاں ایک دوسری فرم دیسرنڈیلی رام بہادی لال کے ہاں ملازمت کرلی؛ ان کی بدیسی فرموں سے خط و کتابت ان کے ذمے تھی۔

مردوں بعد انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی اور امرتسر ہی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے سو قی تا گادسار کو برآمد کرتے تھے۔ بخر بہ موجود ہی تھا اور محنت مشقت گھٹی میں پڑی تھی۔ اس پر زور قلم، اور سب سے بڑھ کر ایمانداری اور خلوص گویا کامیابی کے تمام اسباب موجود تھے۔ خدا نے برکت دی اور وہ کامیاب تاجر بن گئے۔ بدیسی منڈیوں میں ان کی بڑی ساکھ تھی اور وہاں کے تاجروں کو ان پر بھروسہ تھا؛ ان کی تین تین بیٹے کی منڈوی جمع ہو جاتی تھی۔ ان کا یہ کاروبار ۱۹۵۳ء تک بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس سال حکومت نے درآمد برآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ عمر کے ساتھ صحت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی؛ اور وہ بکھری اور اطمینان سے کام کرنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ لہذا انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دینے میں عافیت دیکھی؛ اور اس کے بعد ہمہ تن علم و ادب کے لیے وقف ہو گئے۔

شعر گوئی انھوں نے، ۱۹۰۶ء میں شروع کی، جب وہ ہنوز آٹھویں درجے کا طالب علم تھے؛ مگر پانچ چھ برس تک کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں امرتسر آئے، تو حکیم فیروز الدین فیروز طغرانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

حضرت فیروز طغرانی اس پایے کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، جن پر خطہ پنجاب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ افسوس، ان کی کا حقم، قدر نہیں ہوئی، جس کے لیے ان کی گوشہ نشینی اور استغنا بھی بہت حد تک ذمے دار ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں امرتسر کے ایک سربراہ آوردہ کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں پشتوں سے تجارت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا قسمت کی بات، کاروبار میں لاکھوں کا خسارہ ہوا۔ ان کے والد اس صدمے کی تاب نہ لا سکے، اور حرکت قلب بند ہو جانے سے آنا فانا جان بحق ہو گئے۔ اس وقت فیروز الدین احمد کی عمر یہی ڈیڑھ دو برس کی تھی۔ کبھی کبھی حادادہ خفین نے خرد برد کر دی، اور فیروز الدین احمد کو یا ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی قلاش ہو گئے۔ یہ ملک الایام بُدا و لُکھا بین الناس۔

جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کا کیا سوال! سن شعور کو پہنچے، تو بیوہ ماں نے یتیم بیٹے کو محلے کی مسجد کے محراب میں بھیج دیا۔ وہاں قرآن اور عربی تو پڑھنا ہی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ انھیں پڑوس میں رہنے والے ایک ایرانی بزرگ سے فیض پہنچا۔ ان سے رفتہ رفتہ فارسی میں وہ مہارت پیدا کر لی، جس نے انھیں بعد کو بیکانہ روزگار بنا دیا۔ دس برس کے تھے، جب قرآن اور دینیات کی بیشتر کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لیکن کسب معاش کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انھیں لازماً کوئی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر انھوں نے دفتری کاپی کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے بھر کر کما لی ہوئے لگی۔ دفتری کثرت اور دیدہ ریزی کا عہد وقتی کام ہے۔ تاہم اس سے جو وقت بچتا، اس میں مختلف موضوعات کی فارسی اور عربی کی اونچی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ لیکن وہ دفتری سے عاجز آ گئے۔ آخر اسے چھوڑ کر چونگی میں محو ہو گئے کہ اس میں فراغت اور تعلیم حاصل کرنے کے نسبتاً زیادہ امکانات تھے۔

چونکہ خدا نے دل و دماغ کی صلاحیتیں بدرجہ وافر و دیوت کی تھیں، بہت جلد، کسی استاد کی مدد کے بغیر، ترقی کی منازل طے کر کے اردو اور خیالی میں شعر کہنے لگے جس نے سنا، اس نے داد دی، دل بڑھایا اور یوں ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ اور تو اور مقامی ماہنامے ”میسما“ کے مدیر کی جگہ خالی ہوئی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب کہن سال استاد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (ف: دسمبر ۱۹۲۲ء) نے ”مجدد السنہ ترقیہ“ کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ ساتھ ہ کے کلام پر حرج و قدح کا طوفان مچا کر دکھاتا تھا۔ فیروز طغرانی نے ”میسما“ میں خود مولانا شوکت میرٹھی کے کلام لکھا جائزہ لینا شروع کیا، اور ستم یہ ہوا کہ اس کی خامیاں دکھا کر اصلاح بھی دے دی۔ شوکت سے کوئی جواب نہ بن سکا، تو چپ سادھ لی۔ اس پر فیروز طغرانی نے ایک اور چٹکی لی اور اپنے پرچہ میں اعلان کر دیا کہ چونکہ مولانا شوکت نے ہمارے اعتراضات پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس سے ہم بیخبر بن گئے ہیں کہ انھوں نے ”کل اعتراضات“ اور اصلاحوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس میں انھیں کوئی کلام نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مدلل تردید کر کے ہمیں قائل کرتے۔ مولانا شوکت نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے۔ لہذا وہ امرتسر پہنچے اور مقامی مشہور عالم مولوی شاعر امیرتسری کو بیچ میں ڈال کر فیروز طغرانی سے مصالحت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے، جب فیروز طغرانی بمشکل ۲۲ برس کے تھے۔

”میسما“ بند ہو گیا، تو فیروز طغرانی نے اپنا ذاتی ماہنامہ ”ایشیا“ جاری کیا۔ لیکن اس کے لیے جتنا سرمایہ دے گا دیکھا، اس سے کم کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کاروباری تجربہ بھی برائے نام تھا۔ اس لیے پرچہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس دور میں دیکل ”اخبار کا ملک بھریں غلغلہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) اس کے مدیر اور مولانا عبد اللہ عہادی (ف: اگست ۱۹۳۷ء) مترجم تھے۔ فیروز طغرانی ان کے معاون مقرر ہو گئے۔ ان کا کلام نظم و نثر بھی دیکل میں چمکے گا۔ لیکن جب ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد دیکل سے الگ ہو گئے تو فیروز طغرانی نے بھی یہ غلغلہ منقطع کر لیا۔

شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی لاہوری (ف: فروری ۱۹۲۶ء کو اپنے تصنیفی کام کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی، جو عربی اور فارسی میں ہمارے نامہ کا حامل ہو۔ انھوں نے سنا، تو فرد ز طفرائی کو لاہور بلا لیا۔ یہ ساڑھے تین برس وہاں رہے حکیم غلام جیلانی کے نام سے جو عربی کی کئی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض فرد ز طفرائی ہی کا کارنامہ ہے، بقیہ کچھ اور اصحاب کی کاوش طبع کا نتیجہ ہیں، حکیم غلام جیلانی ایک نامیادہ رفیق الاطباء، بھی شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں فرد ز طفرائی کے کئی مضمون (منتقل اور تراجم) اس میں بھی چھپے تھے حکیم غلام جیلانی کا تصنیفی پروگرام مکمل ہو گیا، تو فرد ز طفرائی واپس امرتسر چلے آئے اور یہاں اپنا مطب کھول لیا۔ اس سے شہر کے اصحاب علم و فن کو ضرور فائدہ پہنچا کہ بلا مانعہ آئے، ان کے پاس بیٹھتے اور استفادہ کرتے البتہ جہاں تک مطب کے ان کا ذریعہ معاش بننے کا تعلق ہے، وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اب انھوں نے کوئی اور روزگار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ٹھہری کہ فارسی وغیرہ پڑھانے پر محکمہ تعلیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی، نہ کوئی سند ان کے پاس تھی، اور محکمہ تعلیم میں نوکری کے لیے یہ البتہ۔ لہذا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے دوستوں کے کہنے سے پنجاب یونیورسٹی کائنٹی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آسانی سے اسلامیہ اسکول امرتسر میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اسی حیثیت سے جموں تبادلوں ہو گیا اور دو ڈھائی برس وہاں رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

اب کے امرتسر پہنچے، تو "وکیل" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ اس اتحاد کا گویا سنبھالا تھا۔ جلد ہی اس کے مالکوں میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاملات کسی طرح نہ سلجھے، تو ان لوگوں نے پرچہ ہی بند کر دیا۔ فرد ز طفرائی پھر بیروزگار ہو گئے۔ جلد بعد انجمن حمایت اسلام لاہور نے انھیں اپنے شعبہ تالیف و تصنیف میں مصحف کی اسامی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ انجمن کے پاس جتنے مسودے آتے تھے، ان کی زبان کی تصحیح وغیرہ ان کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اب انھیں لاہور کی آب و ہوا اس

ہنیں آئی؛ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ اس لیے مستعفی ہو کر امرتسر واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۹۳۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عمر پچاس کی بھی نہیں تھی۔ ان کے شاگرد رشید حکیم محمد حسین عرشی نے تاریخ کہی،

ترتیبِ فیروزِ طغرائی کہ باد جلوہ افغان اندرونِ نورِ خدا

جہتمش سالِ وفات از عارفان بے تامل گفت: "مفسودِ خدا"

آدم بر سرِ مطلب: قاصر صاحب بھی ۱۹۱۲ء میں ان کے ملازمہ میں شامل ہو گئے۔ وہ استاد کے عاشق تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے، ان کے علم و فضل، قابلیت و صلاحیت، ثبات و ثقاہت، شفقت و عظمت کے اعتراف اور تعریف میں ان کی زبان سوتھتی ہے۔

ان کی شادی ۱۹۰۵ء میں پنڈدادن خان (ضلع جہلم) کے شری دھنیت رائے چھپر کی صاحبزادی (دیران دیوی) سے ہوئی تھی۔ جناب دھنیت رائے بڑے متمول اور خاندانی آدمی تھے اور ان کی بہت وسیع جاداد تھی۔ وہ ریاست جھالادار میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے، لیکن ہمارا جا کی کسی حرکت سے دل برداشتہ ہو کر مستعفی دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔

قاصر صاحب کے دو بیٹیاں (شانتی اور شکلا) اور ایک بیٹا (دشواناتھ) پیدا ہوئے بیوی کا ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا، جب قاصر صاحب کی عمر محض ۳۶ برس کی تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا، صحت اور صورتِ شکل میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ سب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، بلکہ اصرار کیا۔ لیکن اس مردِ خدا نے سب کو جواب دے دیا۔ دشواناتھ اس وقت صرف سال بھر کے تھے (ولادت: ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ قاصر صاحب نے کہا کہ میں ان بچوں کے لیے ماں اور باپ بن کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کروں گا۔ مجھے کسی اور چیز کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اور یہ انھوں نے کر دکھایا۔ اس کے بعد وہ عمر بھر مجرور رہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد بیشتر زمانہ امرتسر ہی میں گزرا۔ وفات سے کوئی نو دس مہینے پہلے اپنے بیٹے دشواناتھ دشا کے پاس کو روکشیتر میں رہنے لگے تھے۔ دشواناتھ صاحب گو دمنٹ کالج، لاہور میں ایم اے کے طالب علم تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا، اس پر انھوں نے مشرقی پنجاب یونیورسٹی

سے ایم اے کیا اور پھر ۱۹۵۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دوبارہ تادمخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی سند حاصل کی۔ آج کل گورنمنٹ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تاریخ اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔

قاصر صاحب کا ذیابیطس کا مرض پرانا تھا؛ دل کا عارضہ بھی تھا۔ زندگی کے آخری ۲۵ برس کم و بیش علالت ہی میں بسر ہوئے۔ یہی کیا کم تھا کہ کیتسر ہو گیا۔ لیکن موت کا بہانہ عارضہ دل ہوا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے رگمراہے عالم جادوئی ہو گئے۔ انھوں نے موت کا جس خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور جیسے آخر تک خاندان کے مختلف افراد اور دوسرے حاضرین سے باتیں کرتے رہے۔ ”وہ تبسم برب ادست“ کا حیرتناک نمونہ تھا۔ حقیقتاً ان کی موت سے ایک عظیم انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ ایسا خوددار اور نڈر آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی تحریک کے زلزلے میں قید رہے تھے؛ جلیانوالہ باغ امرتسر کے المناک سانحے کے وقت وہاں موجود تھے اور اسی کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ بعد کے زلزلے میں ان کے تمام سیاسی اکابر سے ذاتی تعلقات تھے، انھوں نے انعام پبعاً وضع طلب کرنا تو درکنار، کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ سچ و سید و سید المطالعہ شخص تھے۔ چونکہ فادسی اور انگریزی میں دستگاہِ کامل تھی، اس لیے مذاہب عالم اور فلسفہ اور تادمخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اسی سے ان کی اپنی زندگی بالکل قدیم فلاسفہ اور روحانی پیشواؤں کی نشی ہو گئی تھی۔

متحدہ کتابیں ان سے یادگار ہیں: (۱) ڈال ڈال، پات پات (مکتوبات، ۱۹۶۰ء) (۲) پرچم ضیا (۱۹۶۱ء)؛ (۳) جواہر پارے (۱۹۶۲ء)؛ (۴) گلاب (کلام اردو)؛ (۵) اہل سیف (۱۹۶۳ء)؛ (۶) ہومر (۱۹۶۵ء)؛ (۷) میراجائی (۱۹۶۶ء) (۸) ذکر و فکر (کلام، ۱۹۶۷ء) شکر مکتوب الیہ میں وہ خطوط جمع کیے تھے، جو ان کے احباب نے ان کے نام رکھے تھے۔ ان کی شرماتل و ذل کا نمونہ ہے۔ سلاست اور ایجاز بیان ان کے جوہر خاص تھے۔ چونکہ علم و ادب پر گہری نظر تھی اور حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے اپنے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے تحریر میں تادمخی اور مذہبی تلمیحات کثرت سے استعمال

کرتے تھے حکومت ہندوستانی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۱۹۶۹ء میں "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا تھا۔

اب ان کے چند شعر دیکھیے :-

وہ قلنگاہ میں ہے خنجر آذما قاصر! چلو کہ وقت ہے اب قسمت آزمائی کا
 کس کیسی ہے یہ دردِ ہنساں کی سینس ہم بھی تو، قاصر! آپ کا داز
 سنے کا لطف خاک ہے ہمدرد! جہاں میں جیسا ہے اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
 ہزار باب بنے ہم، ہزار بار سے جہاں میں نقشِ کفِ پائے رہرواں کی طرح
 حرم میں، دیر میں کیا اختلاف ہے قاصر! یہاں بھی ان کے طلبگاہ میں دہاں کی طرح
 بشر کو چاہیے آستہ کو ہو، اسے قاصر! نہ مود کا بھی سرِ راہ دل دکھا کے چلے
 بلبل کو دیکھنا ہوں کہیں، گرچہ سنے وہ روتا ہوں زار زار کہ خود ہوں وطن سے دور
 حسیں ہیں اور بھی دنیا میں، لیکن محبت ہو گئی ہے کچھ تھیں سے
 کسی کے گیسو درخ کی یہ قہن ہے غرض ہے کھر سے ہم کو، نہ دیں سے
 بتاؤ، دل دیا ہے کس کو، قاصر! نظر آتے ہو کچھ اندر کہیں سے
 یہ سادگی بھی عجب سادگی ہے، اسے قاصر! کسی نے وعدہ کیا، تم نے اعتبار کیا
 کیا کہوں خود کو مٹا دینے کے قاصر فائد سے

دانہ خرمن بن گیا، مٹی میں مل جانے کے بعد

شوش سرسبز گل پر نہیں ہے منحصر جوش و حشر ہوا ہے بار بار اگلے برس
 کیسے دن آئے ہیں قاصر! گردشِ تقدیر سے دل ہے کچھ حد سے زیادہ بقیار! اگلے برس
 لے جا کے اُس گلی میں، یہ دل نے کہا مجھے پہنچا دیا یہاں آجھے، آگے نہ افسب!
 ساتھ ہی اس کے نکل آئیگا دل میرے سینے سے نہ ظالم! تیر کھنچے
 آخِ شب، دقت ہے تاثیر کا دل سے قاصر! نارِ شب بکیر کھنچے
 ہوتی ہے ان کی ہاں میں، "نہیں" بھی مل ہوتی

اقرار بھی وہ کرتے ہیں، انکار کی طرح

اپنے ہی پہلو میں دشمن ہو، تو کوئی کیا کرے !

دل ہمارا آشنا کا آشنا ہو گیا

ہو اسے باغ کی ہے، ہم صیغرو! کس کو آگاہی

یہاں کبجِ قفس ہی میں ہوئے ہیں بالِ دیر پیدا

حال پوچھو نہ زندگانی کا _____ ہے کرم مرگِ ناگہانی کا
آلامِ عشق، راحتِ پیہم سے کم نہیں _____ اے بواہوس! یہ زخم بھی مرہم سے کم نہیں
منحصر دیکھا کرم کو جرم پر، تو حشر میں _____ بیگنا ہی بول اٹھی میں بھی گنہگاروں میں ہو
فمنصے سود و زیاں کے اس تجارت میں نہیں _____ میں دل و جاں سے محبت کے خریداروں میں ہو

نہیں آتا کبھی نالہ بون تاب _____ ہمارا ضبطِ غم ہے کیا فغاں سود

نہ ترے دل میں جگہ ہے، نہ تری محفل میں _____ اب وہ اخلاص کہاں، دور کے نظار میں

آنکھیں مری کھلی ہیں، ایسری میں ہم صیغرو! _____ کبجِ قفس میں خاک کہوں، ہجر لے دل

زندگی کا کوئی مقصد نہیں، قاصرِ محاسن _____ خوابِ دلچسپ ہے، پر حائلِ تعبیر نہیں

سر پھوٹنے کو سنگِ سر راہ کم نہیں _____ دیوانگی میں کیا ہے دردِ بام سے غرض

رسوائیاں کسی کی محبت میں ہیں، تو ہوں _____ مطلب، ننگ سے نہ ہیں نام سے غرض

قاصر ہو ان پہ حالِ دلِ راز منکشف _____ اتنی ہی بس ہے شکوہِ آیام سے غرض

نارِ سا آہ، غد و چرخ، زمانہ دشمن _____ اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنائیں کو خیر

کیا رسوا محبت میں مجھے فریاد و شیون نے

اگر تابِ تخیل ہو، تو دنیا را ز داں کیوں ہو!

سراغِ ان کا اگر پاؤں، تو اس سے اس قدر پوچھو

یہاں ہو کر عیاں کیوں ہو عیاں ہو کر نہاں کیوں ہو!

یہ جانتا ہوں کہ اچھی نہیں ہے بتیانی

ہو ضبطِ خاک، اگر دل کو تاب ہی نہ

ابوالکلام آزاد

اک جہانِ علم و فضل، اک کائناتِ عقل و ہوش
 عرشِ اعلیٰ سے زمیں کے نام پیغامِ سر و شوش
 ایک کوہِ استقامت، پیکرِ عزم و ثبات
 ایک بحرِ بیکرانِ رازِ باہرے کائنات
 ایک دل، دامنِ دہ اسرارِ خلوتِ نگاہِ ذات
 اک نظرِ بینندہ، نظارہٴ حسنِ صفات
 تھے صفات اس کے فقط شرحِ فروعِ حسنِ ذات
 ذات تھی اس کی فقط نظارہٴ حسنِ صفات
 اس کی شخصیت میں پہاں ایک ملتِ اک جاں
 ایک برگِ گل میں اقصاں رنگِ بوسے گلستاں
 وارثِ عہدِ قدیم و خالقِ عصرِ جدید
 مصدرِ فکرِ سلیم و مخزنِ خالقِ حمید
 مرجعِ اہل سیاست، مرشدِ اصحابِ دین
 مطلعِ انوارِ عرفان، مشرقِ مہرِ یقیں
 رزم میں تیغ و سناں، اور رزم میں باغ و بہار
 ایک طرحِ آتشِ نشان، اور دوسرا رخِ لالہ بار
 صورتِ مسحور کن سے، یوسفِ مصرِ جمال
 نطقِ دلکش سے، کلیمِ طورِ عرفان و کمال
 زندگی افزا، حیاتِ افروز، اس کا سرِ سخن
 ہر تخیلِ مقاصدِ عزم اس کا حرفِ کون
 اس کے ہر لفظ میں صدایِ علم و آگہی
 اس کی درویشی کے سر پر سرنگوں شاہنہی

شرع و ملت کا امین، فقہ و سیاست کا امام

وہ فصاحت کا، بلاغت کا، صحافت کا امام

جس نے دیکھا اور سمجھا طرز و طورِ بوالکلام

اس پہ ثابت ہے کہ ہے یہ دورِ دورِ بوالکلام

قرنِ بابا بد کہ تارِ یک مردِ حرِ گردِ عیاں

عبدِ دورِ ملکِ مصر، آزادِ درِ منڈستان

جس کے اک اک لفظ میں پنہاں تھی جانِ ندگی

بزم میں جس کا تکلم تھا نشانِ زندگی

جس کا نطقِ سحرانگن سرِ بہرِ تخیل تھا

جس کا فکرِ عرشِ پیادہر کی تفسیر تھا

ملک ہے خرومِ آج اُس عظمتِ کردار سے

تشنہ ہے ذوقِ ادب اُس مُدِرتِ افکار سے

سرزمینِ منہدِ وقتِ یاسِ بے اندازہ ہے

دفترِ علم و بصیرتِ آج بے شیرازہ ہے

آسماںِ راتِ بودِ گمِ خوںِ بیاردِ بزمِ زمیں

بہرِ وفاتِ حضرتِ آزاد، امیرِ ملکِ دیں

سید مسعود حسن رضوی ادیب اور وقیر

جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، مسعود صاحب نسباً سید تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ خاندان مغلیہ کے زمانہ زوال میں خیشاپور سے ہندستان آئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور وہ لٹل بعد نسل حکومت میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے، جاگیریں بھی عطا ہوئیں، اور منصب بھی۔

مسعود سن ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ (مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء) کو ہرائچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مرتضیٰ حسین صاحب علم بزرگ اور پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ وہ دراصل بنواری ر ضلع آٹاؤ کے رہنے والے تھے، لیکن بھٹی میں تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ہرائچ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے ملنے والے ان کی صداقت فن اور اشتہار سے متوجہ ہو کر معترف تھے۔ ان کا ۸ شوال ۱۳۱۹ھ (۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے چچے تین خرد سال بچے چھوڑے، سید مسعود حسن، اور ان کے چھوٹے بھائی سید آفاق حسین رضوی (یہ پیشے کے لحاظ سے ہو مو پٹھیک ڈاکٹر ہیں۔ ولادت ۱۱-۱-۱۱) اور ایک بھائی سیدہ بیگم جو مسعود حسن صاحب سے صرف ڈھائی سال چھوٹی تھیں، یہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور میں مقیم ہو گئی تھیں، وہیں انتقال ہوا۔

سید مسعود حسن صاحب نے خود لکھا ہے کہ چار برس، چار مہینے، چار دن کی عمر میں میری بسم آ ہوئی۔ ان کے والد انھیں بھی اپنی طرح ”طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم“

بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم اسی پنج پر شروع ہوئی۔ لیکن والد کی بیوقت و وفات نے اس کا رخ بدل دیا۔ حالات حیدرآباد سازگار تھے، اردگرد دستگیروں اور عہدہ داروں سے دشمن اور بدخواہ زیادہ۔ ایسے میں بھی اس دور یتیم نے محنت نہیں ہادی اور مالی مشکلات اور مناسب مشورے کے فقدان کے باوجود اپنا تعلیمی دور نہایت شاندار طریقے پر بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم نجی طور پر ہر رات میں ہوئی۔ یہاں زیادہ تر اردو سے مزاد لیت رہی۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے اور خیر آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، چھ درجے میں لیے گئے۔ بہر حال اس کے بعد تعلیمی زمانہ بہت کامیاب رہا۔ اسکول کے زمانے میں ہر درجے میں اول آئے اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۷ء کیننگ کا لکھنؤ سے بی اے کی سند لی۔ لکھنؤ برس (۱۹۱۷ء) ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن تندرستی خراب ہو جانے کے باعث امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔

اسی زمانے میں صوبہ متحدہ شمال و غرب (حال اتر پردیش) میں ایک نئی آسامی نکلی۔ کام یہ تھا کہ صوبے میں جو کتاب چھپے، اس کے ضروری کوائف سرکاری گزٹ میں شائع ہوں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں سید مسعود حسن کو اسی آسامی پر تقرر ہو گیا۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال رہے۔ انھوں نے خود کوئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس دوران میں مختلف علوم کی چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں مطالعہ کیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہر طرح کی ضخامت کی کتابیں ہونگی۔ کچھ بھی ہو، اردنہ او سطر آٹھ کتابوں کے مجموعی صفحات ۵۰۰۰ سے کم کیا ہونگے! اور یہ مطالعہ مسلسل تین برس تک جاری رہا۔ صرف یہی نہیں، وہ ان مطبوعات کی فہرست بناتے، ہر ایک کا خلاصہ تیار کرتے، اور اس پر تبصرہ لکھتے۔ یہ کوائف یونیورسٹی کے سرکاری گزٹ میں ہر تیسرے مہینے چھپتے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس متنوع مطالعے کا ان کے دل و دماغ کی تشکیل اور علم و عرفان کی تکمیل پر کیا اثر ہوا ہوگا! یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں ان کی محنت کی عادت اور تصنیفی فہارت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی۔

۵ کاش ! کوئی اللہ کا بندہ ان مضامین کا کھوج لگا کر انھیں جمع کر دیتا۔

۱۹۲۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے "ایل ٹی" (یعنی پڑھانے کی سند) حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، فستج گڑھ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ لیکن اس کے چھ سات مہینے بعد ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جوینیئر لیکچرر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ حال آنکہ اس نئے عہدے کی تنخواہ اور مستقبل کی توقعات فستج گڑھ کی مدرسے سے نہیں کم تھیں، انھوں نے فستج گڑھ کو خیر باد کہا، اور اپنے وطن بٹانی لکھنؤ چلے آئے، جہاں اردو کی خدمت کے مواقع زیادہ تھے۔ یہیں سے انھوں نے اثنائے ملازمت میں ایم، اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی (۱۹۲۴ء) اس نمایاں کامیابی پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔

وہ درجہ بدرجہ اردو کے سینئر لیکچرر (۱۹۲۷ء)، فارسی ریڈر (۱۹۳۰ء) اور صدر شعبہ اردو فارسی (۱۹۳۰ء) مقرر ہوئے۔ آخر کار طویل اشتداد کے بعد ۱۹۵۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، اور ۳۲ سالہ کامیاب ملازمت کے بعد یہیں سے جون ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کے زمانہ تدریس میں لکھنؤ یونیورسٹی میں علم و تحقیق کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سچے شمع لاکھ اندھیرے میں کیوں نہ لکھ دی جائے، اس کا ارد گرد منور ہو جاتے ہیں۔ ان کی بدولت یونیورسٹی کتابخانے کے مشرقی شعبے میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔ وہ ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں انھیں دوسرا موزی عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کے بعد وہ سات آٹھ برس تک مسلسل اس کا شکار رہے۔ بدقسمتی سے بعد کے زمانے میں اس پر تنجیر کی شکایت مستزاد ہو گئی۔ توام شروع سے کچھ کمزور تھا، ان عوارض نے اور بھی تڑھال کر دیا۔ کوئی اور موتا، تو ہتھیار ڈال دیتا۔ بین آفرین ہے ان کی ہمت پر کہ انھوں نے نہ تعلیم سے ہاتھ اٹھایا، نہ کبھی محنت سے جی چرایا۔ خدانے بھی مدد کی اور وہ نام کی شکلات کے باوجود ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔ اردو سے انھیں دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ ان کی دوسری دلچسپی فارسی سے تھی۔ اسی شوق کی تسکین کے لیے انھوں نے ۱۹۳۲ء میں فارسی کے گہوارے اور ہندستان کی تاریخی و تمدن کے منبع ایران کی سیاحت کی۔ واپسی پر عراق گئے اور وہاں مقامات

کی زیارت کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔ یہ سفر خالص علمی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، اور مولانا محمد حسین آزاد کے سفر ایران کے بعد اپنی نوعیت کا غالباً دوسرا سفر تھا۔ مسعود صاحب ۵۵ برس تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کی نصف صدی کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:

- ۱۔ امتحان وفاد (۱۹۲۰ء) انگلستان کے ملک شعرا سینی سن کی طویل نظم انیکا رڈن کا نثری ترجمہ، دیباچے اور حواشی کے ساتھ۔
- ۲۔ دستان اردو (۱۹۲۵ء) بچوں کے لیے نظم و نثر کے اسباق۔
- ۳۔ ہمدانی شاعری (۱۹۲۷ء) اس میں اردو شاعری پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسے حالی کے "مقدمہ شرو شاعری کا تہمتہ خیال کرنا چاہیے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۱ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن خود مصنف نے شائع کیے۔ ان کے علاوہ چودا شوروں نے اسے تین مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

- ۴۔ فرنگ امثال (۱۹۲۸ء) اس میں فارسی عربی کے تقریباً ۱۲۵۰ امثال کا ترجمہ اور محل استعمال بتایا ہے۔ اس کے مزید دو ایڈیشن ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء میں

- ۵۔ مجاہد نگین (۱۹۲۹ء) سعادت یار خان نگین کی قابل قدر کتاب مقدمے اور اشعار دیے اور حبال و بلاد کی وضاحت کے ساتھ۔

- ۶۔ فیض میر (۱۹۲۹ء) میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ رضوی صاحب نے فارسی متن پر مختصر اردو ترجمہ اور حواشی و فرنگ کا اضافہ کیا۔ یہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں چھپی۔

- ۷۔ نظام اردو (۱۹۳۱ء) آرزو لکھنوی کی کتاب ہے اس میں تنبیہ کلمات اور مرادفات کے وصول وغیرہ سے بحث ہے۔ مسعود صاحب نے اس پر مفصل تشریحی حواشی کا

اضافہ کیا ہے۔

۸۔ روحِ انیس (۱۹۳۱ء) میں انیس کے سات مرثیوں کا انتخاب، کچھ سلام اور رباعیاں و فرنگ کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مزید چار مرتب (۱۹۵۰ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوئی۔

۹۔ جو اہر سخن (۲) (۱۹۵۳ء) ہندوستانی اکادمی، الہ آباد نے اردو شاعری کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا تھا؛ اس کی دوسری جلد محمد حسین چراگاہی نے مرتب کی تھی۔ مسعود صاحب اس کی تصحیح کی تھی۔ یہ جلد عہدِ میر کے شعرا کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شروع میں ہر ایک شاعر کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں، جس سے اس کی شکل تذکرے کی ہو گئی ہے۔

۱۰۔ شاہ کا ریسی (۱۹۴۴ء) میں انیس کا مشہور مرثیہ "جب قطع کی مسافت شبِ فزائی" محنتِ متن اور فرنگ کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس کی کتاب لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا جو آدم مرحوم نے کی تھی اور اس کے ساتھ کچھ تصویروں بھی تھیں۔ یہ نظامی پر لکھنؤ سے پوری آب و تاب کے ساتھ چھپا تھا۔ اس کی قیمت ۲ روپے فی نسخہ تھی۔ مذہبی حلقوں نے ان تصویروں کی سخت مخالفت کی تھی جس پر بعد کو انھیں نکال دینا پڑا۔

۱۱۔ فائزہ دہلوی اور دیوانہ فائزہ (۱۹۴۶ء) اس کی اشاعت کے بعد جلد ہی ملک تقسیم ہو گیا اور اسی کے ساتھ کتاب کے بیشتر نسخے بھی ضائع ہو گئے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مسعود مرحوم نے جس محنت سے متن کی تصحیح کی ہے

اور فائزہ کے حالات جمع کیے ہیں، اس کی تمام دیدہ و نقدوں نے داد دی ہے۔

۱۲۔ متفرقاتِ غالب (۱۹۴۷ء) مسعود صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۴۹ فارسی خطوط اور کچھ متفرق اردو فارسی منظوم کلام شامل تھا۔ اس کو انھوں نے ایک مسودہ منقذ سے اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن غالب صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط (۱۹۴۸ء) یہ بھی دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں چھپی۔
 ۱۴۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۵۴ء) مرحوم کا مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء اور تحقیق، دونوں پر ایمان تھا۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے ان اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو آب حیات پر کیے گئے ہیں۔ حذف و اضافہ کے جدید کتاب دوسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں چھپی تھی۔

۱۵۔ مذہبہ انیس (۱۹۵۷ء) انیس کے متعدد مرتبوں کا انتخاب ایک لڑی میں پردہ کر مسر داستان واقعات کو بلا مرتب کی ہے۔ کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی خاطر اپنی طرف سے کوئی شعر یا مصرع بھی اضافہ کیا ہے، جس کا اعتراف دیا چاہیے کہ کتاب میں موجود ہے، لیکن افسوس کہ متن کتاب میں کسی جگہ حاشیے میں نشاندہی نہیں ملتی کہ یہ اضافہ کہاں ہے، تاکہ قاری کو التباس نہ ہو تاکہ کوئی کلام انیس کا ہے اور کونسا مرتب کی طرف سے اضافہ۔ اس کتاب پر اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار کا انعام عطا کیا تھا۔

۱۶۔ تذکرہ نادر (۱۹۵۷ء) از مرزا کلبچین نادر اس میں ۵۲۵ شعرا کے حالات ہیں۔
 ۱۷۔ نسائے عبرت (۱۹۵۷ء) ایمانہ عجائب کے مصنف رجب علی بیگ سرور کی یہ نسبت کم مشہور کتاب ہے، اکی کوکب رحمول عمدگی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔
 ۱۸۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج (۱۹۵۷ء) اس کتاب پر یوپی حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

۱۹۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (۱۹۵۸ء) اس پر بھی اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار انعام دیا تھا۔

۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۹ء) یہ درمل (۱۸) اور (۱۹) کا مجموعہ ہے اسی کتاب پر مرحوم کو ۱۹۶۰ء میں سانیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ ان تینوں کتابوں میں انھوں نے خوب خوب داد و تحیق دی ہے۔ انت کی اندر سبھا کا صحیح متن پیش کیا ہے اور اس کی حیثیت متعین کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں

شائع ہوئی تھیں۔

۲۱۔ آئینہ سخن فہمی (۱۹۵۹ء) سید محمد احمد بخود مولائی نے ادیب صاحب کی کتاب "سادی شاعری" پر اپنے دو رسالوں جو ہر آئینہ اور منظر آئینہ میں غرض کیے تھے، یہاں انھیں کا رد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ گلشن سخن (۱۹۶۵ء) مردان علی خان تبلا کا تذکرہ شعراے اردو۔
۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما (۱۹۶۶ء) ایران میں زمانہ محرم میں تعزیہ شبیہ گردانی کا رواج ہے۔ اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی شکل مذہبی ڈرامے کی سی ہے، یہاں اسی کا بیان ہے۔

۲۴۔ قواعد کلیۃً بھاکا (۱۹۶۸ء) کتاب تحفۃ الہند کا پہلا باب

۲۵۔ اندر بھاکا (۱۹۶۸ء) امانت کی مشہور نظم

۲۶۔ ماداکت "نرم سلیمان" (۱۹۶۸ء)

۲۷۔ شاعر اعظم ایس: مختصر تعارف (۱۹۶۹ء) اس میں منتخب کلام بھی شامل ہے۔

۲۸۔ گارشات ادیب (۱۹۶۹ء) مجموعہ مضامین

۲۹۔ اسلاف میرنیس (۱۹۷۰ء) میرنیس کے اصیاد کے حالات اور کلام کا نوٹ۔ اس پر

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ۱۹۷۲ء میں دو ہزار روپے انعام دیا تھا۔

۳۰۔ شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب

۳۱۔ مرآۃ النجیۃ (مقدمہ) (۱۹۷۱ء)

۳۲۔ انیسیات (۱۹۷۶ء) یہ ان کی وفات کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی کے زیر

انتہام شائع ہوئی۔ اس میں ان کے چھوٹے بچے ۱۔ مضامین شامل ہیں، جو اس

سے پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔

ان کے علاوہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی تھیں، اگرچہ ان کا مسودہ مکمل ہو گیا تھا۔

۳۔ ایران میں مرثیہ گوئی : ایک تاریخی جائزہ دیسلطان عالم واجد علی شاہ کو ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اگرچہ وہ کہیں کہیں میں بھی بند نہیں تھے، لیکن ان کے خاص موضوع یہ ہیں :

- ۱۔ مرثیہ : ۲۔ انیس : ۲۔ اودھ کی شاہی زمین کی تاریخ، بالخصوص غبار واجد علی شاہ۔ انھوں نے ان موضوعات پر گرانقدر اور زمیں پرانی کتاب خانہ حیدر لیا تھا، جس کا بیشتر حصہ انھوں نے آخری ایام میں الگ کر دیا تھا، اس کا کچھ حصہ مختلف یونیورسٹیوں میں بیچ گیا ہے۔

لکھنے کے معاملے میں وہ سست رہتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ مجید مختاط تھے، جب تک موضوع کے ایک ایک جز و تک کے بارے میں انھیں اطمینان نہ ہو جاتا، وہ نہ تو اپنے نتائج فکر کو آخری شکل دیتے، نہ اس کا کوئی حصہ شائع کرتے۔ یہی باعث ہے کہ ان کی موضوعات کی تعداد زیادہ نہیں۔ کتا اور رے دوڑی کا معاملہ ہوتا، اور محض سستی شہرت حاصل کرنا ہی ان کا مطلق نظر ہوتا، تو یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن سبالت موجودہ یہ اتنی مختصر بھی نہیں کہ کوئی سنجیدہ مورخ ادب اس سے صرف نظر کر سکے۔ اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ مجید قابل قدر اور مستند علیہ ذخیرہ ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مَدَنوں اس پر آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکیگا۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین اور شذرات کی بھی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑی ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے، تو ان سے کئی مجلد تیار ہو سکتے

ہیں۔

ان کی مسلسل علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف حکومت نے بھی کیا، اور اردو دان حلقے نے بھی، متعدد کتابوں پر انعام ملے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ سندھ سے انھیں فارسی کے فاضل کی حیثیت سے اپنا خاص اعزاز عطا کیا، جو ایک سزا، شال اور چین حیات تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفے پر مشتمل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں حکومت نے ”پدم شری“ کا خطاب بھی دیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں حکومت اتر پردیش نے ان کی تصنیفی

کاوشوں کے لیے انھیں پانچ ہزار کاغذات عام، ایک مشین دیا اور ایک سندھی عطا کی۔

۱۹۲۶ء میں ان کی شادی ٹیکا پور (کا پورہ) کے مشہور طبیب حکیم سید محمد اصغر جعفری نعمت الہی عرف پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہان بیگم سے ہوئی۔ سید محمد اصغر جعفری کا سلسلہ حضرت شاہ نعمت اللہ دہلوی سے ملتا تھا، جن کا آئندہ کی پیشگوئیوں پر مشتمل قصیدہ شہرہ آفاق ہے؛ اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "نعمت الہی" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بیگم مسعود مرحومہ کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں؛ اردو میں شعر بھی کہتی تھیں؛ حزم میں تخلص تھا۔ انیس کی عاشق تھیں، بلکہ حافظ بھی۔ ان کا انیس کا مطالعہ کس درجے کا تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے، کہ جب بھی مسعود صاحب کو انیس کے کسی بند کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرتبے میں ہے، تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحومہ نہ صرف نشاندہی کرتیں، بلکہ متعلقہ جلد لاکر پیش کر دیتیں۔ موت سے کچھ پہلے وہ اردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں، لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ان کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بھارتی قلوب انتقال ہوا۔

ان بیگم سے مسعود صاحب کی سات اولادیں ہوئیں: (۱) سب سے بڑی صاحبزادی ارجمند بانو یہ ڈاکٹر بیج الزماں (الہ آباد یونیورسٹی) (ف: فروری ۱۹۷۵ء) کے عقد نکاح میں آئیں۔ (۲) مسعود صاحب کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید اختر مسعود؛ پشاور یونیورسٹی (پاکستان) میں فاضل کے استاد ہیں۔ (۳) ان سے چھوٹی صاحبزادی برجیس بانو ایم اے (اردو) کراچی کے ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ (۴) تیسری بیٹی انیس بانو اپنے شوہر کے ساتھ امریکا کے شہر کیلی فورنیا (سینٹ لیس) میں مقیم ہیں۔ (۵) ڈاکٹر نیر مسعود دوسرے بیٹے نکلندو یونیورسٹی کے شعبہ فاضل میں تدریس ہیں (۶) ان سے چھوٹے بیٹے سید انور مسعود رضوی "نیشنل یونیورسٹی" کالج، کھٹو میں پڑھاتے ہیں۔ (۷) سب سے چھوٹے صاحبزادہ اظہر مسعود رضوی، یوپی اردو اکادمی، کھٹو میں مہتمم نشر و اشاعت ہیں۔

ادیب مرحوم کے قائم کردہ اشاعتی ادارے "کتاب گھر" کی نگرانی بھی انھیں کے ذمے ہے۔

بکسری کے ساتھ شدرستی جواب دینے لگی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بگم کے انتقال کا انھیں قدر بہت صدمہ ہوا، اور اس کے بعد بہت اندر رہنے لگے تھے۔ حالِ فطری بھی بہت کمزور ہو گیا تھا؛ بات جلدی بھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود تقوُّدِ اہل بیت لکھنے کا شغل جاری رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۵ء میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور بیشتر وقت خود رستگی سی طاری رہنے لگی تھی۔ ۲۹ جولائی کو خاموشی اور شدید اسردگی کا دورہ پڑا؛ اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ اس کے بعد دوا و دوش سے کچھ افادہ ضرور ہوا، لیکن بستر سے اٹھنے کی سکت سلب ہو گئی۔ پورے چار ماہ اسی حالت میں گزرے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء (شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ) رات کے پونے نو بجے خالقِ حقیقی کے بلا وے پر بیک کہی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
جاذہ اگلے دن (۳۰ نومبر) اٹھا۔ اہل سنت اور اہل تشیع نے الگ الگ نمازِ جاذہ پڑھی بھی جماعت کی امامت شیدائے علما و مولا ناسید علی نقی صاحب مجتہد (عرف نقی صاحب) نے اور اہل سنت کی مولا نامحمد ہاشم انصاری فرنگی محلی (بن مولا ناصبغۃ اللہ شہید انصاری) نے کی۔ بعض اصحاب نے دونوں نمازوں میں شرکت کی۔ انھیں کربلائے نمشی فضل حسین میں اپنی مرحومہ بگم کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یرحمہما اللہ تعالیٰ

کئی اصحاب نے تادیک و فوات کہی۔ ڈاکٹر رفیق حسین رفیق لکھنوی کی عیسوی میں ہے، شیدائے انیس، افسوس اب ہم سے ہو خست ہماں ہوئے جنت کے مسعود حسن رضوی بیاختہ نکلا ہے منہ سے یہ رفیق اپنے "آگاہِ حقایق تھے مسعود حسن رضوی"

(۱۹۷۵ء)

ہجری ہزارِ حکیم عزیز قدوسی کامٹھی کا ہے؛

آہ، صد حیف مسعود حسن رضوی (۱۳۶۵ھ)

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی؛ ادیبِ تخلص کیا بعد کو

جب شرنکاری سے مزادلت بڑھی، تو یہ شغف ترک ہو گیا۔ لیکن اس زمانے کا جو کلام تھا، اس کا ایک مختصر انتخاب انھوں نے "سہادی شاعری" کے دیباچے میں درج کر دیا تھا۔ میں نے جب ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ کچھ اور کلام بھی عنایت فرمائیں، تو کہا کہ بس، اب اسی کا راکلام سمجھیے! لہذا میں وی اشعار یہاں درج کر رہا ہوں۔ کلام کے متواتر ہونے کے اگر وہ یہ شوق جاری رکھتے، تو آج ان کا تمناز شعرا میں شمار ہوتا۔

جذبہ دہکا بے نیازی سے اثر بڑھتا گیا
کچھ غیب عالم ہے، راہ نزل مقصود کی
فرط غیبی سے دنیا بن گئی آئینہ دار
کیا کہو، دیوانگی عشق کی رسوائیاں
اک نازد تمنا، اک بہارستان شوق
ہے اک نقشہ دل مجبور کی اٹھتی امنگوں کا
دردہ لہنیں سنسن کے کہنے دے زرا، اے عشق ضبط!

اک دل نا آشنا کا امتحاں لینا ہے آج
آج کی چشم کرم نازد میسائی ہے
ابھی کچھ مردہ تمناؤں میں جان آئی ہے
پاؤں میں سوئی ہے بری کی گرائی عسوس
دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آذاد ہوں میں
بلا جن سے نشین، جب وہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں

تو چادر آئینہ بہا آگیا ہوں میں خاک نشین پر
یہ سہی مردہ داری ہو، اور دال لگاں ہو
دہ حال دل ہو پچھیں ہر سوئے تن زبان ہو
سمجھے تھے طوفان بہتی میں جسے جانے پناہ
ایک موج کوہ پیکر، وہ بھی کفّی ساحل تھا
اب خبر دیکھیے بیمار کی کیا آتی ہے
ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے
اس کی چشم مست ہستیاہوں کے در کھلے
ان دنوں کیوں جی نہیں لگتا ہر گلشن میں کہیں
خوف رسوائی نہیں، تو ضبطِ غم سے کام کیا
پختہ کاران جنوں کو ہوش رنگ نام کیا

خط سے کیا مطلب مجھے، قاصد سے مجھ کو کام کیا

دل میں جو رہتا ہے، اس کو نامہ و پیغام کیا

مجھے قاسمِ ازل سے کبھی کچھ گلا نہ ہوتا جو یہ تم ملے تھے مجھ کو، تو یہ دل ملا نہ ہوتا

وہ سیرِ دشتِ وحشت، اور وہ میرے دل کی ویرانی

اُدھر تھا میں بیا باں میں، ادھر مجھ میں بیا باں تھا

گر یہ غم پہ بھی آگے جسے آتی تھی سنسی وہی دل خندہ شادی سے بھی دیکھ رہے اب

تھے ہم آزاد، جب آباد تھی دنیاے خیال حلقہٴ حدِ نظر، حلقہٴ ذخیرے اب

صفحوںِ دل کے سوا، جو کہیں دنیا میں تھی ذرے ذرے میں جہاں کے وہی تصویر اب

اب کہاں میں وہ کہ جس کے بس کا ہو افسارے

دل میں طاقت چاہیے، ضبط و نفاذ کے واسطے

بس اک یہی حسرت ہے اب، اے طولِ حیدرانی!

مجھ سے جو ملیں وہ، تو میں جی کھول کے ردول

ہم سخنِ لاکھوں ہیں، لیکن ہنرِ باں کوئی نہیں

مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوتِ خانہ ہے

خوشی میں رنج، کہیں کیا مال کے علم کو خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو

اپنی تدبیروں پہ اے غافل! نظر تو نے نہ کی

درد نہ ٹرہ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا

غمِ شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سہنا پڑا اپنے مہرِ دردوں سے آخرِ دردِ دل ہنا پڑا

ہر تبسم میں دہاں پہاں تھی برقِ عقل سوز میں سمجھتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے

ہم خاک کو سمجھا کیے اکیر ابھی تک تدبیر رہی تابعِ تقدیر ابھی تک

بھر ظلم پہ مائل ہیں تو اتنا بھی سمجھ لیں باقی ہے مری آہ میں تاثر ابھی تک

شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ اذ سے اٹھواٹے ہے

حال کس بسمل کا اس نازک سے دیکھا جائے ہے!

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیب! یتور بدل گئے مرے نازک مزاج کے
پیری آئینے سے خود میں کو یہ دیتی ہے صدا

اب سیرما جانوں کہ ترے ناز اٹھائے کوئی
دنیا کو کیا خبر مرے حالِ ستاہ کی فرصت کہاں ہجومِ مصائب میں کی
دیکھے قسمت کی محرومی کہ مثلِ شاہ آہ جس کے تدویر سے لگائیں اس نے ٹھکر ایچ
طاقت پر داز بھی ہے، ہمت پر داز بھی، ش پر ہوتے، نکلتی حسرت پر داز بھی
دیا یہ شوقی پر داز اکلِ قفس کے رہنے واسے کو

مجھے تجھ سے بس اتنا، میرے فطرت سا دکھنا ہے

تمکین مرہست، سید محمد قادر الدین خان

حیدر آباد کن کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید مسیح الدین خان ریاست نظام کے منسب دار تھے۔ وہ عوام میں بڑے بخشی کے عرف سے مشہور تھے۔ حیدر آباد کے محلہ مغلیہ پورہ میں مسیح الدین خان کی ڈیوڑھی انھیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھانجے تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو جاگیر گورٹ آن وارڈ کی تجویز میں چلی گئی۔ اور حضور نظام نے نواب مسیح الدین خان کو معین الدولہ کا ولی اور نگران مقرر کر دیا۔ مسیح الدین خان کا ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۵۵ سال کی عمر تھی۔

نواب مسیح الدین خان کے پانچ بیٹے ہوئے (۱) ہدایت محی الدین؛ (۲) عبدالقادر؛ (۳) دستگیر الدین خان؛ (۴) قادر الدین؛ (۵) سلطان محی الدین؛ اور تین بیٹیاں : لاڈلی بیگم، قادری بیگم اور جیلانی بیگم۔

سید قادر الدین خان کو بچپن سے ادبی ماحول ملا۔ والد اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے، لیکن ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، جیسا اس عہد کے اکثر رؤسا کے یہاں ملتا ہے۔ قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔ سید عبدالقادر کا تخلص ناصر تھا۔ ان سے چھوٹے سید دستگیر الدین نادر تخلص کرتے تھے، ڈراما نویس سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے بعض غیر مطبوعہ ڈرامے ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان

حی الدین بھی شعر کہتے تھے اور قاسمی تخلص کرتے تھے۔

سید قادر الدین کی پوری تعلیم گھر پر ہوئی؛ کسی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ تھی؛ انگریزی بھی بقدر ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے دل کا خاصا بڑا کتابخانہ تھا۔ انھوں نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ جمع کرایا تھا۔ اپنے ماحول کے زیر اثر جلد ہی شعر کہنے لگے۔ تمکین تخلص تھا۔ "مرست" کا اضافہ اپنے کسی صوفی بزرگ کے نقب سے کر لیا تھا۔ آغاز شعر گوئی میں کچھ دن غلام محمد عرف ترک علی شاہ ترکی (ف: مارچ ۱۹۱۹ء) سے اصلاح لی۔ بعد کو مدثوں نظم طباطبائی (ف: مئی ۱۹۳۲ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ وہ نظم طباطبائی کی فنی اور علمی قابلیت اور مہارت کے بہت قائل اور متاثر خوان تھے؛ ادو کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے بہت فیض حاصل ہوا۔

ان کا کلام اپنے عہد کے مؤثر جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ لیکن داد ستہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کبھی اسے مرثیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اندیشہ ہے کہ اگر فوری نوچہ نہ کی گئی، تو اس باکمال شاعر کی کوئی یادگار نہیں رہی۔ اگرچہ بنیادی طور پر غزل سے مرزا دولت تھی؛ لیکن انھوں نے بعض معرکے کی زبانیں بھی کھیں ہیں۔

سادہ عمر کہیں ہم کر کام نہیں کیا۔ بعض اعزہ و اجات نے سبیل پیدا کی بھی؛ لیکن ان کے لاابالی پن نے یہ علق زیادہ دن تک قائم نہ رکھا۔ نواب معین الدولہ ان کے پھپرے بھائی تھے۔ جب وہ دارالمہام مقرر ہوئے، تو انھوں نے بلدے میں ان کا بحیثیت مددگار پولیس تقرر کر دیا۔ لیکن یہ سڑینگ کے دوران ہی میں مستعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اسی طرح تعلقہ دار درجہ اول نواب کاظم جنگ نے (جو شعر کہتے اور کبھی کبھی ان سے مشورہ بھی کر لیتے تھے) ان کے لیے نوڈ آفیسر کے عہدے کا انتظام کر دیا۔ شاہرہ عقول تھا، اور اس پر کام اور ذمہ داری برائے نام۔ لیکن یہ شاید ایک سال سے زیادہ نباہ نہ کر سکے۔ غرض تھوڑا بہت جو کچھ اپنی خانہ دانی جاگیر اور منصب سے مل جاتا، شہر سے اسی پر قانع رہے۔ لیکن پولیس کچن

اور اس کے بعد انضمام ریاست پر یہ آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ لطف یہ کہ اس پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ وہی وضع داری اور آن بان اور ٹھٹھا، جو ساری عمر ان کا شعار رہا تھا، اس کے بعد بھی قائم رہا۔

آخری زمانے میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ غذا بالکل ترک ہو گئی تھی۔ بہت مجبور کرنے پر دو چادر لٹے یا دودھ پی لیتے۔ کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت کی خرابی کی شکایت کی۔ بیگم نے خیال کیا کہ کمزوری کے باعث یہ تکلیف ہے۔ وہ گیس کے گرم دودھ لاکے انھیں پلائیں۔ واپس آئیں، تو روح نفیس عنقریب سے پرواز کر چکی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا رَاجِعُونَ۔ اسی دن بعد نماز عصر تجہیز و تکفین عمل میں آئی، اور درگاہ شاہ خاموش کے احاطے میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیلدار سہارنپور) کی صاحبزادی بدر النساء بیگم سے ہوئی۔ وہ اردو فارسی بہت اچھی جانتی ہیں۔ شو بھی کہتی ہیں، بیگم تخلص ہے۔ مرحوم سے دو بیٹے (سید یوسف شرف الدین (عرف یوسف سرمست) اور سید قیصر صلاح الدین (عرف قیصر سرمست) اور ایک بیٹی جمیلہ حامدۃ النساء بیگم یادگار ہیں۔ — یوسف سرمست عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "بیسویں صدی میں اردو ناول" شائع ہو چکا ہے۔ چھوٹے بیٹے قیصر سرمست معروف آرٹسٹ ہیں، سرورق کا ڈیزائن بنانے میں ان کی خاصی شہرت ہے۔ تینوں شادی شدہ اور ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔

کلام بہت نچتہ اور جاندار ہے۔ افسوس کہ مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں غزلیات کے مختصر انتخاب اور ان کی ایک نظم بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی بیگم اور صاحبزادے قیصر سرمست کی ہر پائی سے متیا ہوئی ہیں ان کے حالات بھی انھیں سے ملے ہیں:

ہم یاد کر رہے ہیں انھیں کس امید پر
اب تو غم فراق کا بھی آسرا نہیں

حال آں کہ تم نے کب کا بھلا بھی دیا، مگر
تم مجھ کو بھول جاؤ گے، دل مانتا نہیں

کہنے کو اب بھی زندہ ہوں، لیکن ترے بغیر
کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے ورنہ جنوں عشق کا کچھ مدعا نہیں
 تمکین! جفلے یار کو معلوم ہو تو ہو اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کھلا نہیں
 اک لمحہ فریبِ اجل کے سوا مجھے کس وقت انتظار تھا راہِ راہ نہیں
 دنیا و دیں لٹا کے اسے دیکھ تو لیا یہ اور بات ہے کہ کہیں کا راہ نہیں
 مقامِ نوبت میں پوچھو کہ دیوانوں پہ کیا گزری
 خزاں میں جو گلستانوں پہ گزری سب پہ ظاہر ہے
 کسی کو کیا خبر لیکن، بیابانوں پہ کیا گزری
 ذرا جوشِ جنوں، دردِ محبت اور رُخسہ دہنے دو
 یہ داماں خود بتا دینگے، گریبانوں پہ کیا گزری
 جو کچھ بیتی، سو بیتی مجھ پہ لیکن کیا کہوں تمکین!
 مرے ضبطِ مسلسل سے سترانوں پہ کیا گزری
 کہاں کی رزنی، ہم لطفِ تاریکی بھی کدو بیٹھے
 شبِ غم اپنی آنکھوں پر بھر دسا کر کے پھٹکے
 امیروں کا طوفان ہے، نہ اب طغیانِ زبیری
 کچھ ایسا درد ہے دل میں کہ جس سے جی نہ گھبرائے
 حقیقت میں وہی رُودادِ عینِ عشق ہے، تمکین!
 کہ لب تک بھی نہ آنے پائے، اور دل میں تر جائے
 اسی کو یاد کہتے ہیں، یہی تو یاد آنا ہے
 اب اس میں کیا کسی کو، میں ہوں کس کا کون سا میرا
 وہ اپنے زعم میں جس کو کھلا دیتا سمجھتے ہیں
 بظاہر میں ہوں ان کا جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں
 عجب چیتاں ہے یہ کیفیتِ دل
 نہ دوزخ میں داخل، نہ جہنم میں داخل
 کئی کیا ہے منزل کی راہِ طلب میں
 کہ راہِ طلب میں نہیں کوئی منزل
 محبت میں مشکل سے مشکل بھی آساں
 محبت میں آساں سے آساں بھی مشکل

گو تم بھی پاس ہو، اور حاصل ہے ہر خوشی بھی

پھر بھی میں کچھ کمی سہی ہر شے میں پار ہوں

ہر ذرہ کائنات کا اک آفتاب تھا وہ بھی تھی، اور یہ بھی شبِ آفتاب ہے
جو تجھ کو چاہتے ہیں، تجھے چاہتے رہے یہ مان کر بھی اس کا نتیجہ خراب ہے

مت پوچھ، وہ تیری فرقت میں کس ل سے گزرا کرتے ہیں

جو تیری تمنائیں، تیری دوری بھی گوارا کرتے ہیں

ہے فتح و شکست اہل وفاد اہل حفا میں فرق یہی

یہ باد کے جتنا کرتے ہیں، وہ جیت کے بارا کرتے ہیں

دروٹوں کو سنسانا تو سیکھو، تم دل کا لچا دانا تو سیکھو

لے دوست! ڈبو سکتے ہیں دی، جو پار اتارا کرتے ہیں

کیا بان ہے، کیوں ہر بھر کے ترا ہی نام زباں پر آتا ہے

ہم نے تو مٹا تھا، مشکل میں انہوں کو پکا را کرتے ہیں

دوروں کے بھی اہل دانش سے دم بھر گزرا دی جا سکی

جو زندگی تیرے دیوانے بنیں جس کے گزرا کرتے ہیں

جان کس کو نہیں عزت، مگر پھر بھی ترکِ وفا کریں کیونکر

ہر قوتِ دل کو آزما کر دیکھا اک اک بت کو خدا بنا کر دیکھا

نیکین! مگر بھولنے والا میرا بھولا نہ گیا، لاکھ بھلا کر دیکھا

بھولا مواراستہ دکھایا مجھ کو میرا اپنا بتایا مجھ کو

دشمن کو میں کیونش دوست رکھوں نیکین! دشمن نے تو آدمی بنایا مجھ کو

ایس نہ ہو، دوری منزل پہ نہ رو

دہر کا کوئی غم نہ کر، ادساں نہ کھو

بھٹکے ہوؤں کا بھی اک وسیلہ ہے ہاں

خود راستہ مل رہیگا، گمراہ تو ہو

مفلس کی دنیا

قضار ایسی دنیا میں ہوا اک دن گزر میرا
 جہاں کی سرزمینِ ذلت جہاں کا آسمان پستی
 جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے
 جہاں حدِ نظر تکِ نِخ و غم کے پرِ خطر بن ہیں
 جہاں کا دُردہ ذرہ دعوتِ آلامِ دنیا ہے
 جہاں کی صبحِ حزن و یاس کی تہید ہوتی ہے
 جہاں کی چاندنی تاریک اور مخموم ہوتی ہے
 جہاں ہے ایک ہی مفہومِ مرگِ زندگانی کا
 جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تقدیر ہوتی ہے
 جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرفِ فاقہِ بدستی
 جہاں جوشِ اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں
 جہاں صدق و صفا کا خونِ نی لیتی ہے ناداری
 جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قالب بدستی ہیں
 جہاں نشوونما پاتے ہیں چوری، جھوٹ، غیاری
 جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایمانِ دگرگاتے ہیں
 یہیں بستے ہیں تنگِ زندگی وہ پیٹ کے مار
 زلے بھر کے دھتکائے خدائی بھر کے ٹھکرائے
 مجسمِ آہ، سرتاپا زبانِ حال کے نالے
 غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں
 ققیلِ جبلِ دہشت، کشتہِ اہلِ مہمِ دنا دانی
 تمول جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے

مگر جس کی یاد میں مجروح اب تک ہے جگر میرا
 جہاں کے وادی و کھسار، افلاسِ تہی دستی
 جہاں ہر صورتِ امید، نو میدی کی نالی ہے
 جہاں کے طائروں کی بولیاں بس آہ و شیون ہے
 جہاں کا چپہ چپہ دوزخوں کا کام دیتا ہے
 جہاں کی شام بیکر دشمنِ امید ہوتی ہے
 جہاں کی دھوپِ سمیت سوزا درِ مسموم ہوتی ہے
 جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہے سونچِ زندگانی
 جہاں آنکھوں پر آرام سے تقدیر سوتی ہے
 جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہن تہی دستی
 جہاں حساسِ خود داری کی نبضیں جھوٹ جاتی ہیں
 جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں محبوبِ غدار
 جہاں آدابیاں بھی قید کے سائے میں ڈھلتی ہے
 جہاں پردہ ان چڑھتے ہیں خیانت، جرم، ہکاری
 جہاں کے خوف سے شبیوں کے دل بھی تھر تھرتھاتے
 جھپٹیں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تائے
 ذلیلِ خوار اپنی سستیوں سے آپ شرائے
 فلک کی آنکھ کے ناسورِ قلبِ ہر کے چھالے
 فناے عزمِ دگر از تقا کی زندہ تصویریں
 امیروں کے رگِ ایوان، مگر از قسمِ انسانی
 تمدن جن کو اک انسانِ ناجیواں سمجھتا ہے

فقط اک خشاکِ ردی جن کے جسمِ جاں کی قیمت ہے
 مشیت کھیلتی ہے رات دن جذبات جن کے
 ہوا کرتی ہیں سامانِ تفرّجِ عصمتیں جن کی
 ارادوں پر بھی غالب جن کے غیروں کا ارادہ ہے
 رہے ہیں جن کے جوہر اس قدر رنگِ ثلث میں
 ہے بس لے دیکے جن کی کائناتِ زندگی ساری
 جنہیں انسان کہتے آدمیت پہنچا پاتی ہے
 فضاے بحر و بر، کون و مکان کو غار ہے جن کے

فقط اک حکم جن کے مذہبِ ایمان کی قیمت ہے
 مستخر کرتی ہے تقدیر احسان جن کے
 رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قیمتیں جن کی
 نہ جن کی اپنی مرضی ہے، نہ جن کا اپنا نشان ہے
 کہ شک مرنے لگے ہے خود انھیں اپنی شرافت میں
 غلامی، مفلسی، فاقہ، مصیبت، بھیک، بیماری
 جنہیں زندہ سمجھتے، زندگی کو شرم آتی ہے
 اجل کو جن سے نفرت، زندگی بیزار ہے جن کے

کوئی غمخوار ہے جن کا، نہ کوئی پوچھنے والا
 خداوند! الہا! داورا! اے دادرس مولا!

محمود بیگ، میرزا

منلوں کے ایک معزز اور پرانے خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے موروثی اعلیٰ داراب بیگ عہدِ عالمگیری میں وسط ایشیا کے شہر فرغانہ (حال تاجکستان) سے ہندستان آئے اور دہلی میں بس گئے۔ یہاں انھوں نے ادران کی اولاد نے بسرِ وفات کے لیے مختلف پیشے اختیار کیے۔ پہلے کے حالات کچھ یقین سے نہیں کہے جاسکتے، لیکن جب ۱۸۵۷ء کا منگامہ ہوا ہے، تو ان کے دادا میرزا افضل بیگ کا شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی دوسرے گھرانوں کی طرح یہ لوگ بھی در کے مارے شہر سے نکل گئے۔ یہی خیال تھا کہ جب اس قائم ہو گیا، واپس آجائینگے۔ لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو دار و گیر کا وہ بازاء گرم ہوا، اور سر پہ آدرہ مسلمانوں کی جاداد پڑا۔ اس طرح مساد کی گئی یا نیلام ہو گئی، کہ ان غریبوں کو بڑی شکل سے محلہ در و گرداں (فراسخانہ) دہلی میں سر چھپانے کو جگہ ملی۔ اس کے بعد خاندان کی مالی حالت بھی بہت کمزور ہو گئی، اور مشکل سے گزر بسر ہونے لگی۔

میرزا افضل بیگ کے پانچ بیٹے تھے: میرزا منور بیگ، میرزا امجد بیگ، میرزا اسحاق بیگ، میرزا یعقوب بیگ، میرزا شہباز بیگ، تبدیل شدہ حالات کے باعث سب کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس لیے والدین نے بڑے تینوں بیٹوں کو پیشہ سنبھالنے پر ریزی کمانے کو چھوڑنے موئے کام پر لگا دیا، صرف چھوٹے در و گرد کے تعلیم

حاصل کر سکے۔ اس طرح میرزا یعقوب بیگ کسی نہ کسی طرح آٹھویں درجے تک پڑھے، اور اس کے بعد میڈیکل کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔ سب سے پہلے میرزا شہباز بیگ سب سے زیادہ خوش قسمت رہے۔ ٹل تک وہ سر کی والان کے عریک اسکول میں پڑھے۔ دیہاں انھوں نے مولانا حالی سے پڑھا تھا؛ اور اس کے بعد جون ۱۸۹۴ء میں دسویں درجے کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۸۹۶ء (۱۹ نومبر عید الفطر) انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یہی میرزا شہباز بیگ ہمارے میرزا محمود بیگ کے والد بزرگوار تھے۔

میرزا شہباز بیگ دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سی (۱۸۹۴ء میں) نیرجن (غربی) کے دفتر میں بطور کلرک بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ نہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، نہ مستقبل سے متعلق غافل رہے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ مختلف امتحانوں میں بیٹھے اور کامیاب ہوتے رہے جس سے تدریج عہدے میں بھی ترقی ہوئی، اور تنخواہ میں بھی۔ ۱۹۳۲ء میں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو سنٹرل پی، ڈبلیو، ڈی کے دفتر میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ افسر تھے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۰۰ء میں شہباز بیگ کی دوسری شادی میرزا محمود حسین بیگ کیل ریاست جاورہ کی صاحبزادی نذیر بیگم سے ہوئی۔ میرزا محمود حسین بیگ بھی ان کے یک جدی اور میرزا داراب بیگ ہی کی ایک دوسری شاخ کے چشم و چراغ تھے۔ اس بیگم سے میرزا شہباز بیگ کے ماشاء اللہ دس لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں سے دو لڑکے صغیر سنی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے تعلیم کے فوائد کا اپنی زندگی میں تجربہ کیا تھا اور یہ انھوں نے خود اپنے زور بازو سے حاصل کی تھی، اس لیے میرزا شہباز بیگ نے اپنے سب بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی

میرزا محمود بیگ بیٹوں میں تیسرے تھے، ان سے دو بڑے بھائی میرزا داؤد بیگ اور میرزا مسعود بیگ تھے۔ میرزا محمود بیگ ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ چونکہ وہ ۱۵ اپنے والد کے ساتھ رہے، اس لیے ان کی تعلیم انھیں شہروں میں ہوئی،

جہاں وہ مختلف اوقات میں تعینات رہے۔ چنانچہ انھوں نے دسویں درجے کا امتحان ۱۹۲۳ء میں مزنگ ہائی اسکول، لاہور سے پاس کیا، جہاں اس زمانے میں ان کے والد کاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس امتحان میں وہ پہلے درجے میں پاس ہوئے اور اپنے اسکول میں اول آئے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے لاہور کے فورین کرسمس کالج میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن سال بھر بعد والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا، لہذا یہاں اگر وہ انیکلو عربک کالج کے انٹر (سال دوم) میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس ادلا دلی اور یہاں سائنس کے مضمون کی پڑھائی کا انتظام نہ ہونے کے باعث فیل ہو گئے۔ یہ ناکامی تا زیادہ ثابت ہوئی، اس کے بعد انھوں نے خوب محنت کی اور ۱۹۲۷ء میں انٹر کا امتحان اس نتیجہ سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ اب انھوں نے دہلی کے پرانے کالج سائنسٹیفکس میں داخلہ لے لیا اور یہاں سے ۱۹۲۹ء میں بی، اے اور ۱۹۳۱ء میں ایم اے (فلاسفی) کی اسناد حاصل کیں، ان دونوں میں بھی پہلا درجہ حاصل کیا، اور یونیورسٹی بھر میں کامیاب طلبہ میں اول آئے۔

تعلیمی ریکارڈ اتنا اچھا رہنے کے بعد ملازمت ملنے میں کیا مشکل ہو سکتی تھی! کوئی سال سو سال حکومت سند کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جگہ نکلنے پر اپنے (انیکلو عربک) کالج ہی میں فلاسفی کے مدرس مقرر ہو گئے اور پندرہ برس یعنی ستمبر ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

تقسیم ملک کے بعد کالج کا نام بدل کر "دہلی کالج" رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بیگ صاحب اس کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے اور یوں سترہ برس، یعنی ستمبر ۱۹۶۴ء تک کالج کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی۔

دہلی کالج کو ان کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی، کیا بلحاظ نظم و نسق کے، اور کیا بلحاظ تعداد طلبہ اور نتائج کے، یہ دہلی یونیورسٹی کے ممتاز کالجوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کامیابی کا سہرا بجا طور پر بیگ صاحب کے سر تھا۔ وہ خود بھی اب ہر جگہ تعلیمی وسائل میں معتبر اور مؤثر خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ ہندوؤں دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے انتظامی اداروں کے رکن رہے۔ دلی کے باہر اجیر، بھوپال اور بھونیشور کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے بھی رکن تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند نے ایک تعلیمی وفد مصر بھیجا تھا۔ میرزا محمود بیگ اس وفد کے سربراہ تھے۔ مصر کے بعد یہ وفد مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک، سوڈان، عربیہ السعودیہ، اردن، لبنان، شام، عراق، ایران بھی گیا تھا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ ریاست جموں و کشمیر کے تعلیمی مشیر رہے؛ اور پھر جموں و کشمیر یونیورسٹی کے بہرہ کشمیر کے پردوائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۹۶۶-۱۹۶۸ء)۔ سب سے آخر میں وہ دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اسکول کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔

دلی کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا۔ بہت دن زیر علاج رہے اور بفضلہِ رب نکلے۔ اس کے بعد کچھ احتیاط تو کرتے رہے، لیکن ان کی زندگی کے معمولات میں بہت کم فرق آیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو عید الاضحیہ کفّی۔ اس دن صبح سے شام تک عید ملنے والوں کا ہجوم رہا۔ حسبِ معمول دوستوں کی آد بھگت اور خاطر مدارات میں مشغول رہے۔ یوں تمام دن آرام کا ایک لمحہ نہ نصیب ہوا۔ رات گئے جب بستر پر لیٹے ہیں، تو تکان کے مارے بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ اگلی صبح ۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ساڑھے سات بجے صبح کے قریب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ روح سوتے میں نفسِ عنقریب سے پرواز کر گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ جاذہ اگلے دن ۱۶ دسمبر کو اٹھا اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ساری عمر شادی نہیں کی؛ ملا والد فوت ہوئے۔ رہے نام اللہ کا۔

ان کے دوست غلام احمد علمی نے قطعہٴ تاریخِ وفات کہا:-

بیل دلی پرواز کرد از چمن	ہیچو بے گل و یاسمین دمن
گشت بادِ اجل شمعِ علم و ادب	کرد بے نور ہر محفل و انجمن
رفت یوسف ز کنگان بباغِ ارا	گشت دلی بہرِ شش چو بیت الحرن

زلیت محمود، محمود رفت از جاں برودانش بود و رحمت ذوالنہ
سال نوشت بگفت علمی نکتہ سخن
”اہل بیتش، نکتہ کار، شیریں سخن“

(۱۹۷۵)

شرذب دلی کی کوثر تینیم میں دھلی ہوئی زبان اور لب و لہجے پر جیسی قدرت نہیں حاصل
تھی، اور یہ تکلف احباب کی مجلس میں جس طرح وہ چمکتے تھے، وہ بیان کرنے کی نہیں
دیکھنے اور سننے کی چیز تھی۔ سچ مچ وہ کہیں اور بنا کرے کوئی، کاسماں بندہ جاتا تھا۔
انہوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس سے ادب اور تاریخ دونوں
کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ دلی کی پرانی تہذیب، یہاں کے رسم و رواج، رسم بہن
بہننا علم انہیں تھا، کاشکے وہ اسے محفوظ کر جاتے۔ وہ برسوں ان موضوعات پر
آل انڈیا ریڈیو سے چھوٹی چھوٹی تقریریں نشر کرتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تقریریں
سنی ہیں، وہی کچھ ان کا لطف جانتے ہیں۔ ان کی زبان کا لہجہ اور اُتار چڑھاؤ،
رد مزہ کی چاشنی، گھریلو اندازِ بیان، ہلکا سا مزاح کا رنگ۔ بھولنے کی چیز نہیں۔
ان کی ۱۲ تقریروں کا ایک بہت ہی مختصر مجموعہ ”بڑی حویلی“ کے عنوان سے چھپا
تھا (دلی ۱۹۶۹ء) جو صیغ معنوں میں بقا مت۔ کثیر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔
وفات کے بعد ۱۹۸۵ء کے سنگامے کے بارے میں ۱۳ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ”دلی
اٹھارہ سو ستادہن کی“ کے عنوان سے چھپا (دلی ۱۹۷۶ء)۔ یقیناً ابھی اور بہت سی
تقریریں ہونگی۔

نجم آفندی امیرزاجمل حسین

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی فصیح اپنے تہذیب کے چار نامی مرثیہ گو شعرا میں سے تھے۔ بقیہ تین تھے: خلیق اور ضمیر اور دلگیر۔

فصیح کے والد مرزا امجدی علی فیض آباد کے محلہ مغلیہ پورہ میں رہتے تھے۔ فصیح کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے: بلبل اور حبیب فصیح۔ ۱۸۷۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے آخر عمر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی۔

انھیں فصیح کے برادر خرد میرزا نجف علی بلبل اور بلبل کے بیٹے میرزا بلبل بھی شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میرزا بلبل کے بڑے بیٹے میرزا عاشق حسین مرحوم بزم آفندی ہوئے، جو اس سلسلہ الذہب کے لیے بھی باعث فخر تھے۔

بزم ۱۸۶۰ء میں کٹرہ حاجی حسن، آگرے میں پیدا ہوئے۔ شاعری گویا ان کی گھسی میں پڑی تھی، بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ جب نیک و بد کی تیز ہوئی، تو اپنے حقیقی ماموں سید اسماعیل حسین میز شکوہ آبادی (ارن: اگست ۱۸۸۰ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ میز خود فنِ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے، اور غزل میں ماسخ کے۔

بزم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا۔ لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ غزلیات کے سات دیوان تھے، لیکن ان میں سے صرف دو، چراغِ بزم اور دیارِ بزم، منصفہ شہر دہلی آئے۔ سیکڑوں مرثیے کچھ تھے، سلامِ قصائد و باغیات، ان کے

علاوہ، ربا عیات کا ایک مختصر انتخاب کسی زمانے میں دلی سے شائع ہوا تھا۔ بزم نے ایک "مولودِ معراج" خواجہ حسن نظامی (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کی فرمائش پر کہا اور ایک مختصر اجتماع میں درگاہِ حضرت نظام الدین ادلیا میں سنایا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اسی مجلس میں بزم کو "معراجِ اشعرا" کا خطاب عطا کر دیا۔ بزم کا ۲۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو ۹۳ برس کی عمر میں آگرے میں انتقال ہوا۔

میرزا تاج محل حسین نجم آفندی انھیں بزم آفندی کے بیٹے تھے۔ رمضان ۱۳۱۰ھ (مارچ/اپریل ۱۸۹۳ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ چندے مفید عام اسکول، آگرہ میں حاضری دی، اور یہاں سے ٹیڈل (آنکھیں) کی سڈلی جس سے انگریزی میں بھی کچھ شد بد ہو گئی تھی۔

جس ماحول میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس میں شعر گوئی لایڈ تھی۔ چنانچہ دس بارہ برس کے سن میں شعر کہتے لگے۔ مشورہ اپنے والد بزم آفندی سے رہا، اور ان کے سوا کسی سے اصلاح نہیں لی۔ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازمت لگئی، اور ۱۹۱۲ء میں دلی میں تعینات ہو گئے۔ یہاں سائل اور بخود اور امر ناتھ صاحب کی صحبت میں آئی۔ تینوں اہل زبان اور صاحبِ علم و فن بزرگ تھے، نجم نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور خود استاد کی درجہ حاصل کر لیا۔ دلی کے چند سالہ قیام کے بعد ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ یہاں نجم نے ایک مجلس "انجمنِ شبابِ سخن" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن نے ان اطراف میں اردو کی اچھی خدمت سرانجام دی، اس کے زیرِ اہتمام ہر مہینے شاعر ہوتا رہا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان دنوں عروج پر تھی۔ ہر سال اس کے سالانہ اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوتے اور صفی بکھنوی مرحوم (ف: جون ۱۹۵۰ء) ان میں اپنی تاریخی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ء کا اجلاس (۱۵-۱۷ اکتوبر) الہ آباد میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت سر جیل سید ابو جعفر (راجا چند راول) نے کی تھی۔ اس جلسے میں

بخم آفندی نے اپنی نظم ”درِ یتیم“ پڑھی۔ نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھوایا گیا۔ نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انھیں گود میں اٹھالیا۔ حضرت عربز لکھنوی اور محشر لکھنوی نے جو جلسے میں موجود تھے، انھیں ایک ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا؛ ایک طالب علم سید صابر حسین نے اپنی طرف سے بخم آفندی کو ایک گھڑی پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ غرض بہت جوش و خروش تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نظم نیلام کی جائے۔ مختلف اجابے بولی دی اور آخری بولی (۱۸۰۰ روپے) صاحب صدر راجا سید ابو جعفر پر ختم ہوئی۔ بعد کو چونکہ یہ روپیہ داخل یتیم خانہ کرنے کی رائے ہوئی لہذا حسب تجویز جناب صدر قرار پایا کہ ہر شخص جو بولی بولا ہے، وہ اپنا روپیہ ضرور داخل کرے۔ اس طرح سے اس نظم کی قیمت (۵۶۵۰) روپیہ وصول ہوئی، جو یتیم خانہ (قائم شدہ ۱۹۱۲ء) کو دے دی گئی۔ (یہ نظم بخم آفندی کے پہلے مجموعہ کلام پھولوں کا بار میں شامل ہے)

یہ ملک میں سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں سے ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ بخم آفندی شروع سے انگریز دشمن اور وطن دوست رہے تھے۔ دفتر میں ان کا امنرا ایک انگریز بیٹوں تھا۔ ایک دن وہ ان کی کھڑپوشی پر معترض ہوا۔ بخم نے دو بد جواب دیے تو بطور سزا ان کا تبادلہ آسنسول کر دیا گیا۔ اسی زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے :

جینا ہے حصارِ بحر و شام میں اے بخم !
بنگالے میں گھر ہو کہ دہلی میں بس ہو

بعد کو جب سرکاری ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اٹھا، تو انھوں نے بھی ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ردولی چلے گئے۔ یہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ ریشہ جعفر تھری کرزم ردولی، مشہور شاعر اور مرثیہ گو، اسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے (ردولی سے وہ آگے آگئے، یہاں وقت بہت پریشانی میں گزر رہا۔ کسب معاش کے لیے انھوں نے ہر طرح کے پاڑے لیے۔ ایک مہنامہ ”مشورہ جاری کیا، تجارتی“

زراعت بھی کی۔ لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھتا بڑا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے
 دکن کی راہ لی، اور حیدر آباد میں سخت سفر کھول دیا۔ بارے، نصیبیا اور تقا۔ نظام
 ساج میر عثمان علی خان مرحوم کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ معظم جاہ شجاع کے دربار سے
 وابستہ ہو گئے، اور منجملہ اور اصحاب کے وہاں سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد
 ہرزہ گردی ختم ہو گئی۔ حیدر آباد میں ۳ برس قیام رہا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے چھوٹے
 بھائی سلیمان میرزا کو کب آفندی سے ملنے کراچی چلے گئے۔ جب واپسی کا عزم کیا
 تو عزیز واقارب اور عقیدتمند احباب نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کیجیے، حیدر آباد
 جا کے کیا کیجیے گا۔ دراصل وہاں کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔ وہیں انوار ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء
 (۱۷ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ) بوقت ساڑھے نو بجے صبح انتقال ہوا۔ اسی دن قبرستان سخی حسن دربار
 (نادر تھو ناظم آباد) میں دفن ہوئے۔

بخم آفندی نے بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے؛ ۲۵-۲۶ مطبوعہ کتابیں موجود
 ہیں، اور جو غیر مطبوعہ رہ گیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا، انھیں میں غزلیات کا دیوان
 بھی ہے۔ ان کے دو مرثیے "معراج فکر اور فتح مہیں" بڑے معرکے کے ہیں؛ ان میں
 انھوں نے ہلکے پہلو سے زیادہ فلسفہ و شہادت اور حضرت امام حسین اور ان کے رفقا
 عالی مقام کے کردار کی عظمت اور ان کے پیغام پر زور دیا ہے۔ ان کے سلام بھی بہت
 بلند پایہ ہیں۔ یہی حال رباعیات (تہذیبِ بوڈت) کا ہے، جن میں ان کے حکیمانہ اور
 منظرانہ اور فلسفیانہ انداز کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ذیل میں چند شعراں کی غزلوں
 کے ملاحظہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بخم کا اصلی میدان مرثیہ، رباعی اور سلام ہے۔ انھوں
 نے ہندی میں بھی کہا ہے۔ غزل میں شاید انھیں بورخ ادب کوئی مقام نہ دے سکے۔

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفرد شوں کا	اجل کے سایے میں کیا زندگی نکھر آئی
غدا ہو گئی راہِ ثواب، ارے توبہ!	ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی
کسے اب اعتبار گردشِ ایام آتا ہے	تھوڑے بعد دیکھیں کس کے بت تک جام آتا ہے
گذرتی ہے حیات، اک جادہ مرگِ مسلسل سے	جڑی مشکل سے اربابِ دنیا میں نام آتا ہے

بدل دیتی ہے دنیا، مختلف مفہوم یعنی میں

جب آتا ہے ادھر سے، ایک ہی پیغام آتا ہے

یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی

جو دل میں کوئی تنہا بری بھلی نہ رہی

حقیقتوں کی کسی دقت بھی کمی نہ رہی

تصورِ فکر و نظر ہے، جو تشنگی نہ رہی

پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردہ

مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی

دو گھڑی، عیشِ مصلّا چھوڑ دے اکٹھ کوئی ٹوٹا ہوا دل جوڑ دے

تا کجا محراب و منبر کی پناہ دستِ باطل، حق کا دامن چھوڑ دے

یوں نہ جی، اُدنا شناسِ زندگی! گو دیں انسانیت دم توڑ دے

موت برحق ہے، تو بن جا حق پرست موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دے

نجم! کچھ لفظی تکلف چاہیے بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری بہار تھی، پھولوں میں آشیانا تھا

میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فسانا تھا

ملاں کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست ہی

مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

سادہ دنیا اک فریبِ جلوہ جانا ہے

یہ حم ہے دور سے، نزدیک سے تنہا نہ ہے

وقت کا میری طرح، ان کو بھی شکوہ ہے، مگر

میرے شکوہ کا ذرا اندازِ بیباکانہ ہے

پرستشِ احوال پر جُزِ شکر کچھ کہتے نہیں

بودیے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

کہونگا کچھ نہ قلب دوستاں کی یہ منزل ہے حساب دوستاں کی
 چین کی آبرو محفوظ رہتی نادیتے جو دولت آسماں کی
 میکرے ہیں مرے ساتھی تھے، ہمدرد بھی تھے
 جب مسجد میں ٹھکانا ہے، اکیلا ہوں میں

ہر جا رہ و منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
 معبد کی فضا اور ہے، مقتل کی فضا اور
 اللہ گلا کر کے میں پھٹتا یا ہوں کیا کیا
 جب ختم ہوئی بات کہیں، اس نے کہا: اور

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری

ان کا خاندان یوپی کے مردم خیز مقام دریا بادی (ضلع بارہ بنکی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد جناب الحاج محمد یوسف قادری ہجرت کر کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے۔ محمد یوسف قادری مرحوم، مولانا عبدالماجد دریا بادی (ف: جنوری ۱۹۷۷ء) کی سگی پھوپھی (محبوبین) کے بیٹے تھے، ان کے والد کا نام فضل رب تھا۔ اس طرح گویا رشتے میں طالب رزاقی مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بھتیجے تھے۔

الحاج محمد یوسف قادری صدیقی منش بزرگ تھے۔ اردو، فارسی کا اچھا ذوق تھا۔ حیدر آباد میں انھوں نے اولاً حکومت وقت کے محکمہ مالی میں ملازمت اختیار کی۔ بعد کو راجہ شیو راج بہادر کی جاگیر کے انتظامیہ میں اچھے خاصے ذمہ دار عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ان کا اس صدی کے پانچویں دہے میں انتقال ہوا ہے۔ مدد گاہ حضرت شاہ خاموش (حیدر آباد) کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہیں، خود بھی کچھ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر لیا تھا۔

طالب رزاقی یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ انیسویں کی تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ سنو زبان اسکول کے درجوں میں تھے کہ خدا معلوم کیوں وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا، اپنے نجی مطالعے سے، ادبیوں خاصہ استعداد پیدا کر لی تھی۔

شاعری کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ ان کے بزرگوں میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہوئے ہیں، جن کا مزار بالنسہ شریف (ضلع بادہ بنکی) میں موجود ہے اسی سے اپنے نام کے ساتھ "ذاتی" لائقہ کا اضافہ کیا۔ ابتدا میں فانی بدایونی (ف: اگست ۱۹۴۱ء) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ برس تک حضرت حیرت بدایونی (ف: فروری ۱۹۵۷ء) سے کلام پر اصلاح لیتے رہے آخر میں استاد نے فارغ التحصیل قرار دے دیا، اس کے بعد خود ان کے تلامذہ کا حلقہ خاص وسیع ہو گیا تھا۔ اسوس، کہ ان کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

طالب کی پوری زندگی پریشان حالی میں گزری۔ حیدر آبادی میں مختلف جگہ ملازمت کا ڈول بنا، لیکن کہیں مستقل انتظام نہ ہو سکا۔ چندے عثمانیہ یونیورسٹی کے کتابخانے میں بھی ملازم رہے۔ طبیعت کے بہت حساس تھے اور حالات سے سمجھوتا کرنا گویا جانتے ہی نہیں تھے۔ ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ ان کی شادی حیدر آباد کے ایک خاندان مشائخ میں جناب سید مومن علی کی صاحبزادی (افضل بیگم) سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ سات بچے ہوئے، چار لڑکے اور تین لڑکیاں، انھیں پریشانیوں کے باعث کسی جگہ جم کر کام نہ کر سکے۔ تجارت تک کا تجربہ کیا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ ان کے کھلام میں حزن اور سوز کا سرچشمہ بھی ان کی مادی بے اطمینان صورت حال میں دکھایا جاسکتا ہے۔

موت: ذی رض کینسر سے ہوئی۔ اس کی تشخیص اس وقت ہوئی، جب معاملہ ہسپتال سے نکل چکا تھا۔ مقامی کینسر اسپتال میں زیر علاج رہے، لیکن بیسود۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دوپہر کے وقت اپنے مکان (دبیر پورہ) میں داعی اجل کو لبیک کہی۔ تدفین اگلے دن (۱۶ جنوری ۱۹۷۶ء) عمل میں آئی اور انھیں بعد نماز عصر یا قوت بخشہ فیض کی کان ایٹھ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ خود شید جنیدی کا قطعہ ہے :
 ہے، کیا لٹ گئی بہارِ غزل سب کی آنکھیں ہیں سو گوارِ غزل
 لوگ منہ دیکھتے رہے، خورشید! "چل بسا شاعر نگارِ غزل"
 (۶۱۹۷۵)

ایک قطعے میں عیسوی اور ہجری تاریخ جناب قادری الملتانی نے کہی۔ ہر ایک
 مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے :

اٹھ گئے دنیا سے طالب فکرِ دل تشنہ کام

ہاں اُٹھائی ہو چکا، کیفیتِ حیرت کا جام (۱۹۷۵)

(۱۳۹۵)

پاک عالمِ قطبِ رزاقی کی ہے تاریخ وصل

جنت الفردوس رحماں اب ہے طالبِ کارنام (۱۹۷۵)

۱۳۹۵

ذیل میں کلام کا مختصر انتخاب بطور نمونہ دے رہا ہوں، جو ان کی بیگم کی مرسلہ غزلوں
 سے کیا گیا ہے :

عاشقی ہے منزلِ شکر و شکایتِ بلند دوست کام آیا تو کیا، دشمنِ کام آیا تو کیا

ٹھہرا رہا، تو فکرِ رہِ پیچ و خمِ رسی جب چل پڑا، تو راستہ مشکل نہیں ہا

یہ صبح وصل، یہ تم بقیاب و دلف بدوش کبھی تمہیں، کبھی حسنِ سحر کو دیکھتے ہیں

بہارِ آئی ہے گلشن میں جسے اے طالب! کبھی قفس کو، کبھی بالِ دیر کو دیکھتے ہیں

نشاطِ گل نہ سہی، خارِ غم اثر ہی سہی چمن میں کوئی تو اپنا مزا جاں ہوتا

مالِ گل تر سے واقف اگر ہو کلی سے تبسم کیا جائے نا

نہیں عشقِ معصوم، ہر اک کے بس کا یہ ہر آدمی سے کیا جائے نا

یہ دل ہے، ہر اک کو دیا جائے نا جسے دے دیا، پھر لیا جائے نا

بغیر اذنِ رسانی، پیا جائے نا گنہ بیتکلف کیا جائے نا

وہ میکش ہوں، نیتِ بسود و ریسود ہے پیالا پیالا پیا جائے نا

محبت میں ہے فرض، مرمر کے جینا وہ مر جائے، جس سے جیا جائے نا
 جو پوچھا ہے وہ خود بخود پورا ہوا ہے جیسے جا رہے ہیں، جیا جائے نا
 وہ دل اک نظر کے عوض دے دیا ہے جو دو جگ کے بدلے دیا جائے نا
 یہ کہتی ہے، طالب! مرے دل کی دھڑکن
 ترانہ نام مجھ سے لیا جائے نا

دل طالبِ غم ہو کہ نظر طالبِ جلوہ مفہوم طلب، عشق میں دریاؤں کا گری ہے
 ناراض جہاں، بختِ خفا، آپ بھی ناخوش سالنوں کا تسلسل، کوئی جینا تو نہیں ہے
 ترا غم جان کے، ہر غم کو دیا دل کا ابو میں محبت ہوں، مجھے دادِ وفا دی جائے
 نہ پوچھو جلوہ باطل میں ہے کتنی کشش، طالب! حقیقت اتنی مبہم ہے کہ پہچانی نہیں جاتی
 وہ ایک یاس کہ جس سے ڈرا ہے ہو مجھے وہ ایک یاس بھی یاس آگئی، تو کیا ہوگا!
 زہرِ درد و غم سے ہم کپ کے مر گئے ہوتے وہ تو آبرور کھل اعتبارِ فردانے
 میکدہ ہے یہ، طالب! کھل کے گفتگو کیے اجنبی نہیں کوئی، سب ہیں جانے پہچانے
 کیسی بہار، کیسی خزاں، کیا غم و نشاط ان رے فریب، زندگی مستعار کا
 میں اختیارِ پاک بھی، بے اختیار ہوں کتنا حینِ حیر ہے پروردگار کا
 تم بے نیازِ درد ہو، دل آشنائے در تم اختیار کے ہو، نہ دل اختیار کا
 جذبہ چاہہ گری ہے، نہ مروت نہ خلوص پرکشش حالِ دلِ زار سے ہوتا کیا ہے!

جو دردِ وفا سے عادی ہو، احساس کی دولت جس میں ہو
 اس دل کو کسے کیا دل کوئی، وہ آدمی انساں کیا ہوگا!
 دل میں تپش، جگر میں خلش، آنکھ میں سریش یہ نعمتیں ملی ہیں مجھے، زندگی کے ساتھ
 جب اس جہاں میں رخِ خوشی کو نہیں قیام یہ زندگی گزاردے، زندہ دلی کے ساتھ

اشاریہ

۱۔ اشخاص

کسی ہندسے کے نیچے خطابیہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحے پر وہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

۱۱۹	: احمد شجاع (حکیم)	۲۰۹	: ابرہہ سلطان حسن
۷۴	: احمد عباس، خواجه	۶۹	: ابراہیم علی صدیقی
۲۲۰	: احمد علی (پروفیسر)	۳۵۰	: ابو جعفر، سید (راجا پنڈرادل)
۶۵ (۶۴)	: احمد علی شاہ عباسی	۳۵۱	
۲۷۰، ۲۶۹	: اختر حسین (حکیم)	۱۲۱	: ابوالکلام آزاد، دیکھیے آزاد، مولانا
۲۷۷، ۹۹	: اختر شیرانی	۹۵ (۹۴)	: اثر، صدیق احمد
۳۳۲	: اختر مسعود (ڈاکٹر)	۲۹۲	: اثر لکھنوی، جعفر علی خان
۳۳۲	: احمد بانو	۲۶۶	: اثر رامپوری جعفر علی خان (پرس)
۳۴۴	: اسحاق بیگ، میرزا	۲۰۹، ۲۰۷	: اثر، محمد حسن (قاضی)
۲۹۲	: اسرار البصری	۲۳۶، ۲۳۵	: احتشام حسین (پروفیسر)
۲۷۱	: اسلم (پیر حامد)	۲۹۲	: احسان دانش
۵۳، ۵۴	: اظہر، احمد الدین (اے، ڈی)	۱۷۶	: احمد (آتا)
۵۵، ۵۴		۷۴، ۷۳	: احمد (ڈبلیو ڈیڈ)
۱۴۹	: اظہر علی	۲۳۶	: احمد، احمد علی
۳۳۲	: اظہر مسعود	۲۱۰	: احمد جلیس
۲۱۹، ۲۱۸	: اعجاز حسین، سید		: احمد شاہ بخاری: دیکھیے پطرس، احمد شاہ

اعجاز حسین فرشتوی :	۲۰۹	ابجد بیگ ، میرزا :	۲۴۴
اعظم (پیر حامد) :	۲۷۱	ابجد ، مجید ، مجید :	۱۱۲ ، ۱۱۱ ، ۱۱۰
اعظم ، اعظم حسین :	۲۳۶ ، ۲۳۳	ابجد نجفی ، محمد ، مجید :	۳۱ ، ۳۰
اعظم جاہ (پیش) :	۱۸۲	امرننگ (شیرنجاہ) :	۱۹۱
افتخار الدین ، میاں :	۲۹۲ ، ۱۳۶	امیر بخش :	۲۸۷
افسر حامد اللہ :	۸۴ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰	ایر خان :	۲۴۰
افسر صدیقی امر دہوی :	۲۲۷	ایر بیانی :	۲۰۹ ، ۹۴
افضل بیگ مرزا :	۳۴۴	امین الرشید :	۶۴
افضل حسین شایستہ ، دیکھیے شایستہ لکھنوی		انجیلینی ، مسٹر ، :	۲۸۱
افضل محمد :	۲۱۰	انور ، منور سہیل :	۴۵ ، ۴۷ ، ۴۹ ، ۵۰
اقبال ، :	۱۷۹ ، ۱۸۲ ، ۳۴ ، ۳۱	انور ، یار محمد انصاری :	۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۴
	۱۸۰ ، ۱۸۳	انور کمال پاشا :	۱۲۹
اکبر الہ آبادی :	۳۰۴	انور مسعود ، :	۳۳۲
اکبر بادشاہ :	۲۵	انیس امام :	۲۳
اکبر حیدری (سر) :	۱۸۲	انیس بانو :	۳۳۲
اکرم (پیر حامد) :	۲۷۱	انیس جہان :	۱۴۹
اکمل ، رام پرتاپ :	۱۲۰	اوپندر ناتھ :	۷۱
الطاف حسین :	۱۰۵	اورنگ زیب :	۲۰۷
امام احمد ، شاہ :	۱۶۹	ادگر سین :	۱۹۶
امان اللہ ، ملا :	۶۹	ادگلوئی ، مسٹر :	۱۹۷
امانت لکھنوی :	۳۳۰ ، ۳۲۵	ادلاد حسین :	۱۰۴
امتیاز بی بی :	۲۴۰	ادزکاد سنگھ :	۲۰۱
امتیاز علی تاج ، دیکھیے تاج ، امتیاز علی		افس احمد :	۱۰۰

- ایش چنار : ۲۹۸
 آتش لکھنوی : ۲۱۸
 آد بڑی ، پردنیر : ۷۹
 آرزو لکھنوی ، انور حسین : ۲۲، ۲۴
 آرزو ، ابوالکلام ، مولانا : ۲۰، ۱۹۸
 آرزو ، چراغ علی شاہ : ۲۲۸
 آرزو سبحانی : ۳۰۴
 آرزو ، محمد حسین : ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۴۹
 آزرده ، محمد صدر الدین : ۸۷
 آغا جون : ۲۶۵
 آغا حشر کاشمیری : ۳۱
 آغا شاعر قزلباش : ۲۹۸
 آفتاب احمد خان (صاحبزادہ) : ۶۷
 آفتاب ، منے آغا لکھنوی : ۲۹۴
 آنند بہاری لال گیتا : ۲۵
 آنند زاین ملا ، دیکھے ملا آنند زاین
 آریزے ، لورین : ۲۸۲
 ب
 باقر عظیم آبادی : ۱۶، ۱۷
 باقر اختر (سلمان) : ۲۳۶
 بختش علی : ۱۵۸
 بدر الدین : ۲۶۱
 بدر النساء بیگم : ۳۳۹
 بدری پرشاد سھوڑے : ۴۸
 برج رانی : ۲۵
 برج موہن لال : ۵۰
 برج جیس بافو : ۳۳۲
 برج جیس فاطمہ : ۶۶
 برق دہلوی ، جہاد جہاد : ۲۹۸
 برکت علی خان (کریم جاہ) : ۹۵
 بزرگدارانی : ۴۸
 برین ، مسٹر : ۲۷۸
 بزم آفندی ، عاشق حسین : ۳۲۹
 بسل الہ آبادی ، سکھ دیو پرشاد سنہا : ۳۰۹
 بشارت علی جانب دہلوی : دیکھے جانب
 دہلوی
 بشن مرادی لال : ۲۹۹
 بشیر احمد ، بیان : ۲۲۷
 بشیر پرشاد سنہا : ۳۰۹، ۳۱۰
 بلقیس : ۸۴

- بلخ لکھنوی، نجف علی : ۳۲۹
 بہار، شید جعفر حسین : ۲۹۵، ۲۹۴
 بہتراد لکھنوی، سردار احمد خان : ۱۲۴
 پنجو دہلوی، محمد احمد : ۳۳۰
 پنجو دہلوی، وحید الدین : ۳۵۰
 بیدم شاہ دارثی : ۱۰۵
 بلی، شامس گرام : ۷۹، ۷۷، ۷۸
 بھگت رام، پنڈت : ۲۰
 بھگوان سردپ : ۴۷
 بھوان سنگھ (چارانا) : ۳۷، ۳۸
 بھیم سین : ۱۲۱
- پ
- پال زلر : ۷۴
 پراگ داس : ۴۵
 پروردہ چندر : ۲۹۰
 پریشان، عبدالحمد : ۱۵۰
 پطرس بخاری، احمد شاہ : ۱۸۴، ۷۲
 ۲۸۱، ۲۷۹
 پکراج (عرف کھو) : ۱۰۴
 پنڈی داس : ۲۹۰
- ت
- تاج اتیاز علی : ۱۷۵، ۷۸
 تاجور نجیب آبادی، احسن اللہ خان : ۲۷۵، ۲۷۴
 ۲۷۸، ۱۷۳
 تاجل جلاپوری، تاجل حسین : ۱۷۳
 ترکی، غلام محمد : ۳۳۸
 تسکین : ۲۹۶
 تسنیم، محمد حبیب اللہ : ۳۱
 تمیزین : ۲۸۰
 تمکین : ۲۷۱
 تمکین سرمست، محمد قادر الدین : ۲۳۷
 تمنا عمادی : ۱۶، ۱۵
 تیجا سنگھ : ۱۹۳
 تیمور، امیر : ۶۴
- ط
- طامس گرام بلی، دیکھے بلی، شامس گرام
 پیگور، رابندر ناتھ : ۸۰، ۹۰
 مینی سن : ۳۲۷
 ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ : ۱۲۲، ۱۲۱
- ث
- ثابِت لکھنوی، افضل حسین : ۲۸۱، ۲۷۷
 ثاقب، احسن اللہ خان : ۲۱۴، ۲۱۶
 ۲۱۵
 ثاقب، سید حسن رضا : ۱۵
- تاشیر، محمد دین (ڈاکٹر) : ۱۷۹، ۱۷۸
 ۲۷۷، ۲۸۴

ج

نثر چھروی، عبدالحفیظ صدیقی: ۱۵۸

نثر فاطمہ (غوثیہ): ۱۴۰

ج

جالب دہلوی، بشارت علی: ۱۹۱، ۱۹۲

۳۰۴

جادید اقبال: ۱۶۰

جعفر حسن بہار: دیکھیے بہار، جعفر حسن

حاکم مراد آبادی: ۸۸

گلناتھ پرشاد سٹھوے: ۴۸

خلیل مانچھوری: ۹۲، ۹۵

جلیل، علی احمد: ۹۶

جمالی، طفیل احمد: ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹

جمعیت رائے: ۲۶۱

جمیل میاں (پیر حمید احمد خان): ۸۲

جمیل منظری: ۳۳

جمیل حسین: ۳۰۶

جمیلہ حامدۃ النساء بیگم: ۳۳۹

جوان، منی لال: ۲۲

جوش ملیح آبادی: ۶۰، ۶۱

جوش ملیح آبادی: ۲۳۶

جیلانی بانو: ۲۱۰

جیلانی بیگم: ۳۳۷

جیس، مٹر: ۸۹

چاندرا نی: ۵۰

چغتائی، عبدالرحمن: دیکھیے عبدالرحمن

چغتائی

چکبست: ۳۰۴

چھب لال: ۲۵

ح

حالی: ۵، ۶۵، ۶۷، ۸۲

حامد (استاد): ۱۷۶

حامد الہ آبادی، حامد حسین: ۲۶۹

حامد، حامد علی: ۱۳۹

حامد حسین: ۳۰۶

حامد علی خان: ۱۳۴

حبیب (پیر حسان): ۱۲۷

حبیب حسن: ۱۲۸

حبیب الرحمان خان شردانی: ۶۷

حسام الدین: ۳۱۳

حسام الدین قاضی: ۱۱۸، ۱۱۹

حسام الدین حیدر: ۲۳۳

حسرت، چراغ حسن حیدر: ۱۰۰، ۱۳۶

حسن جان بیگم: ۳۳۲

حسن نظامی (خواجہ): ۱۹۵، ۲۰۲

۳۵۰

حسنات احمد شاہ :	۱۶۶	دستگیر الدین خان :	۳۳۷
حسین اختر (مراد) :	۲۳۶	دلاور حسین :	۳۱۳
حشر کاشمیری :	دیکھیے آغا حشر کاشمیری	دگیر درمئیہ گو :	۲۴۹
حکیم علی :	۱۴۸	دیش بندھو گیتا :	۴۹۸
حمید احمد خان :	۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۶	دیوان سنگھ مفتون :	۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷
حمید نظامی :	۱۷۵	دیوان سنگھ مفتون :	۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷
خود خان :	۲۴۰	دیوان سنگھ مفتون :	۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱
حیات اللہ انصاری :	۲۸۲	دیوان سنگھ مفتون :	۱۳۲
حیدر علی :	۱۴۹	دھپت داے :	۳۱۸
حیرت بدایونی، تید حسن :	۲۰۸، ۲۰۷	دھپت داے :	۳۱۸
حقی، ریوتی سہاے :	۲۷	دھپت داے :	۳۱۸
خ			
خضر تبسمی، مولا بخش :	۱۰۰، ۹۹	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
خلیق، میر :	۳۴۹	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
خلیل احمد :	۱۷۱	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
خلیل احمد خان :	۸۲	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
خورشید مجیدی :	۲۵۷	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
خورشید :	۲۸۹	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
د			
داداب بیگ، میرزا :	۳۴۵، ۳۴۴	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
داغ :	۳۱۰، ۲۹۸، ۲۹۷، ۲۹۶، ۲۹۵	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
داد بیگ، میرزا :	۳۴۵	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸
دردانہ (شہزادی) :	۱۸۲	دارنگ، مالک (سر) :	۲۷۸

- رام سروپ درام درما : ۴۷
 رچودمن سنگھ (بھاراجا) : ۱۹۷، ۱۹۸
 رحیم بخش : ۱۷۶
 رخشان، عزیز الدین : ۱۱۷، ۱۱۸
 رزم دودوی، جعفر مہدی : ۳۵۱
 رسا، محمد علی : ۲۳۶
 رشید، پیارے صاحب : ۳۰۴
 رشید احمد صدیقی : ۱۲۵، ۲۹۲
 رضا، امام : ۲۲۵
 رضا آبادی، رضا علی خان : ۲۰
 رعد، حب لال : ۴۷
 رفیع احمد قدوائی : ۲۳۶
 رفیع الدین، قاضی : ۱۱۷
 رفیق لکھنوی، رفیق حسین : ۳۳۳
 رکن الدین عباسی : ۶۴
 رگھو بیر نندن : ۴۱
 رگھو نندن سرن : ۱۲۳، ۱۲۴
 رنجیت سنگھ (بھاراجا) : ۱۷۹
 رنگی لال : ۵۰
 رنگین، سعادت یار خان : ۳۲۷
 روشن نکودری، روشن لال : ۶۰
 روشن پانی پتی، شگن چندر : ۲۹۹
 روشن صدیقی : ۲۷۷
 رئیس امر دہلوی : ۲۹۱
 ریاض، ریاض احمد : ۲۸
 ریاض انصاری، ریاض الدین : ۱۱۷
 ریڈنگ، لارڈ : ۱۹۷
 ریحانہ (بنت حسان) : ۱۲۷
 زبر لکھنوی، ننھے آغا : ۲۹۴
 زکی حسین : ۲۳۶
 زیب النساء (بیکم نجفی) : ۳۴
 زین العابدین احمد (زینلے) : ۲۲۰
 زینت (بنت نجفی) : ۳۴
 سادول : ۶۰
 ساحر دہلوی، امر ناتھ دھان : ۳۵۰
 ساغر نظامی : ۴۲
 ساگر نکودری، بلونت کمار : ۶۰
 سالک لکھنوی، محمد حسن : ۲۶۶
 سالک رام درام درام صاحب : ۲۹۷
 ساغر صدیقی، محمد اختر : ۱۱۲۸، ۱۱۲۹
 سائل دہلوی، سراج الدین احمد خان : ۲۰
 سبط حسن فاطر (شید) : ۲۶۵، ۲۶۶
 سارو، ۱۳۲

سبط رسول، فاروقی :	۶۹	سید علی :	۲۲۵
سجاد ظہیر، سید :	۲۲۰	سید مسعود حسن رضوی :	۱۳۲۴، ۲۰۶
سحر، عبد المجید :	۳۸	۳۲۲، ۳۲۷، ۳۲۴، ۳۲۵	
سحر، محمد حسین قاضی :	۲۰۹	سید سلیمان ندوی :	۱۶۷، ۱۲۵، ۹۵
سر دول سنگھ کوٹشیر :	۱۹۶	سیدہ بیگم :	۳۲۲
سر لادیوی :	۷۱	سیردین، ولیم :	۲۸۲
سروجن دیوی :	۱۹۷	سیماب اکبر آبادی، عاشق حسین :	۲۸۱
سرور، رجب علی بیگ :	۳۲۹	۲۶۲، ۱۶۰، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۴، ۱۰۳	
سری رام (لالہ) :	۲۹۴	ش	
سعید احمد خان :	۸۲	شاد عظیم آبادی، علی محمد :	۱۵
سعید کامٹوی :	۱۶۳	شانتی (بنت قاصر) :	۳۱۸
سعید حسین :	۳۰۶	شاہد احمد دہلوی :	۷۳
سعید رضا گہر، دیکھے گہر، سعید رضا :		شاہدہ (بنت نجی) :	۳۴
سعیدہ (بنت نجی) :	۳۴	شاہین (بنت راشد) :	۲۸۰
سکندر لودھی :	۶۲	شائق، نرگس سہاے :	۷۴۷
سکندر حیات خان (سر) :	۴۹	شبلی :	۶۷، ۶۷
سلطان محی الدین :	۲۲۷	شجاع الدولہ :	۲۹۴
سلیم پانی پتی، سعید الدین :	۳۰۴	شجاع، معظم جاہ (پرنس) :	۲۵۲
سیکمان خان :	۲۷۸	شرر، عبدالحلیم، ۶۶، ۶۷، ۶۸	
سنگیت (بنت طالب) :	۲۹۹	شرف الدین شاہ :	۱۶۶
سورج پرشاد سٹھوے :	۴۸	شعبہ (پیر خان) :	۱۲۷
سید حسین فوق :	۲۲، ۲۱۸	شفق عابدی، سید حسین رضوی :	۴۹
سید عابد حسین :	۱۲۵، ۱۲۲	شفقت کاظمی، فضل الحسن :	۲۲۸، ۲۲۶، ۲۲۵
		شفقت اللہ :	۸۴

- شفیق الرحمان قدوائی : ۱۲۳
 شکیلا (بنت قاصر) : ۳۱۸
 شکیب (پیر حسان) : ۱۲۷
 شکله بیگم : ۶۹
 شکله خاتون : ۲۰۹
 شمس مینری، شمس الدین احمد : ۱۳۱
 شمس الدین : ۲۱۲، ۲۱۳
 شمس الدین (میر شمس) : ۶۲
 شمس الرحمن فاروقی : ۲۷۱
 شمیم کرمانی، شمس الدین حیدر : ۲۳۳
 شمس الدین (نشی) : ۳۱۲
 شهاب الدین (چودھری سر) : ۲۹
 شہباز بیگ، پیرزا : ۲۲۵، ۳۲۳
 شہریار (پیرداش) : ۲۸۱، ۲۸۰
 شودش کاشمیری، عبدالکریم : ۲۸۷
 شوق قدوائی، احمد علی : ۳۰۵
 شوق، عبدالصمد : ۲۸
 شوکت میرٹھی، احمد حسن : ۳۱۶
 شوکت تھانوی، محمد عمر : ۷۳
 شوکت حسین رضوی : ۲۳۲
 شیخ امیر : ۱۶۲
 شیدا اٹاوی : ۱۰۴
 شیدا، رام چھپال سنگھ : ۱۹۱
 شیر سنگھ فیروز پوری : ۱۹۰
 شیر شاہ سوری : ۴۱
 شیر محمد اختر : ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵
 شیل، والٹر (مٹر) : ۱۸۱
 شیلا انجیلیسی : ۲۸۰، ۲۸۱
 شیورانج بہادر (راجا) : ۳۵۵
 شیوشنکر لال : ۳۱۰
 صابر حسین : ۳۵۱
 صادق ایوبی، حاجی محمد : ۲۲۷
 صبغتہ اللہ شہید انصاری : ۳۳۳
 صدر الدین چغتہ : ۱۷۶
 صدیقی حسن خان (گلاب) : ۳۰۳
 صدیق علی شاہ : ۳۳۹
 صغیر النسا : ۶۵
 صفدر علی : ۱۴۹
 صفی بھنوی، علی نقی : ۲۵۰، ۲۹۲
 صفی اللہ : ۱۶۲
 صفیہ (بنت حسان) : ۱۲۷

ض

ضامن، ضامن علی (پردیس) ۲۰۴

ضمیر (مرثیہ گو) : ۳۴۹

ضمیر الدین منیری : ۲۱۳، ۲۱۳

ضیا امروہوی : ۴۶

ضیا، عظمت علی :

ط

طالب دہلوی، شیش چندر : ۲۹۷

۲۹۸ ، ۲۹۹

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن :

۳۵۵

ظ

ظالم سنگھ (رانانا) : ۳۷

ظفر علی خان : ۷۶، ۲۸۸، ۲۸۹

۲۹۱ ، ۲۹۲

ظفر مہدی : ۲۶۶

ع

عابد اختر (عماد) : ۳۳۶

عابد، عابد علی : ۲۷۷

عادف بکھنوی، علی محمد : ۳۰۴

عادف الرحمن چغتائی : ۱۸۶

عالمگیر درنگ زیب : ۲۷۷

عباس (ملا) : ۶۴

عبدالباری (عبادی) ندوی : ۷۸

عبد الجلیل : ۱۵۹

عبدالحق (دشتی) : ۱۶۶

عبدالحق (مولوی) : ۳۰۴، ۳۰۵

عبدالحکیم : ۱۵۸

عبدالحق نہال : دیکھیے نہال سیوہادی

عبدالرحمن (سر) : ۱۸۳

عبدالرحمن چغتائی : ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸

۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۲۷۷

عبدالرحمان نگرانی : ۱۶۷

عبدالرحیم چغتائی : ۱۷۶، ۱۸۱

عبدالرزاق (شاہ) ۳۵۶

عبدالغفور خان : ۳۶۱

عبدالقادر : ۳۳۷

عبداللطیف (منشی) : ۳۷

عبدالماجد : ۱۵۸

عبدالماجد : ۲۷۷

عبدالمجید خواجہ : ۱۲۴

عبدالماجد دریابادی : ۳۵۵

عبدالولی : ۶۷

عبداللہ چغتائی : ۱۷۶، ۱۷۹

عبداللہ عمادی : ۳۱۶

عبداللہ سندھی : ۱۷۶

ع

عثمان علی خان (نظام: ۹۵، ۹۴، ۹۵)

۳۵۲، ۱۸۲

غالب: ۳۲۸، ۸۲

غضنفر علی: ۱۴۹

غضنفر علی بخش: ۲۳۳

غلام احمد علمی: ۳۲۷

غلام جیلانی (حکیم): ۳۱۷

غلام حیدر خان: ۷۶

غلام ساحر علوی: ۳۸

غلام کبریا: ۱۶۲

غلام محمد صدیقی: ۶۵، ۶۶

غلامی، غلام رسول: ۲۷۶

غوث محمد: ۱۶۳

غوثیہ (ثمر فاطمہ): ۱۷۰

غیاث الدین بلین: ۶۴

ف

فانی: ۸۸

فائز دہلوی: ۳۲۸

فدا بخاری: ۲۲۸

فردوس جہان: ۱۴۹

فرزادہ (سنت جان): ۱۲۷

فرید احمد عباسی: ۶۵

فریر لیم (سٹر): ۸۷

غایت اللہ خان شرقی: دیکھیے شرقی علامہ فصاحت لکھنوی: ۲۹۴، ۳۰۴

عرشی، محمد حسین: ۳۱۳، ۳۱۸

عزیز جلالاڈی، محمد عزیز الرحمن:

۳۷ - ۳۸

عزیز قدوسی: ۱۶۴، ۳۳۳

عزیز لکھنوی، محمد ہادی: ۲۹۴، ۲۵۱

عشرت النساء بیگم: ۱۷۰

عطا اللہ شاہ بخاری (سید): ۲۹۱

عظمت علی (قاضی): ۲۰۷

عظیم حسین (میاں): ۴۹

علی بہادر (منشی): ۳۷

علی حسن، عظیم آبادی: ۱۵

علی حسین (حافظ) فوز: دیکھیے فوز

علی حسین

علی محمد: ۱۱۰

علی محمد: ۱۱۲

علی محمد عباسی: ۶۵

علی نقی، امام: ۲۰۵

علی نقی مجتہد: دیکھیے نقی صاحب

عمر الدین نقاش: ۱۷۷

عمر خیام: ۱۸۳

غایت اللہ خان شرقی: دیکھیے شرقی علامہ فصاحت لکھنوی: ۲۹۴، ۳۰۴

ک

- کاظم خاگ : ۳۳۸
 کابل، کابل حسین : ۲۶۶
 کرتا شگ : ۱۸۷ ، ۱۸۸
 کرشن چندر : ۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۱۷۳
 ۷۴
 کریم بخش : ۱۷۶
 کریم خان : ۲۲۰
 کسری منہاس : ۱۱۲
 کشن پرشاد (مہاراجا) : ۲۰۸
 کشوربانو چغتائی : ۱۸۶
 کنھیالال : ۴۵
 کوپرسن، الیکزنڈر : ۲۷۹
 کوب آفندی : ۳۵۲

گ

- گاندھی (مہاتما) : ۶۰
 گریہ، مٹر : ۲۱۲
 گلاب رائے : ۲۳
 گلاب شگ (مہاراجا) : ۲۸۷
 گنگا رام (سر) : ۱۷۲
 گوراں دتال : ۳۱۲ ، ۳۱۳
 گودکی : ۷۵
 گوری شنکر : ۲۷۱ ، ۲۷۲

نصیح لکھنوی، جعفر علی : ۳۲۹

فضل الہی چشتی : ۲۷۵ ، ۲۷۶

۲۷۷

فضل حسین (سر) : ۱۷۹

فوز، علی حسین : ۳۰۳ ، ۳۰۴

فہیم احمد فہمی : ۲۸

فیاض گوالیاری، فیاض احمد خان :

۱۱۹ ، ۱۲۳

فیروز دین (مردی) : ۲۶۲

فیروز طغرانی، فیروز الدین احمد :

۳۱۵ ، ۳۱۶ ، ۳۱۷

فیض، فیض احمد : ۱۳۷

ق

قادری بیگم : ۳۳۷

قادری ملتانی : ۳۵۷

قاصر، برہم ناتھ دت : ۳۱۲ ، ۳۱۳

۳۱۹

قتیل دانا پوری : ۱۶

قطب الدین

قیس کوٹوی، نواز محمد : ۲۷۷ ، ۲۷۸

قیصر جان : ۱۲۹

قیصر مرست (صلاح الدین) : ۳۲۹

گردند سرورپ : دیکھیے انور، منوہر سہل
گہر عظیم آبادی، سعید رضا

ل

لاڈلی بیگم : ۳۳۷

لاڈلے صاحب : ۱۵

لکے، سترک : ۱۸۱، ۱۸۰

لنگٹ سنگھ : ۲۱۴

لعل محمد : ۱۶۲

م

مالویہ، مدن موسن (پٹنٹ) : ۲۰

مالی ناگیوری، بشیر خان : ۲۲۰

ماہر بکھنوی، باسط حسن : ۲۶۶

مبتلا، مردان علی خان : ۳۳۰

مبشرہ : ۸۴

مفتخ اداس (ڈاکٹر) : ۱۸۹

مجید لاہوری : ۱۳۷، ۱۰۰

مجید الملک : ۱۸۴

مجتبیٰ حسین، ماسٹر : ۲۹۵

محبوب الرحمن : ۳۹

محبوب عالم (منشی) : ۶۹

محبوب علی خان (نظام) : ۹۴

محبوبین : ۲۵۵

محسن کاکوردی : ۳۸

محسن، محمد محسن : ۲۰۹

محرر بکھنوی : ۲۵۱

محرر مرزا پوری، فرزند علی : ۱۴۸

محفوظ الرحمن : ۳۹

محمد اجل خان (حکیم) : ۱۲۴

محمد احسن عباسی : ۶۶

محمد احمد : ۳۰

محمد اختر (سید) : ۲۳۳، ۲۳۶

محمد ادیس : ۱۶۳، ۲۱

محمد اسحاق : ۱۶۳، ۲۸

محمد اشرف خان : ۲۶۱

محمد اصغر علی جعفری : ۳۳۲

محمد اکبر خان : ۷۶

محمد ایوب خان (فیلڈ مارشل) : ۱۳۶

۱۸۳

محمد بخش چغتائی : ۱۸۵

محمد جلیس، قاضی : ۲۰۷

محمد حسن، اثر قاضی : دیکھیے اثر، محمد حسن

محمد حسین (قاضی) سحر دیکھیے سحر، محمد حسین

محمد حسین عوشی : دیکھیے عوشی، محمد حسین

محمد حسین حسان : ۱۲۳، ۱۲۴

محمد حمید اللہ خان (نواب) : ۱۶۸

محمد داؤد عباسی : ۶۶، ۶۵

محمدر فیح : ۳۴

محمدر کریا کاندھلوی : ۱۶۹

محمدر سردار (جامعی) : ۱۷۵، ۱۷۶

محمدر شاہ : ۲۵

محمدر شفیع : ۳۲

محمدر شفیع فوق (سید) : ۲۱۸

محمدر صادق علی : ۳۰۳

محمدر عصمت اللہ : ۸۲، ۸۵، ۸۶

۸۹

محمدر عالم (حافظ) : ۲۷۷

محمدر علی جوہر (مولانا) : ۶۸، ۶۹

محمدر مبین چریا کوٹی : ۳۲۸

محمدر محبوب : ۱۲۵

محمدر محمود شریف : ۳۱

محمدر مخدوم : ۴۲

محمدر نسی خان : ۱۲۳

محمدر دارالرحمن : ۲۶۶

محمدر حیدر کیلانی : ۲۷۷

محمدر سیف : ۲۴

محمدر ہاشم فرنگی علی : ۳۳۳

محمدر یعقوب (شیخ) : ۳۴

محمدر یوسف (سید) : ۶۱

محمدر یوسف : دیکھیے یوسف، محمد یوسف

محمدر یوسف (بیان) : ۱۷۲

محمدر یوسف قادری : ۳۵۵

محمدر یوسف مخدوم زادہ : ۶۴

محمدر یوسف (نوی) : ۱۲۵

محمود احمد عباسی : ۶۴، ۶۵، ۶۶

۶۷، ۶۸، ۶۹

محمود احمد خان : ۷۸، ۷۹

محمود بیگ میرزا : ۳۲۴، ۳۲۵

محمود حسین : ۳۰۶

محمود حسین بیگ مرزا : ۳۲۵

محمود صدیقی لکھنوی، محمد حسین :

۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶

محمود، راجندر سنگھ (مہارانا) : دیکھیے

راجندر سنگھ (مہارانا)

مدن موہن مالویہ، دیکھیے مالویہ

مدن موہن

مرتضیٰ حسین (سید) : ۳۲۴

مرزا جواد لکھنوی : ۳۲۸

مستقیم باللہ عباسی : ۶۴

مشرقت جغتائی : ۱۸۶

مسعود بیگ میرزا : ۳۲۵

مسیح الدین خان : ۳۳۷

مسح الزماں (سید) : ۲۰۴، ۲۰۵

۳۳۲

- مشتاق حسین (دقار الملک) : ۶۶
 مشرقی (علامہ) عنایت اللہ خان : ۲۷۹
 مصطفیٰ احمد شاہ : (۱۷۰)
 مضطر حیدری ، دلادر حسین : ۲۲۳
 ۲۲۴
 مضطر محمد علی : ۱۴۹
 مطیع اللہ : ۸۲
 معظم (پسر حامد) : ۲۷۱
 معین اللہ دکنہ : ۳۳۷ ، ۳۳۸
 معین الدین (ندی) : ۱۶۷
 معین الدین احمد شاہ (ندی) :
 ۱۶۷ ، ۱۶۷
 مفتون کوٹوی : ۲۸ ، ۲۹
 ملا ، آند نرین (پنڈت) : ۲۸
 ملا دادا صدی محمد ارفقی ، ۱۹۵ ، ۱۹۶
 بلخ مرزا لکھنوی : ۳۲۹
 ممتاز (احمد خان) : ۸۲
 ممتاز محمد خان دولتانہ : ۲۹
 منصور (احمد خان) : ۸۲
 منظر لکھنوی ، منظر حسن : ۲۶۵ ، ۲۶۶
 منظور الحق نعمانی : ۱۷۰
 منور لکھنوی : ۲۱
 منور بیگ میرزا : ۳۲۴
 منور حسین رضوی : ۲۳۴
 میسر شکوہ آبادی ، اسماعیل خان : ۳۲۹
 میر حسین (میر المصطفیٰ) : ۳۰۶
 میر خان : ۲۴۰
 میر پاساں : ۷۵
 موتا سنگھ (ماسٹر) : ۱۹۳
 موسیٰ چشتی مانچوری : ۶۵
 موسیٰ کاظم (امام) : ۲۲۵
 مومن علی (سید) : ۳۵۶
 مومنہ : ۸۲
 مؤید حسن : ۲۱۰
 مہجور شمس ، سید عبدالقیوم : ۲۱
 مہدی الزماں (سید) : ۲۰۵ ، ۲۰۷
 مہدی حسن ناصری : ۲۲۲
 مہندر سنگھ : ۲۰۱
 مہندر ناتھ : ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۳
 ۷۴
 مہر ، نرائین پرشاد : ۴۵ ، ۴۶
 ۴۷ ، ۴۸
 ہمیش داس (دراے صاحب) : ۲۹۷
 ہمیش داس (منشی) : ۳۱۲
 میر ، میر تقی : ۳۰۵ ، ۳۲۷
 میراجی (دشنا اللہ خان) : ۲۷۸

میران بخش (نقاش) : ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹

نصیر خان : ۲۲۰

میر حسن (سید) : ۵۴

نظام الدین : ۲۸۷

میرن دہلوی (سید حسن ہمدی) : ۳۰۶

نظر سہ ماہی، یوگ راج : ۲۰

نظم طباطبائی : ۳۳۸، ۲۶۳

ن

نادر، کلب حسین : ۳۲۹

نظیر خان : ۲۲۰

ناسخ لکھنوی : ۱۶۳

نقن صاحب (سید علی نقی مجتہد)

ناصر حجازی : ۱۲۸

۳۳۳

نشار اُمادی، انشراحین : ۱۰۵، ۱۰۶

نکسن، مسٹر : ۸۹، ۹۰

نجم، ابراہیم ندوی، سید : ۱۶۰

نندکار سنگھ : ۲۰۱

نجم آفندی، میرزا تجل حسین : ۱۳۴۹

ننھے آغا زبر لکھنوی : دیکھیے زبر لکھنوی

۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲

نوح ناردی : ۴۷، ۱۱۸، ۱۳۰۹

۳۱۰

نجم الدین : ۲۶۵

نور الحسن ہاشمی : ۹۰

نجمہ دہنت نجفی : ۳۴

نور جهان (ملکہ ترمتم) : ۲۳۴

نجیب (سیر حسان) : ۱۲۷

نور محمد : ۱۱۰

ندھان سنگھ (ڈاکٹر) : ۱۷۸

نولکشور (نشی) : ۳۰۳

ندیم جعفری، فیض احمد : ۲۲۷

نہال سید پاردی، عبدالحق : ۲۰

ندیر احمد (دبئی) : ۸۷

نہرو، جواہر لال (نپٹت) : ۲۳۶

نہرت جهان : ۲۲

نیاز فتحپوری : ۱۹۶

نزیل (سیر راشد) : ۲۸۱

نیرنگ کاکوردی، عبدالوحید : ۳۸

نسرین (سبت حامد) : ۲۷۱

نیر مسعود (ڈاکٹر) : ۲۳۲

نسرین (سبت راشد) : ۲۸۰

نیمہ خاتون : ۱۵۹

نیر مسعود (ڈاکٹر) : ۲۳۲

نشر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان :

۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱

دارش حسین : ۲۶۵

۲۴۰	داسطی، فضل رسول :	۲۵	هر ناتھ :
۱۷۰	حی النسا بگم :		هریش سنگھ (جہارا نا) : ۳۷
۱۵۰	وحیدالآبادی :		ہزار لکھنوی، سید حسن : ۲۹۵، ۲۹۴
۱۷۰	درددا احمد :		ہنرک، بیکے : دیکھیے، بیکے ۲، ہنرک
۱۸۵	وزیرالنسا بگم :		ہنر، منصب علی (میر) : ۲۳
۳۱۸	دشواناتھ دتا :		ی
۸۲	وقار (احمد خان) :		یاسمین (بنتیہ راشد) : ۲۸۰
۳۱۸	دیران دیوی :		یزدانی جالندھری : ۱۳۱
۵			یعقوب بیگ، میرزا : ۳۲۵، ۳۲۴
۳۲۹	ہادی علی میرزا :		یوسف حسن (حکیم) : ۱۷۸
۶۴	ہارون الرشید :		یوسف سرمست (محمد شرف الدین) : ۳۲۹
۲۴	ہاشمی، التفات رسول :		یوسف، محمد یوسف : ۳
۲۳۶	ہاشمی بانو :		یوگ راج نظر سولہ نئی : دیکھیے نظر
۳۳۷	ہدایت شاہی الدین :		سولہ نئی، یوگ راج

مطبوعات (کتاب و رسائل)

الف مقصودہ	
۳۳۰ :	اسلاف میرانیس
۱۶۸ :	اسلام اور عربی تمدن
۲۱۵ :	اشعار نظر
۳۰۹ :	افکار بسمل
۱۶۸ :	اقبال کی شاعری
۱۹۵ :	اکالی (مفتہ دار)
۱۹۸ :	ابلاغ (مفتہ دار)
۱۲۶ :	الٹی روا
۲۹۲ :	الجہاد الجہاد
۸۸ :	انجیل (ماہنامہ)
۱۲۶ :	الزام کس پر ہے
۲۷۱ :	انفاظ کی خوشبو
۱۲۷ :	انقراۃ الرشید
۲۶۲ :	الہام منظوم
۱۹۸ :	الہلال (مفتہ دار)
۳۰۳۹۰۵ :	الناظر (ماہنامہ)
۲۰۶ :	امانت کی اندر کبھا
۳۲۷ :	امتحانِ وفا
۱۳۷۹۳۶ :	امروز (روزنامہ)
۱۳۲ :	اب میں وہاں نہیں رہتا :
۲۰۹ :	ابریقی
۹۹ :	احرار (روزنامہ)
۱۳۲ :	اداس تنہائیاں
۲۲۱ :	ادب اور ادیب
۲۲۱ :	ادبی ڈرامے
۱۶۸ :	ادبی نقوش
۲۲۱ :	اردو ادب آزادی کے بعد :
۲۰۵ :	اردو ادب کی تاریخ
۳۲۹ :	اردو ڈراما اور اسٹیج
۲۲۱ :	اردو شاعری کا سماجی پس منظر
۲۰۶ :	اردو مرثیہ کا ارتقا
۲۰۶ :	اردو مرثیہ کی روایت
۷۵ :	اورانوں کی سبج
۱۶۳ :	ارمغانِ جدید
۸۲ :	ارمغانِ حالی
۳۰۴ :	ازدواجِ الہی
۲۹۲ :	اس بازار میں

۲۹۰ :	آزاد (روزنامہ)	۲۹۸ :	امریکن رپورٹر :
۱۲۶ :	آستین کاسا نیپ	۹۴ :	امیرالغلات :
۱۷۵ :	آفاق (روزنامہ)	۱۳۷ :	انجام (روزنامہ)
۲۰۹ :	آئینہ	۳۳ :	اندرسبھا
۲۵ :	آئینہ بحور	۳۰۴ :	انسانی قربانیاں
۳۳ :	آئینہ سخن فہمی	۳۲ :	انصاف کا کوڑا
۲۲۱ :	آئینہ معرفت	۲۹۹ :	انوارِ نظر
ب		۳۰۵ :	انورنامہ
		۳۳ :	انبیاء
۷۵ :	بچن (نہدرنا تھ)	۲۱۹ :	اہلِ سیف
۳۲ :	بد نصیب بادشاہ (نچی)	۳۲۹ :	ایاغِ بزم
۷۴ :	برسات (نہدرنا تھ)	۲۷۱ :	ایجادات کی کہانی
۱۲۶ :	برف کا گھر (حسین حسان)	۲۸۲ :	ایران میں اجنبی
۲۳۶ :	برقہ دہاواں (شیم)	۳۳۱ :	ایران میں مرثیہ گوئی
۳۱۹ :	برگِ دہار (قاصر)	۳۳۰ :	ایرا نیوں کا مقدس ڈراما
۳۳ :	بزمِ سلیمان (ادیب)	۳۶۱/۳۲ :	ایشیا (ہفتہ وار)
۳۴۸ :	بڑی جویلی (محمود بیگ)	۷۵ :	ایک شمع ہزار دیوانے
۲۸ :	بوستان (سعدی)	۳۲۹ :	آبِ حیات
۲۱ :	بوئے گل (راکل)		
۲۹۲ :	بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل	۳۰۶ :	آبشار
۱۵۸ :	بیان الغرائب	۲۹۸ :	آجکل (ماہنامہ)
۳۳۹ :	بیسویں صدی میں اردو ناول	۷۴ :	آدمی اور سکے
۲۷۱ :	بھارت کے نامور سائنسدان	۱۴۲ :	آدھے چاند کی رات
۱۴۲ :	بھنور (ٹھاکر پٹھی)		

تیری صورت میری آنکھیں (ہندونا تھ): ۷۵

ترونی (مفتون) : ۲۰۲

تصادیرِ چغتائی : ۱۸۲

تصویرِ چین (ماہنامہ) : ۱۳۷

تعبیر، تشریح، تنقید (سیح الزماں) : ۴۵

تفصیلِ زحافات (جوان) : ۲۵

تلاشِ سحر (شیم) : ۲۳۶

تنقہ خدمت (شورش) : ۲۹۲

تیمور کا گھرانا (چغتائی) : ۱۸۲

تنہا تنہا (ہندونا تھ) : ۷۴

تہذیبِ مودت (نجم) : ۳۵۲

تہذیبِ نسواں (ماہنامہ) : ۱۷۲

تیج (روزنامہ) : ۲۹۸

ط

ٹریڈرسٹ (ماہنامہ) : ۱۶۰

ٹیلیفون کی کہانی (سیح الزماں) : ۲۰۶

ٹھوکر (ہندونا تھ) : ۷۵

ج

جامِ جم (مضطر) : ۲۲۲

جامعہ (ماہنامہ) : ۱۲۵

جانِ برادر (شیم) : ۲۳۶

جب پتھر روتے ہیں (ٹھاکر پونجھی) : ۱۴۲

جذباتِ بسل : ۳۰۹

پ

پاکستان سے ہندوستان تک (ہندونا تھ) : ۷۴

پت جھڑکے پھڑکے (ٹھاکر) : ۱۳۲

پہچم ضیا (قاصر) : ۳۱۹

پردہ سادہ (مہجور شمس) : ۴۲

پسِ دیوارِ زمان (شورش) : ۲۹۲

پنجایت (ماہنامہ) : ۱۰۰

پیاد کا موسم (ہندونا تھ) : ۷۵

پیاسے بادل (ٹھاکر پونجھی) : ۱۳۲

پیامِ تعلیم (ماہنامہ) : ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶

پیغامِ صلح (مفتہ دار) : ۱۷۲

پھولوں کا ہار (نجمِ آندلی) : ۲۵۱

ش

شاہِ معین (شاہِ معین الدین احمد) : ۱۶۷

شاہِ رخِ اسلام (معین الدین احمد) : ۱۶۷

شاہِ رخِ اردو (محمود احمد عباسی) : ۶۸

شاہِ رخِ فیروز شاہی : ۳۰۵

شاہِ رخ کے اپدیش (حسین حسان) : ۱۳۶

شجلیاتِ الود (انور کامی) : ۱۶۳، ۱۶۴

شجیقِ انساب (محمود احمد عباسی) : ۶۸

شجیقِ مزید (محمود احمد عباسی) : ۷۰

شذکرۃ الکرام (محمود احمد عباسی) : ۶۸

شذکرۃ شعراے اردو (۱۱) : ۷۰

حضرت آرزو کی اصلاحیں (جوان) : ۲۵۰
حقیقت قوم کبوتر (محمود احمد عباسی) : ۷۰
حمید نظامی (شورش) : ۲۹۲
حیاتِ سلیمان (ندوی) : ۱۶۸
حیاتِ سیدنا (اعجاز) : ۲۲۱

خ

خالصاخبار (سفتہ دار) : ۱۹۰
خانہ زنجیر (ندیم) : ۲۲۷
خدا نگر (طالب) : ۳۰۰
خلافت معاویہ و یزید (محمود احمد عباسی) : ۷۰
خلفائے راشدین (شاہ معین الدین احمد) : ۱۶۷
خجائے جاوید (سری رام) : ۶۵
خجستان کیفی (طالب) : ۳۰۰
خورشید دراما (سیح الزماں) : ۲۰۶
خوش رنگ پھول (جوان) : ۲۵
خیالستان (ماہنامہ) : ۹۹

د

داستان میری، ذکر تیرا (سند ناتھ) : ۷۴
داغِ حسرت (شفقت کاظمی) : ۲۲۸
دلستانِ اُردو (ادیب) : ۲۲۷
درد کا رشتہ (سند ناتھ) : ۷۵
دستگیر (ماہنامہ) : ۲۹۸
دلی اتحادہ سوتادان کی (محمود بیگ) : ۳۲۸

جذباتِ مشرق (دلیان سنگھ مفتون) : ۲۰۲، ۲۱۱
جواہر پائے (قاصر) : ۳۱۹
جواہر سخن (ادیب) : ۳۲۸
جے بکشاں (نجی) : ۳۲
جہاں میں رہتا ہوں (سند ناتھ) : ۷۴
جہاں نما (ماہنامہ) : ۱۰۰

چ

چاندنی کے سایے (ٹھاکر پونچھی) : ۱۲۲
چاندی کے تار (سند ناتھ) : ۷۴
چٹان (سفتہ دار) : ۲۹۰
چراغِ بزم (بزمِ آفری) : ۳۲۹
چغتائی آرٹ (چغتائی) : ۱۸۳
چغتائی اور اس کے نقاد : ۱۸۲
چغتائی کی عریان تصویریں : ۱۸۲
چاروں کے چاند (ٹھاکر پونچھی) : ۱۲۲
چہ قلندانہ گفتیم (شورش) : ۲۹۲

ح

حرفِ غزل : ۲۰۵
حرفِ ناتمام (طالب) : ۲۹۹
حرفِ نیم شب (شمیم) : ۲۳۶
حریت (روزنامہ) : ۹۹
حسرت کدہ (شفقت) : ۲۲۸
حسین شہید سہروردی شورش : ۲۵۲

۷۵ :	ردپا	۳۳۰ :	دلی میں مرثیہ گوئی (ادیب)
۲۶۳ :	روحِ ادب	۱۲۵ :	دنیا کے بچے (حسین حسّان)
۳۲۸ :	روحِ نفیس	۲۱ :	دو چراغ
۲۳۶ :	روشنِ اندھیرا	۱۲۶ :	دیک (حسین حسّان)
۹۹ :	رومان (ماہنامہ)	۱۶۸ :	دینِ رحمت (شاہ معین الدین احمد)
۲۶ :	رہنمایانِ ہند	۳۰۵ :	دیوانِ اظفری
۱۹۹۱۹۸۱۱۸۹ :	ریاست (مفتہ دار)	۳۰۵ :	دیوانِ میر محمدی
۲۰۰ ، ۲۰۱ ، ۲۰۲ :	ریاستہائے متحدہ کی تاریخ	۱۰۶ :	دھرتی میرے پیار کی (نثار)
۲۰۶ :	زخمِ حسرت	۳۱۹ :	ڈال ڈال پات پات (قاصر)
۱۴۲ :	زلف کے سر جوئے تک	۱۲۲ :	ڈیڈی (ٹھاکر پوچھی)
۱۸۹۱۲۵ :	زمانہ (ماہنامہ)	۳۱۹ :	ذکرِ فکر (قاصر)
۱۲۶ :	زمین کے بھائی بہن	۷۵ :	راتِ اندھیری ہے
۲۸۸ ، ۷۶ :	زمیندار (روزنامہ)	۱۲۲ :	رات کے گھونگٹ
۱۲۲ :	زندگی کی دوڑ	۲۸۲ :	ن، م، را شد پر
۷۵ :	زیرِ سہیر	۲۵ :	رام بن باس
۷۳ :	ساقی	۱۲۶ :	رامو نے پڑھنا سیکھا
۳۰۰ :	سبزہ بیگانہ	۲۵ :	رباعیاتِ جوان
۱۸۲ :	ستادون	۲۹۹ :	رہن مال
۲۹ :	سراج الدین علی خان آرزو	۱۹۵ :	رعیت (روزنامہ)
۱۲۵ :	سرکارِ دو عالم	۳۱۷ :	رفیق الاطبا (ماہنامہ)

۸۰ :	شش	۱۶ :	سراۓ نشاط
۲۶ :	شعاع مہر	۲۶ :	سفید جوگن
۹۹ :	شعراۓ پنجاب	۸۲ :	سفینۂ ادب
۶۱ :	شکنتلا (رنا ملک)	۳۳۰ :	سلطان عالم و اجد علی شاہ
۱۲۵ :	شمع	۶۱ :	سودا (ڈراما)
۱۲۲ :	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۱۰۵ :	سودا گز پھر
۱۹۳ :	شہادت کا تازہ قطرہ	۷۵ :	سوز، ریت، لگناہ
۱۰۰ :	شیرازہ (سفتہ دار)	۲۵ :	سوزِ دل
۱۹۱ :	شیر پنجاب (سفتہ دار)	۲۶۶ :	سہیل یمن
ص		۲۹۲ :	سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۲۳۶ :	صبح فاران	۱۰۵ :	سیرِ سندان
ط		۱۶۷ :	سیرۃ النبی
۳۰۵ :	طبقاتِ ناصری	۲۰۱ :	سیف و قلم
۳۲ :	طلوعِ سحر	شش	
عرب کی موجودہ حکومتیں :		۳۲ :	شاخار (دواہی)
۱۶۸ :	عروج (ماہنامہ)	۳۳ :	شاعرِ اعظم انیس
۱۱۰ :	عظیم آباد کی گزشتہ ادبی محفلیں :	۳۰۶ :	شاعر کا دل
۲۳۶ :	عکسِ گل	۲۷۸، ۱۷۳ :	شامِ بکار
۱۸۳ :	عمر خیام (مستورد)	۲۹۲ :	شبِ طے کہ من بودم
۱۸۳، ۱۸۲ :	عملِ چغتائی	۱۱۲ :	شبِ رفتہ
غ		۲۷۱ :	شہنشاہ (ماہنامہ)
۲۹۰ :	غبارِ خاطر	۲۶۳ :	شرحِ بالِ جبریل
		۳۳۰ :	شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب

ف

کلماتِ جوان : ۲۵

کلیاتِ مومن : ۲۰۶

کلیاتِ مسیحی : ۲۰۶

کلیاتِ مسیحی

کالی : ۷۲

گفتنی ناگفتنی : ۲۹۲

گلابانگ : ۲۱۵

گلدستہٴ فصاحت : ۹۵

گلستان (سعدی) : ۵۲، ۴۸

گلشنِ سخن : ۳۳۰

گوردگھٹال (سفہ دار) : ۱۹۵

گوہرین نامہ : ۲۱۵

گیتا : ۲۰

ل

لا : انسان (راشد) : ۲۸۲

لاٹ (انگریزی - سفہ دار) : ۱۷۲

لحنِ داؤدی : ۶۵

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج : ۳۲۹

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج : ۳۲۹

لکان : ۱۸۴

لیڈر : ۷۵

لیل و نہار (سفہ دار) : ۱۳۷

فتحِ مبیں : ۲۵۲

فریاد و جوابِ فریاد : ۲۵

فرنگِ امثال : ۳۲۷

فائدہٴ عبرت : ۳۲۹

فیضِ میر : ۳۲۷

فیضانِ اقبال : ۲۹۲

ق

قندیل (سفہ دار) : ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵

قواعد کلیہٴ بھا کا : ۳۳۰

قوسِ قزح : ۲۷۷

ک

کاجل : ۱۸۴

کارِ چغتائی : ۱۸۴

کامیابِ تلوار : ۳۲

کتابِ الصوف : ۵۴

کتابِ النجوم : ۵۴

کریڈٹ (نامہ) : ۷۸

کریڈٹ مومن (ٹیگور) : ۹۰

کشمیر کی سیر : ۳۰۰

کشور کا ثنا : ۳۲

کلماتِ اشعرا : ۳۰۵

کلماتِ ابجدی : ۳۰۵

م

۲۶۶ :	منظر و نظادہ	۱۸۲ :	ماڈرن آرٹس چغتائی کا حصہ
۲۰۶ :	موازنہ انیس و دبیر	۲۸۶ :	مادرا
۲۹۲ :	موت سے واپسی	۹۰ :	ماہ نو
۳۵۰ :	موجود معراج	۱۰۷ :	ماہ و انجم
۱۶۷ :	مہاجرین	۷۲ :	مالی دارنگ
۳۱۹ :	منکہ مکتوب الیہ	۲۶۲ :	مشنوی مولانا آدم
۳۱۹ :	میرا بھائی	۳۲۷ :	مجالس رنگین
۳۲۱ :	میری دنیا	۲۶ :	محاورات ہر
۲۰۱ :	مقابل فراموش	۱۸۹ :	محرزن (ماہنامہ)
۲۱ :	مال دل	۲۲۱ :	مختصر تاریخ ادب اردو
۱۲۵ :	ماموران اسلام	۶۱ :	مد و جزر (ساگر)
۴۶ :	مشرقیات	۲۲۰ :	مذہب اور شاعری
۲۷۸ :	نخلستان (ماہنامہ)	۱۳۰ :	مرانی ریختہ
۶۱ :	نزیلا (راما بن)	۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱ :	مرقع چغتائی
۸۲ :	نسخہ حمید	۱۸۴ :	
۲۶۳ :	نثر ادب	۳۱۶ :	مسیحا (ماہنامہ)
۳۲۷ :	نظام اردو	۳۵۱ :	مشورہ (ماہنامہ)
۱۹۵ :	نظام المشائخ (ماہنامہ)	۳۵۲ :	معراج فکر
۲۲۸ :	نغمہ حسرت	۲۰۶ :	معیار دینران
۳۰۶ :	نغمہ فردوس	۶۷ :	مکتوبات حالی
۱۸۳ :	نغمہ لذت	۲۲۱ :	ملک ادب کے شاہزادے
۲۲۸ :	نغمہ تاسید	۷۵ :	منزل ایک مسافر دو

۵

- ہفت رنگ : ۲۶۶
 ہماری زمین : ۴۲۶
 ہماری شاعری : ۳۳۴، ۳۲۷
 ہمارے حسین : ۲۹۹
 ہمایوں (ماہنامہ) : ۲۲۷، ۱۷۳
 ہمدرد (روزنامہ) : ۶۸
 ہمدرد (روزنامہ) : ۱۹۱، ۱۹۲
 ہم قلم (ماہنامہ) : ۱۳۷
 سند (سفہ دار) : ۱۹۵
 منڈستان (سفہ دار) : ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳
 سندی تصاویر حقیقی : ۱۸۲
 ہومر : ۳۱۹

ی

- یادگار برق : ۲۹۹
 یادگار عشق : ۱۶
 یادوں کے کھنڈر : ۱۲۲
 یاما (کو پڑسن) : ۲۸۲، ۲۷۹
 یوسف زینا (جامی) : ۲۸
 یہ تھی دلی : ۳۰۰
 یہ رشتے، یہ روگ : ۱۴۳
 یہاں سے وہاں تک : ۷۲

- نفسیات (ماہنامہ) : ۱۷۳
 نفسیاتی جائزے (ماہنامہ) : ۱۷۳
 نقشِ چغتائی : ۱۸۲، ۱۸۴
 نقیب (ماہنامہ) : ۱۲۵
 نگار (سفہ دار) : ۱۳۷
 نگارشات ادیب : ۳۳۰
 نکلان (سفہ دار) : ۱۰۰، ۱۳۷
 نوائے راز : ۲۲
 نوائے وقت (روزنامہ) : ۱۰۰، ۱۷۵
 نو بہار (ماہنامہ) : ۸۸
 نئی بیماری : ۷۲
 نئے ادبی رجحانات : ۲۲۰
 نئے نام : ۲۷۱
 نیزنگ خیال (ماہنامہ) : ۱۷۸، ۲۷۷

و

- دادیاں اور دیرانے : ۱۴۲
 واقعاتِ اظفری : ۳۰۵
 وقت کا آسمان : ۲۸۲
 وکیل (امرتسر) : ۲۶۲، ۲۱۶

۳۱۷

نئی اور اہم مطبوعات

۱۸۰۰	ڈاکٹر خورشید الاسلام	(شعری مجموعہ)	ستہ جستہ
۲۵۰۰	ڈاکٹر شمیم حنفی	(تنقیدی و تحقیقی)	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس
۵۰۰	نثار واحدی	(شعری مجموعہ)	گل افشانی گفتار
۲۴۰۰	ڈاکٹر مظفر حنفی	(تحقیقی)	شاد عارفی شخصیت اور فن
۵۰۰	عمر خان صدیقی	(پبلک ریلیشن)	رابطہ عامہ
۱۲۰۰	اطہر پرویز	(تذکرہ)	علی گڑھ سے علی گڑھ تک
۱۶۰۰	شاہ عبدالسلام	(تحقیقی)	دہستان آتش
۲۰۰۰	حقیق صدیقی	(تحقیقی)	سر سید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ
۱۴۰۰	محیب اللہ ندوی	(مذہب)	فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل
۱۸۰۰	اخلاق اثر	(تحقیقی)	ریڈیو درائے کافن
۱۲۰۰	خواجہ احمد عباس	(افسانے)	نئی دھرتی، نئے انسان
۱۲۰۰	جنتندر بلو	(ناول)	پرانی دھرتی، اپنے لوگ
۱۶۰۰	خواجہ عبدالغفور	(لطائف)	شکوہ زار
۱۲۰۵۰	ڈاکٹر قیصر جہاں	(تحقیقی)	اردو گیت
۱۲۰۵۰	پرداز اصلاحی	(تحقیق)	مفتی صدر الدین آزر دہ
۶۰۰	سید شمیم اشرف	(ناول)	ایک مٹھی ہندوستان
۲۰۰۲۵	مولانا ابوالعرفان ندوی	(سوانح)	آئینہ اربعہ
۱۰۰۵۰	مالک رام	(تحقیقی)	فسانہ غالب
۱۲۰۲۵	صالحہ عابد حسین	(افسانے)	درد و درماں
۸۰۰	مولانا عبدالسلام قندلانی	(مذہب)	مسلمان اور دقت کے تقاضے
۱۵۰۰	ڈاکٹر عابد حسین	(مضامین)	انشائیات
۱۲۰۹۰	مالک رام	(تذکرہ)	تذکرہ معاصرین دوم
۱۸۰۰	ڈاکٹر سیفی پریمی	(تحقیقی)	حیات اسماعیل میرٹھی
۸۰۵۰	غلام ربانی تاباں	(شعری مجموعہ)	نوائے آوارہ
۱۰۰۵۰	آنند زائن ملا	(شعری مجموعہ)	کرب آگہی
۷۰۰	سلمان اختر	(شعری مجموعہ)	کوئٹہ کو
۷۰۰	جاں نثار اختر	(شعری مجموعہ)	پچھلے پہر
۱۲۰۰	سکندر علی دجندہ	(شعری مجموعہ)	بیاض مریم

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لیبڈی) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی 110002